
ردا ڈائجسٹ
MAY
2016
ماڈل: ماریہ زاہد
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی: موسیٰ رضا

گوشہ آگہی — صالحہ محمود — ٦

شادی احوال

سیدہ فرزانہ حبیب — سیدہ فرحانہ حبیب — ٩

سلسلے وار ناول

زندگی پھول محبت خوشبو — شازیہ مصطفیٰ — ٢٢٢
اے عشق ہمیں برباد نہ کر — نائیلہ طارق — ٩٠
چل اڑ جا اب تیری باری — عائشہ ذوالفقار — ١٠

مکمل ناول

زندگی تجھ کو جیا — قرۃ العین سکندر — ٣٢
ایک پیالی پیار — مصباح مسکان — ١٤٤

ناولٹ

جفائے دل وفا کر بیٹھا — مہرین کنول — ٥٦
کردار کا کانچ — فرحین اظفر — ١١٠
بن کے دعا تو مجھ کو ملا — بشریٰ مایا — ١٦٨

افسانے

قیمت — نظیر فاطمہ — ٧٢
روح کا سودا — ماورا بشارت — ٧٨
خود غرضی — رابعہ افضال خان — ٨٢
دادا جی — شہلا گل سحر — ٨٦
صحرا میں چھاؤں — سیدہ فرزانہ حبیب — ١٢٤
کڑی کا پھل — ثناء کنول — ١٣٢
ڈھیٹ — کوثر ناز — ١٣٦
سچائی کی روشنی — بسمہ احمد — ١٤٠
حصارِ محبت — سمعیہ عبید — ١٨٤
کیسا مسیحا — عائشہ انصاری — ١٩٢
پیارے بابا — عائشہ الیاس — ١٩٦
رُت بھری شام — حورینہ سعد — ٢٠٨
خشک پتوں کے سنگ — اقراء چنا — ٢١٢
اندازِ محبت — علیشبہ احمد — ٢١٦

مئی 2016ء
جلد نمبر 20 شمارہ نمبر 5
قیمت 60 روپے

www.facebook.com/rida.digest

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
720 رُوپے

34535726

پبلشر و ایڈیٹر صالحہ محمود نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۱۲۹/ڈی بلاک۔2۔پی-ای-سی-ایچ-سوسائٹی، کراچی

مستقل سلسلے

ردائے جنت	صالحہ محمود	۷	سندیسے	صالحہ محمود	۲۴۷
ردا کی ڈائری	صدف سعد	۲۳۱	کچن	ثریا اقبال	۲۵۴
ذرا پھر سے کہنا	شہلا مشتاق	۲۴۳	سنگھار	شہلا مشتاق	۲۵۷
خوشبو	نورین ملک	۲۳۹	اشعار	نورین ملک	۲۳۳
اس ماہ میں	نورین ملک	۲۳۵	دوستوں کے نام پیغام	ادارہ	۲۵۲



صالحہ محمود

گوشہ آپا

پھر وہی گلہ وہی شکوہ وقت کی آپا دھاپی یوں لگتا ہے کوئی کسی کا ہے ہی نہیں۔ اچھے اچھے چور ڈاکو اچکے دکھائی دیتے ہیں۔ جب حاکم وقت پر ہی بہتان لگ جائے تو چور اچکے ڈاکوؤں سے گلہ کیا کیجیے۔ گرمی سوا نیزے پر اور عوام گرم تپش اور مہنگائی میں جلے گھوم رہے ہیں۔ کیسا سکون، کیسی رُت موسم کی، سورج سوا نیزے پر اور خلقِ خدا چیخ رہی ہے۔ ہائے پاناما لیکس......! حاکم وقت اتنے مدہوش کہ کوئی بات نہ ہو جیسے۔ علاج کے بہانے سیر سپاٹے بھی ہو گئے۔ جمائما بے چاری ناحق پریشان ہوئی۔ عمران خان سے پہلے وہاں ان کے دیدار کے لیے شریف زادے موجود تھے۔ واپسی ابھی بادلوں کے بیچ ہی تھی کہ ضرب عضب کا ہیرو پکار اٹھا۔ ''دہشت گردی اور کرپشن کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے۔'' خلقِ خدا ایک آس، امید پر ہی جھوم اٹھی۔ ہر طرف واہ واہ اور امیدیں بڑھ گئیں۔ نوید آئی ہے کچھ اس طرح کہ جیسے جھوم اٹھے بہار کہیں شہر اور گلیاں جو منتظر تھیں کسی غیبی طاقت کی۔ ہمارے آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے جو کہا وہ کر کے دکھایا اور احتساب کا عمل اپنے گھر یعنی آرمی کے ادارے سے کر کے 13 افسران برطرف کر کے ثابت کر دیا کہ محبِ وطن پاکستانی کیا ہوتا ہے۔ کچھ سندھ کی بھی خبر لیجیے سرکار میری۔

ے کہ ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے۔

حسب روایت وہی پرانا راگ الاپ رہے ہیں۔ ''را کا ایجنٹ، را کا ایجنٹ'' جس سے عوام بہت بور ہو گئی ہے۔ کان سننے کے لیے اب تیار نہیں لوگو! وقت کی رفتار تھم سی گئی ہو جیسے۔ وہی کوڑا کرکٹ، گندی بوسیدہ گلیاں آہا کار مچی ہے۔

جب روا آپ کے ہاتھوں میں ہوگا تو مئی کا مہینہ ہوگا اور رمضان عنقریب ہوں گے۔ عید کی تیاریاں رمضان سے پہلے کر لیجیے تاکہ بابرکت مہینہ رمضان میں آپ صرف اور صرف عبادت کر سکیں۔ یہ عبادت کا مہینہ ہے بار بار بازاروں کے چکروں سے بچنے کی کوشش کیجیے۔ ہر کام رمضان سے پہلے نمٹا لیں یہ چھوٹا سا مشورہ ہے مگر گرہ سے باندھ لیں۔ عید سے متعلق آپ اپنی تحاریر، افسانے، اشعار، ڈائری، ذرا پھر سے کہنا جلد از جلد بھیج دیجیے تاکہ ہمارا اسٹاف بھی پرسکون انداز میں رمضان کی تیاری کر سکے۔

آپی

صالحہ محمود

ردائے بندگی

دعاؤں کا بیان

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دعا اصل عبادت ہے"۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (ترجمہ) "اور تمہارے رب نے اعلان فرمایا ہے کہ مجھ سے سوال کرو میں تمہارا سوال پورا کروں گا"۔ (سورۂ مومن 40: آیت 60) (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، ترمذی۔ عن نعمان بن بشیرؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دعا عبادت کا مغز ہے"۔ (ترمذی۔ عن انسؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے ہاں دعا سے زیادہ کسی چیز کو بلند مرتبہ حاصل نہیں ہے"۔ (ترمذی، ابن ماجہ، عن ابی ہریرہؓ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تقدیر کو صرف دعا ہی بدل سکتی ہے اور عمر میں اضافہ صرف نیک اعمال سے ہوسکتا ہے"۔ (ترمذی۔ عن سلمان فارسیؓ)

(وضاحت: عمر میں اضافے سے مراد نیک اعمال کرنے سے پرسکون زندگی گزرتی ہے اور آخرت میں اس کا اجر عظیم ملتا ہے)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو آدمی اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتے ہیں"۔ (ترمذی۔ عن ابی ہریرہؓ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے جس شخص کے لیے دعا مانگنے کا دروازہ کھل گیا اس کے لیے رحمت کے دروازے کھل گئے اور اللہ تعالیٰ سے جتنی چیزوں کا سوال ہوتا ہے ان میں سے اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند یہ ہے کہ اس سے (دنیا و آخرت کی تمام آفات سے) حفاظت کا سوال کیا جائے"۔ (ترمذی۔ عن ابن عمرؓ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص یہ چاہتا ہے کہ مصیبتوں میں اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرمائیں اسے چاہیے کہ عام حالات میں بھی اللہ رب العزت سے کثرت سے دعائیں مانگے"۔

(ترمذی۔ عن ابی ہریرہؓ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ تمہارا رب بہت حیا والا اور کرم کرنے والا ہے۔ جب اس کا بندہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ اپنے بندہ سے حیا کرتا ہے کہ اس کے ہاتھوں کو خالی واپس نہ لوٹائے"۔ (ترمذی، ابوداؤد۔ عن سلمانؓ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جامع کلمات والی دعاؤں کو پسند فرماتے تھے۔ (ابوداؤد۔ عن عائشہؓ)

(وضاحت: جامع کلمات سے مراد وہ کلمات ہیں جن میں الفاظ تو کم ہوں مگر اس میں دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کی طلب کے سوالات بہت زیادہ ہوں مثلاً (ترجمہ) "اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرمایئے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچایئے"۔ (بقرہ: 2، آیت 201)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "3 دعائیں بلاشبہ قبول ہوتی ہیں۔ (1) والد کی دعا (2) مسافر کی دعا (3) مظلوم کی دعا"۔ (ترمذی،

ابوداؤد، ابن ماجہ، عن ابی ہریرہؓ)
(وضاحت: ان لوگوں کی بددعا سے بچنا بھی انتہائی ضروری ہے)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے ہر آدمی اپنے رب سے اپنی تمام ضروریات طلب کرے یہاں تک کہ اگر جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ سے طلب کرے''۔ (ترمذی۔ عن انسؓ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی آدمی کے لیے دعا (کا ارادہ) فرماتے تو پہلے اپنے لیے دعا کرتے۔ (ترمذی۔ عن ابی کعبؓ)

اللہ کا ذکر اور اس کا قرب حاصل کرنے کا بیان

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں ایسا بہترین عمل نہ بتاؤں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت ہی زیادہ اجر و ثواب والا، جنت میں درجات بلند کرنے والا، سونا چاندی کے خرچ کرنے سے بہتر اور جہاد کرنے سے بھی بہتر ہو''۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: ''ضرور بتائیں''۔ آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ عمل اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرنا ہے''۔ (ترمذی، احمد، ابن ماجہ، عن ابی الدرداءؓ)

ایک اعرابی نے رسول کریم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا کہ ''کون سا آدمی بہتر ہے؟'' آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ آدمی مبارک ہے جس کی عمر لمبی ہو اور اس کے اعمال اچھے ہوں''۔ اس نے پھر پوچھا۔ ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، کون سا عمل افضل ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم دنیا چھوڑ رہے ہو تو تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر ہو''۔ (ترمذی۔ عن عبداللہ بن بسرؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تمہارا جنت کے باغات میں سے گزر ہو تو (وہاں سے) کچھ کھا پی لیا کرو''۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا: ''جنت کے باغات کیا ہیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ذکر الٰہی کی مجلسیں''۔ (ترمذی۔ عن انسؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو آدمی کسی جگہ بیٹھتا ہے مگر وہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتا تو وہاں بیٹھنا اس پر اللہ کی جانب سے شرمندگی کا باعث ہوتا ہے اور جو آدمی کسی لیٹنے کی جگہ پر لیٹے مگر وہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کرے تو وہاں لیٹنا اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے شرمندگی کا باعث ہوتا ہے''۔ (ابوداؤد۔ عن ابی ہریرہؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو لوگ کسی مجلس میں بیٹھیں اور انہوں نے اس مجلس میں نہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا اور نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا تو ان پر گناہ ہوگا اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو ان کو عذاب میں مبتلا کر دیں یا انہیں معاف کر دیں''۔ (ترمذی۔ عن ابی ہریرہؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ذکر الٰہی کے علاوہ زیادہ کلام نہ کیا کرو اس لیے کہ ذکرِ الٰہی کے علاوہ زیادہ باتیں کرنا دل کی سختی کا سبب ہیں اور سب لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے دور وہ آدمی ہے جس کا دل اللہ تعالیٰ کے خوف سے خالی ہے''۔ (ترمذی۔ عن ابن عمرؓ)

ہم ایک سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ بعض صحابہ کرامؓ نے کہا کاش ہمیں علم ہو جائے کہ کون سا عمل بہتر ہے تو ہم اس کو کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بہترین زبان وہ ہے جو ذکر الٰہی میں مصروف رہتی ہے اور بہترین دل وہ ہے جو (اللہ تعالیٰ کے انعامات پر) شکر ادا کرتا رہتا ہے اور بہترین ایماندار بیوی وہ ہے جو دینی امور میں اپنے خاوند کی معاونت کرتی ہے''۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ۔ عن ثوبانؓ)

☆☆☆

شادی احوال

سیدہ فرزانہ حبیب

ہمراہ

خان آصف خان

صالحہ آپی، نورین جی اور ردا قارئین کو چاہت بھرا سلام! کہتے ہیں کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں مگر ان کا ملاپ زمین پر ہوتا ہے تو ایسا ہی ایک خوب صورت جوڑا 16 دسمبر 2015ء رشتہ ازدواج میں منسلک ہوا۔ یعنی آج میں اپنی سوئیٹ سی سسٹر اور آپ کی ہر دلعزیز مصنفہ سیدہ فرزانہ حبیب عرف فرزین کے شادی کا احوال لے کر حاضر ہوئی ہوں (ارے، ارے آپ سب چونک گئے ناں یہ خوش خبری سن کر۔ مبارک باد تو دے دیں ہاہاہا)۔ اس سے پہلے میں اس خوب صورت بندھن کی تفصیل کی طرف بڑھوں پہلے میں اپنا تعارف کروادوں میں دلہن صاحبہ یعنی آپ کی مصنفہ کی چھوٹی بہن اور ہمراز سیدہ فرحانہ حبیب آپ سب سے مخاطب ہوں جو صالحہ آپی اور نورین جی کی محبت بھری فرمائش پر ان کی شادی خانہ آبادی کا احوال ردا کی بزم میں شیئر کررہی ہوں۔ اس خوب صورت بندھن کا آغاز اس دعا کے ساتھ

عروج تجھ کو خدا کچھ ایسا عطا کرے
کہ رشک تیری قسمت پر زمین و آسماں کرے
ہر دوست ہو تجھ پر جاں نثار
ہر رشتہ تجھ سے وفا کرے
ہر موڑ پر ہوں فرشتوں کے لشکر ساتھ تیرے
اور ہر موڑ پر تیری حفاظت خدا کرے (آمین)

قارئین! اس خوب صورت بندھن کا آغاز 2014ء کو پر بہار مہینے اپریل سے ہوتا ہے۔ 11 اپریل کو ہماری پیاری آپی ہمارے والدین کی رضا



مندی و فیصلے سے ہمارے پیارے جیجا جی آصف خان کے ساتھ منگنی کے خوب صورت بندھن میں منسلک ہوئیں اسی دوران ان کی سالگرہ 21 اپریل کو آئی۔ جس پر ان کے فیانسی (اب جو ان کے شریک حیات ہیں) کی طرف سے خوب صورت گفٹ اور کیک بھیجا گیا اس طرح ان کی زندگی کا اہم دن مزید خوشگوار اور یادگار بن گیا۔ پھر عیدی بھی محبت اور خلوص کے ساتھ اعلیٰ قسم کی آئی۔ یہاں ایک بات آپ قارئین سے شیئر کرنا چاہوں گی جو ہمارے والدین کے لیے قابل فخر ہے کہ ہماری پیاری آپی نے اپنی اسلامی اقدار اور مشرقی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے منگنی کے تقریباً ایک سال اور آٹھ ماہ کے پریڈ کے دوران نہ کبھی بات کی اور نہ ہی کبھی ایک دوسرے کے روبرو ہوئے۔ صرف تصویر کی حد تک دونوں ایک دوسرے سے واقف تھے اور اپنے گھر والوں کی پسند پر دلی طور پر راضی تھے۔ یہ خوب صورت لمحات کچھ غم اور خوشی کی یادیں لے کر آگے بڑھا اور بالآخر وہ دن آگیا جس کا ہم سب گھر والوں کو بے چینی سے انتظار تھا۔ جی قارئین! 8 نومبر 2015ء کو آپی شادی کی تاریخ فکس ہوئی اور ٹھیک ایک ماہ بعد یعنی 11 دسمبر 2015ء کو نکاح جیسے خوب صورت بندھن میں

منسلک ہوئیں اسی دن کیاپئن مایوں کا فنکشن بھی تخی حسن کے اسٹائلش لان میں منعقد کیا گیا ہم دونوں بہنوں نے پنک فراک، چوڑی دار پاجامہ اور پھولوں کا زیور پہنا تھا۔ بقول تمام کزنز کے شہزادی لگ رہے تھے (آہم، آہم) اور آپ کی رائٹر فرزین صاحبہ کے کیا کہنے۔ مایوں کے پیلے روایتی جوڑے، گیندے اور بیلے کے زیورات (جو ان کے سسرال کی طرف سے آیا تھا) ہم رنگ زرد و سبز چوڑیوں اور ہلکے ہلکے میک اپ میں ان کی چھب ہی نرالی تھی۔ اس تقریب کی دلچسپ بات یہ تھی کہ لڑکے والے پہلے سے ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ گیندے اور بیلے کے پھولوں سے آراستہ جھولا اور ابٹن ومہندی کی سجی تھال اور جلتی شمعیں اس کے گرد رنگ برنگی منکیاں ایک نہایت ہی آنکھوں کو خیرہ کردینے والا منظر پیش کررہے تھے اس تقریب میں آپی کے ٹیچر اسٹاف اور مشہور نعت خواں انعم مدثر نے بھی شرکت کی جنھوں نے ہمارے پاپا کے لیے اور آپی کی دائمی خوشیوں کے لیے خصوصی دعا کی۔ نکاح کے وقت ہر لڑکی کی طرح آپی بھی جدائی کے خیال اور زندگی کے اس اہم موقع پر پاپا کی کمی کی وجہ سے بے اختیار رو پڑیں۔ ہمارا چھوٹا بھائی فرحان، اللہ پاک اس کو لمبی عمر اور صحت عطا کرے اس نے پاپا کی جگہ جس طرح تمام معاملات کو سنبھالا وہ قابل فخر ہے اس موقع پر وہ بھی آپی سے لپٹ کر رو پڑا کہ اس منظر نے تمام مہمانان گرامی کی آنکھیں نم کردیں۔ نکاح کے بعد آپی کو رسم مایوں کے لیے ہم دونوں بہنوں کے ہمراہ باہر لایا گیا جہاں اسٹیج (جھولے) پر ہمارے جیجا جی بے چینی سے ان کا انتظار کررہے تھے (سمجھا کریں ناں! انھوں نے پورے ایک سال 8 ماہ تک صبر کے ساتھ ملن کا انتظار بھی تو کیا ہے) لہٰذا ان پر رحم کھاتے ہوئے آپی کو ان کے برابر بٹھایا گیا جیجا جی نے بڑی فرصت سے انہیں روبرو دیکھا آپی کی تو بارِ حیا سے نظریں نہیں اٹھ رہی تھیں۔

جیجا جی کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ رسم مایوں کے بعد فوٹو سیشن ہوا اور پھر تمام مہمانوں نے کھانا تناول فرمایا (رج کے حلیم، کباب پوری، تکہ کباب، دہی بڑے اور گلاب جامن) سے انصاف کیا اور اس طرح یہ تقریب خوشی اور مسرت کے رنگ سمیٹے اختتام کو پہنچی واپسی پر ہمارے جیجا جی کی حسرت بھری نگاہیں دیکھنے کے قابل تھیں کیونکہ ابھی انہیں مزید 5 دن کی عارضی جدائی برداشت کرنی تھی۔ 14 دسمبر کو لاہور سے ہماری چہیتی بڑی بہن ترانہ آپا اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ پہنچ گئی تھیں۔ جس کی وجہ سے خوشیاں دوبالا ہوگئیں۔ 15 دسمبر کو تمام کزنز اور خالاؤں نے مل کر رت جگا منایا۔ ڈھولکی ہوئی۔ جب کہ دلہن صاحبہ مہندی لگانے کے بعد یہ کہہ کر سونے چلی گئیں کہ کل ان کو پارلر بھی جانا ہے (آہم آہم آخر جانِ محفل تو ان کو ہی بننا تھا)۔

16 دسمبر 2015ء (رخصتی کا دن)

آخر کار 16 دسمبر کا سرد مگر خوشیوں اور امنگوں سے بھرا دن طلوع ہوا آپی ہم سب سے مل کر تقریباً 5 بجے بیوٹی پارلر روانہ ہوگئیں۔ اس وقت بھی ان کی آنکھیں نم تھیں۔ ہم سب نے بھی چھ بجے کے بعد جانے کی تیاری شروع کی۔ بارات کا انتظام چاندنی لان میں کیا گیا تھا۔ میں اور میری بہن ترانہ آپا 9 بجے آپی کو لینے پارلر پہنچے، ماشاء اللہ سرخ شرارے، میچنگ گولڈ کی جیولری اور برائیڈل میک اپ میں وہ سادہ سی لڑکی پریوں کے دیس کی شہزادی لگ رہی تھی۔ الوہی روپ ان پر ٹوٹ کر آیا تھا۔ بارات میں ردا کی رائٹر دانیہ آفرین، ایف ایم 101 کی RJ رمشا رشید اور نعت خواں انعم مدثر نے بھی شرکت کی جو ہمارے لیے باعث اعزاز تھا۔ تقریباً 10 بجے بارات آنے کا شور ہوا۔ ہمارے جیجا جی خوب دھوم دھڑکے کے ساتھ اپنی دلہن کو رخصت کرانے آئے تھے۔ جیجا جی بھی بلیک شیروانی اور سرخ وسفید کلے میں کافی مہذب اور

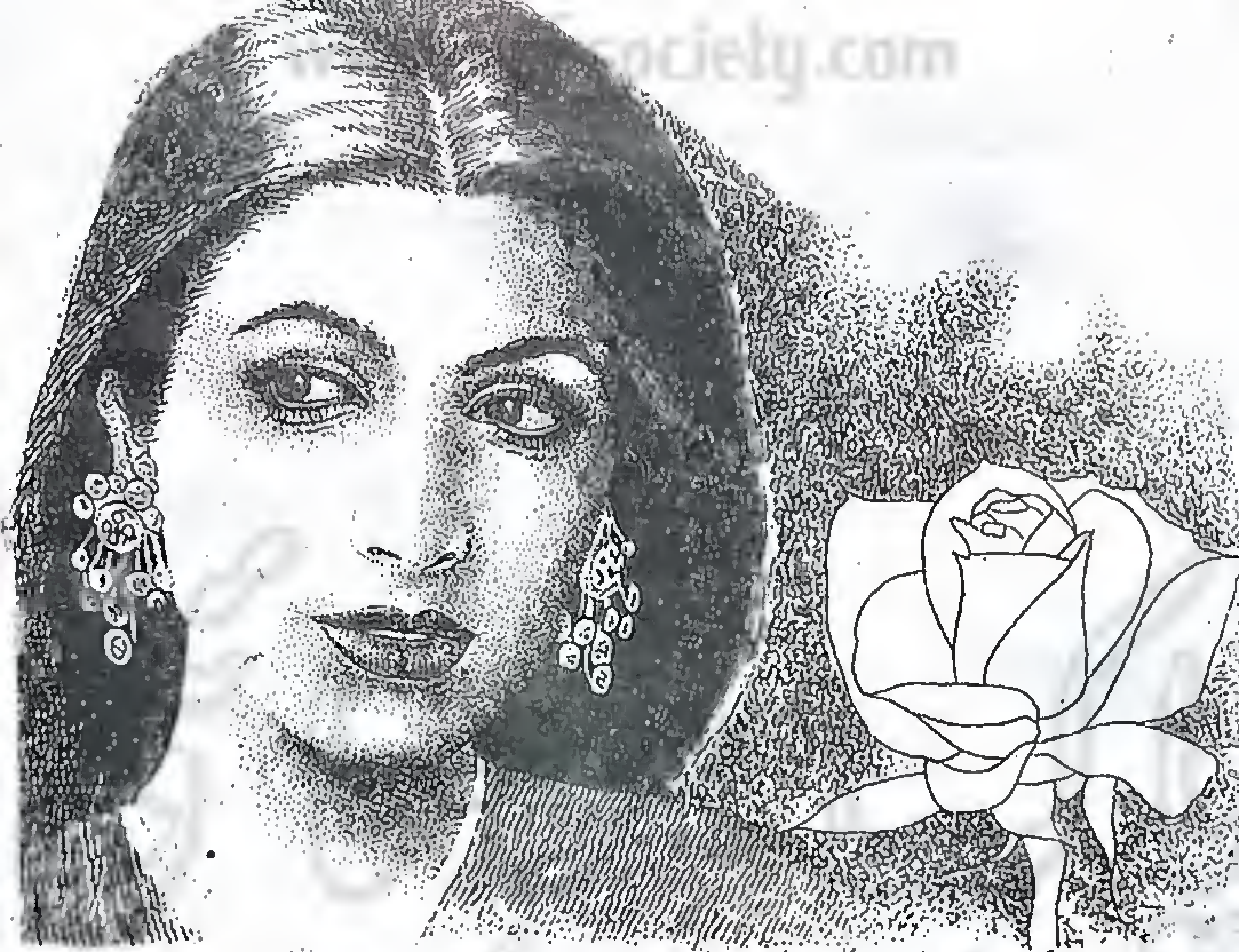
ہینڈسم لگ رہے تھے۔ ہر کسی نے اس خوب صورت جوڑی کو سراہا۔ مووی اور فوٹو سیشن اور دودھ پلائی کی رسم جو ہماری چھوٹی بہن شازیہ نے ادا کی اس کے بعد آخر وہ لمحہ آ گیا جب ہماری پیاری آپی ہمیں چھوڑ کر اپنی دعاؤں اور ہمارے پیار کی خوشبو میں قرآن پاک کے سائے تلے اپنے پیا کے ساتھ بابل کا آنگنا چھوڑ گئیں۔ بھائی نے آپی سے مل کر تسلی دی۔ اس وقت بھی خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت تھی۔ پاپا کی کمی ہر لمحے شدت سے محسوس کی مگر ہمیں یقین تھا کہ پاپا بھی اپنی لاڈلی اور قابل فخر بیٹی کے اس نئے سفر میں دعا گو ہوں گے۔ ہم سب تقریباً ایک بجے تھکے ہارے مگر خوش اور مطمئن گھر روانہ ہوئے جس کو جہاں جگہ ملی وہ وہاں ڈیرہ ڈال چکا تھا۔ کیونکہ اگلے دن صبح ناشتہ لے کر جانا تھا اور پھر شام میں ولیمہ کی تیاری کرنی تھی آخر ہم دلہن کی بہنیں تھیں لہٰذا ہمیں تو سب سے منفرد لگنا تھا۔

17 دسمبر 2016ء (تقریب ولیمہ)

دوسرے دن سب 11 بجے سو کر اٹھے جلدی جلدی ہماری خالہ ترانہ آپی، بہنوئی شہباز بھائی اور ان کے بچے اور چھوٹی بہن شازیہ ناشتہ لے کر روانہ ہوئے جو اب ایک بجے کے وقت برنچ بن چکا تھا (ہاہاہا) پھر شام میں سب نے ولیمہ میں جانے کی تیاری شروع کی میں نے نیٹ کی آف وائٹ اور پرپل ایمبرائیڈری کی میکسی اور شازیہ نے آٹھ کلیوں والی فراک زیب تن کی تھی۔ میچنگ جیولری اور میک اپ میں ہم حسین لگ رہے تھے (یقین نہیں آتا تو ہمارے مداحوں سے پوچھ لیں ہاہا) خیر 10 بجے ہم لوگ خوب ہلہ گلہ کرتے اپنی بہن سے ملنے کی خوشی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ کراؤن بینکوئیٹ نخیٔ حسن میں ولیمے کا Reception تھا :

پھر دولہا اور دلہن کی انٹری ہوئی تو تمام آنکھیں اس خوب صورت جوڑے پر اٹھی کی اٹھی رہ گئیں۔ ماشاء اللہ دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں بہت خوش اور خوب صورت لگ رہے تھے۔ ہماری بہن تو تاج پہنے ملکہ عالیہ لگ رہی تھی (جی جناب! اب وہ ہمارے جیجا جی کے دل کی ملکہ ہیں) اللہ نظر بد سے بچائے۔ آپی نے سی گرین اور پرپل کمبی نیشن کا فل میکسی زیب تن کیا ہوا تھا اور اس کے ساتھ سلور اور کندن کی جیولری اور کراؤن (تاج) پہن رکھا تھا۔ خوب صورت میک اپ نے ان کے معصوم حسن کو دوآتشہ بنا دیا تھا۔ ہمارے جیجا جی آصف بھائی بھی تھری پیس سوٹ میں کسی ریاست کے شہزادے سے کم نہیں لگ رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں خراماں خراماں اسٹیج پر آئے جہاں دو کنیزوں نے ان کا بھرپور استقبال کیا اور پھر خوشیوں کے جھرمٹ میں تقریب کا آغاز ہوا۔ دولہا اور دلہن کو مختلف گفٹس پیش کیے گئے۔ فیملی کے ساتھ فوٹو سیشن ہوا پھر پرتکلف ڈنر تناول کیا (آج ڈنر میں چکن بریانی، گاجر کا حلوہ، چکن کڑھائی، ٹِین، کانی اور مختلف قسم کی چٹنیاں اور سلاد تھی) تمام لوگوں نے اس تقریب کو خوب انجوائے۔ جیجا جی اور آپی دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں بہت ہی خوب صورت اور پرفیکٹ لگ رہے تھے۔ آخر میں یادگار فیملی فوٹو سیشن ہوا اس طرح یہ پروقار تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔ قارئین! بتائیے گا ضرور کہ آپ کی ہر دلعزیز رائٹر فرزین کی شادی کا احوال ہماری زبانی کیسا لگا اور آپ سے التماس ہے کہ اس خوب صورت جوڑے کو ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ ہمارے جیجا جی انتہائی نرم مزاج، دوستانہ فطرت اور ویل ایجوکیٹڈ شخصیت کے مالک ہیں۔ شادی سے پہلے آپی کو جو خدشات اور خوف لاحق تھے ان کی محبت بھری سنگت میں اب وہ دور ہو چکے ہیں اب وہ اچھے جیون ساتھی اور بہترین دوست بھی ہیں۔ اللہ پاک ہماری آپی کو ادبی سفر کی طرح زندگی کے اس حسین اور ازدواجی سفر میں بھی خوش اور آباد رکھے، آمین۔ اپنی دعاؤں میں انہیں اور ہمارے پاپا کو ضرور یاد رکھیے گا۔ (فی امان اللہ)۔

……☆……



عائشہ ذوالفقار

سلسلے وار ناولٹ

اُڑ جا رب تیری باری ہے

''حارث! میں نے کچھ......!'' اس نے میری بات کاٹی۔

''میں جانتا ہوں۔''

''ہو سکے تو مجھے معاف......'' اس نے پھر بات کاٹ دی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا ایک کام......!'' اس نے اب کی بار بھی بات کاٹ دی۔

''بولو؟'' نہ جانے کیوں میری آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

''مجھے ایک بار حمزہ سے ملوا دیں۔'' میری آواز بھر آئی تھی۔

''کہاں؟'' اس نے پوچھا۔



''تین بجے، بس اسٹیشن۔'' میں ایکدم کھڑی ہوئی۔

''یہ عارش کو دے دیجیے گا۔'' اس نے چپ چاپ میرا بڑھایا ہوا کاغذ پکڑ لیا۔ میں دروازے میں تھی جب وہ پیچھے سے بولا۔

''میں کچھ پوچھ سکتا ہوں؟'' میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''نہیں کیونکہ میرے پاس بتانے کے لیے ایک لفظ بھی نہیں ہے۔'' کہہ کر میں باہر نکل آئی۔ بوندا باندی شروع ہوگئی تھی۔

☆......☆

آتے ہوئے میں رکشے والے کو تین بجے کا ٹائم دے کر آئی۔ بس نے چار بجے آنا تھا۔ میں نے فیصل آباد جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ صرف وہی ایک شہر تھا جس کی مٹی مجھ سے تھوڑی بہت واقف تھی۔ دس بجنے والے تھے جب میں اوپر سے دونوں بیگ اٹھا کے لاؤنج میں آئی۔ بارش شروع ہوگئی تھی۔ عمیر نہ جانے کہاں تھا۔

''یہ لو......'' میڈم ثمینہ نے میری طرف ایک لفافہ بڑھایا۔ میں نے پکڑتے ہوئے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

قسط نمبر 6

''پتا نہیں کتنے ہیں۔ میں نے گنے نہیں۔ میں تم سے پہلے مرگئی یا تم مجھ سے پہلے مرگئیں۔ ہر دو صورت میں، میں تمہیں یہ پیسے معاف کرتی ہوں لیکن......'' انہوں نے وقفہ لیا۔

''اگر میں بھی زندہ رہی اور تم بھی تو یاد رکھنا حائقہ ارشد مجھے یہ پیسے واپس چاہئیں سمجھیں۔'' انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔

''اور یاد رکھنا۔ تم اس دنیا میں خدا کا دوسرا روپ ہو۔ خبردار جو کبھی مایوس ہو کے اس روپ کو بگاڑنے کی کوشش کی تو۔'' وہ فرداً فرداً میری ساری بیٹیوں کو پیار کر رہی تھیں۔ پھر ہولے سے میرے گلے لگیں۔ میرے آنسو نکل آئے۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

''مجھے آخری بار رخصت نہیں کریں گی؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''نہیں، تم کون سا ہمیشہ کے لیے جا رہی ہو۔ کچھ ہی عرصے میں تو لوٹ آؤ گی۔'' مجھے لگا ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ بلک بلک کے روتے ہوئے میں ان کی پشت سے لگی تھی انہوں نے ہولے سے مڑے بغیر اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا، پتا نہیں کیسے انہیں مجھ پر اتنا بھروسہ تھا۔ چند لمحوں بعد میں ان سے الگ ہوئی۔ میری طرف دیکھے بغیر وہ اندر چلی گئیں اور میرے دیکھتے دیکھتے دروازہ بند ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں پونچھتے ہوئے میں واپس صوفے پر آ بیٹھی۔ بارش کی رفتار میں تیزی آ گئی تھی۔ شاید اسی لیے عمیر ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ تین بجے مجھے باہر رکشے کی آواز آئی۔ جانے کا وقت ہو گیا تھا۔

''ماریہ بیٹا! چھوٹی بہنوں کا ہاتھ پکڑو۔'' میں نے دونوں بیگ گھسیٹ کر باہر لاتے ہوئے اسے کہا۔ رکشے والے نے دونوں بیگ اٹھا کر رکشے میں رکھے۔ بارش زوروں پر تھی۔ ٹھنڈا انہاؤں پر اور بادل گرج گرج کر بے حال ہو رہے تھے۔ جس نے باری باری سب بیٹوں کو رکشے میں چڑھوایا۔ آخری تین زیادہ چھوٹی تھیں۔ سب سے چھوٹی کو گود میں اٹھائے میں جیسے ہی دروازے کے قریب پہنچی عمیر بھی ایک دم اندر آیا۔ مجھے دیکھ کے وہ بڑے عجیب انداز میں مسکرایا تھا۔

''اوہ..... تو تیار ہو قبر میں جانے کے لیے۔'' وہ بولا تھا۔ میں چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''اور اگر قبر میں اتر کے بھی زندہ رہی تو......'' وہ میرے قریب ہوا۔ جھکا اور مسکرا کے سرگوشی میں بولا۔

''تو رہ کے دکھاؤ جاؤ۔'' میں نے چپ چاپ باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ بے رحم دنیا۔ گھٹا گھپ اندھیرا اور ایک لمبی مسافت۔ باز و پھیلائے کھڑی تھیں۔ میں نے چپ چاپ خود کو ان کے حوالے کر دیا۔

☆......☆

بس آنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ میں ساری بچیوں کو لے کر شیڈ کے نیچے رکھے بینچ پر بیٹھ گئی۔

''پتا نہیں حمزہ آئے گا کہ نہیں؟'' میں نے سوچا تھا چند ہی منٹ گزرے تھے کہ مجھے اپنے پیچھے حارث کی آواز سنائی دی۔

''حائقہ!'' میں یکدم کھڑی ہوئی۔ حمزہ، حارث سے دو قدم پیچھے کھڑا تھا۔

میں اس سے بات کرنے کے لیے الفاظ تلاش کرنے لگی۔ وہ چپ چاپ مجھے دیکھ رہا تھا۔

''حمزہ! آج اگر مجھے معافی سے بڑا کوئی لفظ آتا ہوتا اور میں اسے ہزار دفعہ بھی آپ کے سامنے کہتی تو بھی کم تھا۔'' میری آواز بھر آئی تھی۔

''بات کرنا تو دور کی بات، میں تو آپ کے سامنے نظریں اٹھانے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ الفاظ شاید کچھ

بھی نہیں ہوتے۔''
آنسو تواتر سے بہنے لگے۔ میں نے سر پر پڑی چادر کھینچی۔ حمزہ کے قدموں میں پھینکی اور ہاتھ جوڑتے ہوئے یکدم اس کے قدموں کی طرف جھک گئی۔ حمزہ نے لمحوں میں مجھے نیچے گرنے سے پہلے ہی تھاما تھا۔ میری آنکھوں سے بہتے آنسو حمزہ کی شرٹ بھگوتے چلے گئے۔ حارث چپ چاپ کھڑا رہ گیا۔
''پتا نہیں کب سانسیں پوری ہو جائیں، روز محشر کس کس کے بدلے چکاؤں گی۔ کم از کم آپ یہیں مجھے......''حمزہ نے میری بات کاٹ دی۔
''مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ روزِ محشر کم از کم میں تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔'' حمزہ ہولے سے بولا تھا۔ میں آہستگی سے اس سے الگ ہوئی۔ اس نے میری چادر اٹھا کے دوبارہ میرے سر پر دی تھی۔ میں ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں رگڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی، بس آ گئی تھی باری باری دونوں بیگ اندر رکھنے کے بعد کنڈیکٹر نے ساری بچیوں کو اوپر چڑھایا۔ چھوٹی بیٹی کو گود میں اٹھا کر میں بھی بس میں چڑھ گئی۔ دوبارہ مڑ کے دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ بس کی رفتار تیز ہوتی گئی اور میرے 27 سال کہیں پیچھے ہی رہ گئے۔

☆......☆

جب ہر سہارا چھوٹ جاتا ہے
ہر رستہ کھو جاتا ہے
جب دامن میں ایک ذرہ بھی ایسا نہیں رہ جاتا
جسے انسان اپنا کہہ سکے
جب اندھیرا ہر طرف غالب آ جاتا ہے
انسان اتنا گر جاتا ہے کہ پاتال بھی حیران رہ جاتی ہے
تب بھی......
پیدا کرنے والا انگلی نہیں چھوڑتا
ساتھ نہیں چھوڑتا
جب کوئی نہیں ہوتا تب بھی وہ ہوتا ہے
جب پیدا ہی اس نے کیا تو
وہ ساتھ کیسے چھوڑ دے؟ کیسے؟
نہیں چھوڑتا
میرا بھی نہیں چھوڑا

دھند میں لپٹی اس صبح جب میں فیصل آباد بس اسٹیشن پر اتری تو میری سات بیٹیوں کے علاوہ آٹھواں وہی تھا میرے ساتھ......میرا اللہ، میرا مالک۔
سب سے پہلے میں نے اپنی بیٹیوں کو ناشتہ کروایا۔ پھر انہیں لے کر میونسپل کمیٹی پارک آ گئی۔ چھوٹی والی سو رہی تھی۔ نسبتاً ایک پرسکون گوشہ دیکھ کر میں نے اسے کپڑا بچھا کر زمین پر لٹا دیا۔ اس دن پہلی بار میں نے اپنی بیٹیوں کو غور سے دیکھا۔ سب سے بڑی صرف پانچ سال کی تھی اور سب سے چھوٹی تین ماہ کی۔ ذہن پر زور دے دے کر میں نے ان کے نام یاد کیے۔ سب سے بڑی ماریہ شاہ، پھر دو جڑواں عائشہ اور رمشا پھر سدرہ۔

مجھے یاد نہ آیا کہ سدرہ اور عائشہ میں سے نہ جانے کسے سانس کا مسئلہ تھا۔ اس کے بعد پھر دو جڑواں عمارہ اور ''نام یاد نہ آیا'' میں نے ماریہ سے پوچھا۔

''ماریہ بیٹے! پھپھو نے اس بہنا کا کیا نام رکھا تھا؟'' اتنا مجھے کنفرم تھا کہ نام عالینہ نے ہی رکھا تھا۔

''سارہ۔''

مجھے اپنے آپ سے شرمندگی ہوئی اور سب سے چھوٹی اقراء۔ کیسے بڑی ہوں گی؟ میں نے تھک کے درخت کے تنے سے ٹیک لگایا۔ کچھ نہ کچھ تو پلان کرنا تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے میڈم ثمینہ کے دیے ہوئے پیسے گنے۔ وہ کل 80 ہزار تھے۔

جب روم کا بادشاہ شہنشاہ ہرقل ایرانیوں سے شکست پر شکست کھاتا چلا گیا تو قیصرِ ایران نے اس کے آگے ایک شرط رکھی۔ اسے کچھ عرصے کی مہلت دی جس میں اسے اپنے ملک کے تمام عیسائیوں اور گرجا گھروں سے بیش قیمت جواہرات اور نقدی جمع کر کے قیصرِ ایران کو دینی تھی۔ اس کے بعد روم ایرانیوں کا ہو جاتا اور شہنشاہ ہرقل کسی گوشے میں گمنامی کی موت مر جاتا۔ ہرقل نے شرط قبول کر لی۔ ہر کلیسا، ہر گرجے اور ہر پادری سے آخری ذرہ تک چھین لیا۔

اب اس کے سامنے دو راستے تھے پہلا تو یہ کہ چپ چاپ سارا مال ایرانیوں کے حوالے کر کے باقی کی زندگی گمنامی میں گزار کے مر جاتا۔ دوسرا یہ کہ اس مال سے ایک بار پھر اپنی جنگی طاقت مضبوط کرتا۔ رسک لیتا اور اپنے ملک کے دفاع میں ایرانیوں سے ٹکر لے لیتا۔ جنگ لڑتا اور شاید باقی کی زندگی شہنشاہ ہرقل کے طور پر گزار کے ایک یادگار موت مر جاتا۔

پہلا رستہ آسان تھا۔ دوسرا مشکل۔

مگر پہلی شکل بدصورت تھی، دوسری خوب صورت۔

پہلی موت بے کار تھی، دوسری یادگار۔

اس نے دوسرا رستہ چن لیا اور ایرانیوں کو اپنے ملک سے مار بھگایا۔ تاریخ اسے آج تک نہیں بھولی۔ جو لوگ اپنا حوصلہ بلند کر کے دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیتے ہیں، تاریخ انہیں کبھی نہیں بھولتی۔

تو کیا میں اس رومی بادشاہ سے بھی گئی گزری تھی جس نے یقینِ خدا کے بغیر ہی بازی جیت لی۔ جب کہ میرے پاس تو یہ یقین بھی تھا۔ میرے سامنے دونوں رستے کھل گئے۔

جب تک 80 ہزار چلیں تب تک جیوں اور جب ختم ہو جائیں تو محنت مزدوری کرتے کرتے گمنامی میں مر جاؤں۔ یا پھر رسک لوں ان 80 ہزار سے خود کو تیار کروں۔ لڑوں اور جیتوں۔ میں نے دوسرا رستہ چن لیا۔

بیگ سے ایک کاغذ اور پینسل نکالی۔ منزل کیا تھی؟ اسسٹنٹ پروفیسر فزکس ''Ap-physics'' گورنمنٹ ڈگری کالج فار وومن اور اس کے لیے مجھے دو کام کرنے تھے۔ ایم فل اور ''Appsc'' کا ٹیسٹ دوسرا کام تب ہوتا جب پہلا مکمل ہو جاتا۔ سو پہلا ٹاس ایم فل کرنا تھا مگر کیسے؟ نہ ڈگریاں تھیں اور نہ پیسے۔ 80 ہزار میں کسی صورت ایم فل نہ ہوتا۔ M.sc کیے اتنی دیر ہو گئی تھی کہ اسکالرشپ ملنا ناممکن تھا۔ مجھے کم از کم دو تین لاکھ جمع کرنے تھے اور جتنے عرصے میں جمع ہوتے اس دوران اپنا اور اپنی بیٹیوں کا پیٹ بھی بھرنا تھا اور سر بھی چھپانا تھا۔ پیسے تب جمع ہوتے جب نوکری ملتی اور وہ تب ملتی جب ڈگریاں ہوتیں۔ تو سب سے پہلا کام اپنی ڈگریاں دوبارہ اکٹھی کرنا تھا اور ان کے لیے اولین شرط ID کارڈ۔

میں نے ٹائم پتہ کیا۔ دس بجنے والے تھے۔ بچیاں اتنی چھوٹی تھیں کہ میں انہیں اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی سو ان سب کو ساتھ لے کر میں سب سے پہلے ''نادرا'' آفس آئی۔ بہت مشکل سے میری سنی گئی۔

''ID کارڈ گم ہو گیا ہے۔ وہ واپس کیسے ملے گا؟'' میں نے پوچھا۔

ایک لمبا طریقہ..... شام تک میں نے سارا پروسیس مکمل کیا۔ سارے فارم جمع کروائے۔

''پرسوں آئیے گا۔''

اب پرسوں تک کہاں رہوں؟ ڈھونڈ ڈھانڈ کے میں ایک پرائیویٹ ہاسٹل تک آئی۔

''روم شیئر کر کے رہنا ہے تو دو ہزار فی مہینہ اور اگر خالی روم چاہیے تو تین ہزار فی مہینہ جس میں صرف کمرہ اور بجلی کا بل، کھانے پینے سمیت باقی ہر شے رہنے والے کی اپنی ہوگی۔ کچن استعمال کرنا ہو تو گیس کا بل ادا کرنا ہوگا۔'' میں تو چکرا گئی۔ رہائش بہت مہنگی پڑنے والی تھی۔ پرسوں تک کا وقت تو میں نے جیسے تیسے پارک میں ہی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ایک اور مسئلہ میری دواؤں کا تھا۔ نہ جانے کس کس بیماری سے متعلق ایک بڑا سا پلندہ تھا گولیوں کا۔ میں نے ان کا حساب لگایا تو پریشانی سے سر چکرا گیا۔ وہ تو 5 ہزار فی مہینہ تک جا رہی تھیں۔ میں نے فی الحال ان تمام دواؤں کو پس پشت ڈال دیا۔

دو دن بعد میں دوبارہ نادرا آفس گئی۔ مزید دو دن کا کہا گیا۔ یہ دو دن بھی کھلے آسمان تلے گزارے۔ ٹھنڈ اور سردی کے باعث تقریباً ساری ہی بچیوں کو نزلہ زکام ہو گیا۔ میری مشقت اور بڑھ گئی۔

آخر ایک ہفتے بعد مجھے ID کارڈ مل گیا۔ پہلا زینہ عبور ہو گیا تھا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ بچیوں کو کھانا کھلا کے میں اسی وقت بورڈ آفس روانہ ہو گئی۔

☆......☆

بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن...... وہ رات میں نے اس آفس کے سامنے گزاری اور صبح ناشتہ کیے بغیر ہی آفس چلی گئی۔ نہ جانے اب اس بورڈ آفس نے مجھے کتنا خوار کرنا تھا۔ سارا طریقہ کار پوچھتے مجھے دو پہر ہو گئی۔ بچیاں بھوک سے بلکنے لگی تھیں۔ انہیں کچھ نہ کچھ کھلا کے وہیں بلڈنگ میں ایک طرف بٹھایا۔

''ماریہ بیٹے! بہنوں کا خیال رکھنا۔'' وہ پانچ سال کی بچی ہی میرا واحد بازو تھی۔

''کب تک مل جائیں گی ڈگریز؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''پندرہ بیس دن تک پہنچ جائیں گی۔'' فارم پر میں نے اسی پرائیوٹ ہاسٹل کا پتہ لکھوایا تھا۔

اب رات سڑک پر گزارنے سے بس کے اندر گزارنا بہتر تھا سو میں اسی وقت بس اسٹاپ آگئی۔ اب مجھے لاہور جانا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی B.sc کی ڈگری وہیں سے لینی تھی۔ اصل خوار تو میں وہاں ہوئی۔ ایک تو بارشیں شروع ہو گئیں اور دوسرے میری دونوں جڑواں بیٹیاں شدید بیمار ہو گئیں۔ میری اپنی کھانسی شدید ہو گئی۔ سارے پیسے صرف کھانے، دوا اور کرائے میں ہی ختم ہو رہے تھے۔ خدا خدا کر کے وہاں کا کام ختم ہوا۔

''دس، پندرہ دنوں تک......'' وہاں سے یہ جواب ملا۔ ہاسٹل کا ایڈریس لکھوا کر میں واپس آگئی۔ M.sc کی ڈگری کے لیے مجھے UAF جانا تھا۔ وہاں میں نے دو سال گزارے تھے سو وہ کام اتنا مشکل ثابت نہ ہوا لیکن خواری انتہا کی ہوئی۔ وہ ڈگری مجھے کم از کم ایک ماہ تک واپس ملنی تھی۔ وہاں سے باہر نکلتے ہوئے میں نے اپنے ڈپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

''پتہ نہیں کب لیکن واپس آؤں گی ضرور۔'' اگلے دن میں سرگودھا روانہ ہوئی۔ B.ed کی ڈگری کے لیے

ایک ہفتے کا کہا گیا۔ وہاں سے واپس آکر میں نے پرائیوٹ ہاسٹل میں کمرہ لیا۔ کسی کے ساتھ شیئرنگ کا تو سوال ہی نہیں تھا سو تین ہزار کی قربانی دی۔ اس دن پورے 27 دن بعد میں اور میری بیٹیاں پہلی بار چھت کے نیچے سوئیں۔ اگلے دن میں نے کچھ چادریں خریدیں اور تھوڑے سے برتن۔ پیسے گنے تو پریشانی سے میں اس رات سو نہ سکی۔ ایک مہینے میں صرف 55 ہزار باقی رہ گئے تھے۔ اگلے ہی دن سے میں نے نہیں کوئی کام ڈھونڈنے کی کوشش شروع کردی۔ بڑی مشکل سے ایک شاپنگ مال کے لیڈیز سیکشن میں سیلز گرل کی جاب ملی۔ 8 سے 5 بجے تک۔ 5 ہزار فی مہینہ۔ بہت کم تھے مگر اور کوئی چارہ نہیں تھا سو کرلی۔ ایک دو دن بعد میں ماریہ اور بڑی دونوں جڑواں کو اسکول لے گئی۔ عائشہ اور رمشا کو تو نرسری میں داخل کروادیا لیکن ماریہ نے نرسری کرلی تھی۔ اس کا سال ضائع کرنے کو میرا دل نہ کیا مگر لیونگ سرٹیفکیٹ نہ تھا آخر ہیڈ مسٹریس نے تسلی دی کہ اگر بچی چل گئی تو چھ ماہ بعد اسے پریپ میں پروموٹ کردیں گے۔ بس مطمئن ہوگئی مگر 60 روپے فی مہینہ خرچہ اور بڑھ گیا۔ میری ڈگریاں آتے آتے تین ماہ لگ گئے۔ جس دن آخری ڈگری آئی۔ اس رات میں خون تھوک تھوک کے مرنے والی ہوگئی۔ دوائیں چھوڑے تقریباً چار ماہ ہوچکے تھے۔ مایوسی نے پھر قبر میں اتارنا چاہا مگر...... ابھی تو کھیل شروع ہوا تھا۔ آغاز میں ہی ہار کیسے مان لیتی؟ سو صبح ہوتے ہی CV بنوائی فائل تیار کی اور نکل کھڑی ہوئی۔ کیا پرائیوٹ اسکول، کیا پرائیوٹ کالج اور کیا اکیڈمیز...... سب چھان ماریں۔ پندرہ دن بعد انٹرن شپ اناؤنس ہوگئیں۔ میں نے اپنی پوری جان ماردی اور آخرکار آٹھ ماہ کے کنٹریکٹ پر گورنمنٹ کالج میں جاب مل گئی۔ میں اس رات بہت روئی۔

واقعی پروردگار کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا۔ کسی کا اجر نہیں روکتا پورا صلہ دیتا ہے۔ دیر ہوتی ہے اندھیر نہیں ہوتی۔ جب انسان کسی چیز کو پانے کے لیے پاگل ہوجائے تو پھر ہر بند رستہ کھل جاتا ہے بس غلطی یہ ہوتی ہے کہ ہم اس عارضی دنیا میں ہر چیز مستقل مانگتے ہیں۔

خوشیاں ہوں تو ہمیشہ کے لیے۔

کامیابیاں ملیں تو ہمیشہ کے لیے۔

جب دنیا ہی ہمیشہ کے لیے نہیں ہے تو اس کی آسائشیں ہمیشہ کے لیے کیسے ہوسکتی ہیں؟

☆......☆

رفتہ رفتہ روٹین سیٹ ہوگئی۔ صبح آٹھ سے دس ایک پرائیوٹ کالج، دس سے دو بجے تک ڈگری کالج، شام تین سے پانچ بجے تک اکیڈمی اور رات کو چند بچے تھے جو ٹیوشن لیتے تھے۔ سانس لینے تک کا ٹائم نہ ملتا۔

''حائقہ! یاد رکھنا، اختتام کبھی بھی اختتام نہیں ہوتا بلکہ ہر اختتام ایک نئے اختتام کی شروعات ہوتا ہے۔'' میرے ذہن میں میڈم ثمینہ کی باتیں گھوم جاتیں۔ اس طوفانی رات میں جب میں نے عمیر کے گھر کی دہلیز چھوڑی تھی۔ تو وہ میرا اینڈ نہیں تھا بلکہ وہ اس اینڈ کی شروعات تھی جو میرے ایم فل تک جاکے ختم ہونا تھا۔

اس دن اتوار تھا۔ میں ہفتے بھر کے ٹیسٹ اور اپنا باقی کام لے کر جناح گارڈن آگئی۔ فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کے دسمبر ٹیسٹ کے لیے پیپر بنانا تھا۔ بچیاں اِدھر اُدھر کھیل میں لگ گئیں اور میں بینچ پر بیٹھ کے پیپر بنانے لگی۔

''ہائے او میرے ربا......'' ایک دم میرے کانوں میں ایک انتہائی جھنجھلائی ہوئی آواز آئی تھی۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ کوئی پندرہ سولہ سال کا لڑکا تھا جو مجھ سے کچھ فاصلے پر گھاس پر کتاب اور رجسٹر کھولے بیٹھا تھا۔ میں نے تھوڑا سا آگے ہوکر دیکھا تو اس کے آگے فزکس کی میٹرک کی کتاب کھلی ہوئی تھی۔ وہ نہ جانے کس چیپٹر کے سوال حل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے چند لمحے غور سے اس کو دیکھا۔ وہ ویلیوز ہی غلط رکھ رہا تھا۔

''دفع ہو، تجھے کیا ہو گیا اب؟'' اس نے برے طریقے سے کیلکولیٹر کے بٹن دبائے۔
میں ہولے سے مسکرا دی۔ ''فارمولے میں cos لکھا ہے اور نیچے sin لیے جا رہے ہو۔'' میری آواز پر وہ یکدم چونکا۔ میری طرف دیکھا اور پھر اپنے رجسٹر پر نظر دوڑائی۔
''غلطی میری نہیں ہے یہ فزکس ایسے ہی دماغ خراب کر دیتی ہے۔'' جھینپی سی ہنسی ہنس کے اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ماسٹرز ان فزکس۔'' میں نے بتایا۔
''ہاں تو اتنی بڑی ہو گئیں ہیں آپ، اب تھوڑی ناں دماغ خراب کریں گی۔'' اس نے جیسے میری عقل پر ماتم کیا۔
''ڈائریکٹ بڑی نہیں ہو گئی۔ تمہاری والی اسٹیج سے گزر کے ہی یہاں تک پہنچی ہوں بچے۔'' میں مسکرائی تھی۔
وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ''آپ پلیز مجھے یہ نمرکیلز سمجھا دیں۔ کوئی آئیڈیا نہیں ہے آپ کو کہ آج شام میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''
مجھے اس کی بات سے زیادہ اس کے لہجے پر ہنسی آئی۔ اس پندرہ منٹ میں، میں نے اسے وہ نمرکیلز سمجھا دیے۔
''اب کوئی مسئلہ؟'' میں نے حسب عادت اس سے پوچھا۔
''آپ کو پتہ ہے۔ میرے پاپا GC یونیورسٹی میں میتھ کے پروفیسر ہیں مگر مجھے ان کی سمجھ نہیں آتی۔ صاف کہہ دیتے ہیں تمہاری تو کھوپڑی ہی ڈیفیکٹیو ہے۔ اب آپ نے بھی تو سمجھایا ہے ناں اتنے اچھے طریقے سے۔''
میں اس کی بات سن کر دم بخود رہ گئی۔ بہت عرصہ ہو گیا تھا یہ فقرہ سنے۔ عجیب سی سرشاری محسوس ہوئی۔
''کہاں رہتی ہیں آپ؟'' وہ اپنی کتابیں سمیٹتے ہوئے بولا۔
''کیوں؟ تم ملنے آؤ گے؟'' میں ہنسی تھی۔
''ہاں شاید!'' وہ بولا۔
''کائنات گرلز ہاسٹل۔'' میں مسکرائی۔ وہ سر ہلاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔
''نام تو بتا دیں۔'' جاتے جاتے وہ بولا۔
''حائقہ!'' اپنا نام لینا عجیب سا لگا۔
''ذائقہ، یہ کیسا نام ہے؟'' وہ حیران ہوا۔
''حائقہ...... بدتمیز۔'' مجھے اس کے چہرے پر شرارت نظر آ گئی تھی۔
''بائے، میم حائقہ!'' اس نے جاتے ہوئے ہاتھ ہلائے تھے۔
''میم حائقہ......!'' ماضی کی لاتعداد آوازیں میرے ذہن میں گونج اٹھیں۔ نہ جانے کیوں گوشے نم ہو گئے۔ انگلی سے پانی صاف کرتی میں ماریہ کو آواز دیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆......☆

اس دن میں ساری بچیوں کو سلا کے خود لیکچرز تیار کر رہی تھی۔ جب وارڈن کی طرف سے پیغام آیا کہ مجھ سے کوئی ملنے آیا ہے۔ تقریباً دس بجنے والے تھے میں حیران ہوتی ہوئی وزیٹنگ روم میں آئی اور اسے دیکھ کے میری حیرانی سوا ہو گئی۔
''تم...... یہاں؟'' وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔
''کہاں مصروف رہتی ہیں آپ سارا دن۔ تین دن سے چکر لگا رہا ہوں۔ روز 100 روپے خرچ کر کے ڈبہ

پیک کرواتا ہوں۔'' وہ ایک چھوٹا سا ڈبہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''کیا ہے اس میں؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کی وجہ سے فرسٹ ٹائم میرے فزکس کے ٹیسٹ میں 10 سے اوپر نمبر آئے ہیں۔ آپ اندازہ نہیں کرسکتیں میری خوشی کا۔''

میں مسکرادی۔

''میں اورینٹل میں پڑھاتی ہوں شام کو وہاں آجایا کرو۔'' میں نے کہا۔

''مجھے نہیں سمجھ آتی اتنی بھیڑ میں۔'' وہ بڑے نخرے سے بولا۔

''تو پھر سوری...... میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''جتنی چاہے فیس لے لیجیے گا۔'' اس نے آخری حربہ آزمایا۔

''جب ٹائم ہی نہیں ہے تو......'' میں نے کندھے اچکائے۔

وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر ہولے سے بولا۔ ''اوکے، ایز یو وش، جیسے آپ کی مرضی۔'' کہہ کے وہ میرے پاس سے گزر کے باہر کی طرف چلا گیا۔

''عارش حسن۔'' وہ کہتا مجھے جامد کر گیا۔ میں بہت دیر تک وہاں سے ہل نہ سکی۔ بہت دیر بعد ہوش آیا تو وہ جاچکا تھا۔ میں ہولے ہولے چلتی ہوئی کمرے میں آگئی۔ انسان کتنی بھی کوشش کرے ماضی کو دفن نہیں کرسکتا کسی نہ کسی صورت وہاں سے آوازیں آتی ہی رہتی ہیں اور ہمیں سننا پڑتی ہیں۔ برداشت کرنا پڑتی ہیں۔

☆......☆

اس دن میری طبیعت پھر خراب ہوگئی۔ شام کو اکیڈمی سے فارغ ہو کہ میں نزدیکی لیڈی ڈاکٹر کے کلینک چلی گئی۔

''انجانے میں خود کو تکلیف دینا قابل معافی ہوسکتا ہے حائقہ لیکن سب کچھ جانتے بوجھتے خود کو موت کے گھاٹ اتارنا غلط ہے بالکل غلط۔'' ڈاکٹر ربیعہ نے کہا۔

میں نے اسے ساری صورتحال بتائی تھی۔ ''ڈاکٹر ربیعہ بہت مشکل ہے۔ میں جانتی ہوں تین بیٹیوں کی اسکول فیس کے پیسے کیسے ارینج کرتی ہوں، اس کے علاوہ دیگر اخراجات۔ ہر مہینے پانچ ہزار روپے وہ بھی صرف دواؤں کے لیے؟'' میں ہولے سے بولی۔

''تو جینا نہیں ہے کیا؟ زندہ رہوگی تو آگے بڑھوگی ناں اور زندہ رہنے کے لیے یہ میڈیسنز بہت ضروری ہیں۔'' ڈاکٹر ربیعہ بھی اپنی جگہ درست تھی۔

''نہ لوں تو کتنی دیر تک جی سکوں گی؟'' میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر ربیعہ مسکرائی۔ ''حائقہ! میں خدا نہیں ہوں۔ تم میڈیسنز لو یا نہ لو جینے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ جیو تم عمر بھر، نہیں تو فجر تک۔''

میں بول نہ سکی۔

''بالکل نہ چھوڑو۔ گیپ دے کرلیا کرو میڈیسنز ورنہ آہستہ آہستہ اندر ہی اندر ختم ہوتی چلی جاؤ گی۔''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ میں ان کا شکریہ ادا کرکے واپس آگئی۔ اس ماہ دوائیں استعمال کرنا لازمی ہوگیا تھا۔ دسمبر میں ٹیسٹ ہوئے اور پھر سردیوں کی چھٹیاں ہوگئیں۔

☆......☆

اس دن ہلکی ہلکی دھوپ نکلی تھی۔ ہاسٹل تو چاروں طرف سے بند تھا۔ میں بچیوں سمیت پیپرز اٹھا کے گارڈن آ گئی۔ اقراء کی طبیعت کافی دنوں سے خراب تھی۔ دھوپ میں لٹایا تو سکون سے سو گئی۔ میں پیپرز چیک کرنے لگی۔

''ہاؤ آر یو میم حافقہ؟'' اس کی کھنکھناتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ ناراض ناراض سا چہرہ لیے وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ ''منہ کے زاویے تو ٹھیک کرلو۔''

وہ ہولے سے میرے پاس بینچ کے قریب گھاس پر بیٹھ گیا۔ میں دونوں پاؤں اوپر کرکے بینچ پر بیٹھی تھی۔

''اب میرا منہ ہی ایسا ہے تو کیا کروں؟'' وہ بولا تو میں مسکرا کر رہ گئی۔

''یہ آپ کی بیٹی ہے؟'' اقراء کے پاؤں کو چھیڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بس ایک ہی ہے؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''نہیں، سات ہیں۔'' اس کا منہ کھل گیا۔

''سات..... اونچی آواز میں کہتے ہوئے اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کے سب کو گنا۔

''واقعی یار سات ہیں۔'' اس نے جیسے مجھے کوئی نئی اطلاع دی، میں مسکرادی۔

''آپ کی عمر کتنی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''28 سال۔'' میں نے بتادیا۔ وہ کافی دیر بیٹھا غور و غوض کرتا رہا۔ مجھے اسے دیکھ کر خوب ہنسی آئی۔

''تم اپنے چھوٹے سے دماغ پر زور نہ ڈالو۔ دو، دو جڑواں ہیں۔'' میری بات پر وہ اور حیران ہوا۔

''تمہارا کوئی دوست نہیں ہے کیا جو یہاں آ جاتے ہو؟'' اب کے میں نے پوچھا۔

''کیا بتاؤں آپ کو، ہر کسی کو اپنی اپنی پڑی ہے ہمارے گھر۔ پاپا کی اپنی لائف، ماما کا اپنا بوتیک، دو بہنیں ہیں انتہائی عجیب و غریب، میری بالکل نہیں بنتی ان سے۔ پتہ نہیں سمجھتی کیا ہیں خود کو۔ رہ گئی یہ بات کہ میرا کوئی دوست کیوں نہیں ہے تو بات یہ ہے کہ کسی کو میں پسند نہیں آتا اور کوئی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ عام لڑکے جو سارے کام کرتے ہیں۔ مجھ سے ایک بھی نہیں ہوتا اس لیے میں بس اکیلا ہی رہتا ہوں۔'' وہ بڑے مہذب انداز سے اپنی داستان سنا رہا تھا۔

''دراصل میں ناں سلفائیٹ ہوں۔ فطرت پر چلنا نہیں آتا ہے مجھے۔''

میں نے اس کی باتیں سن کے ہولے سے سر ہلایا۔

''تھوڑی تھوڑی میں بھی تمہارے جیسی ہی ہوا کرتی تھی۔''

وہ ایک دم آگے کو ہوا۔ ''ریئلی.....! پھر میری دوست بن جائیں کیونکہ ٹیچر بننے سے تو آپ نے منع کردیا۔'' پھر اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

''ایک شرط پر!'' میں بولی۔

''کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''میں تمہیں صرف حُسن کہا کروں گی۔'' وہ حیران ہوا تھا۔

''کیوں جی؟''

''بس ایسے ہی۔'' میں مسکرائی۔

''او کے۔'' وہ فوراً بولا۔ میں نے ہنستے ہوئے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

''تمہیں جب بھی فزکس میں کوئی پرابلم ہو تو سنڈے کو مجھ سے ڈسکس کرلیا کرو۔'' میں نے اسے کہا تھا۔

☆...☆

اپریل سے نیو ایڈمیشن شروع ہوئے تو میں نے سدرہ کا بھی داخلہ کروا دیا۔ ماریہ اب ون کلاس میں چلی گئی تھی۔ حسن بھی میٹرک کے پیپرز دے کر فارغ ہو گیا تھا۔ سو اکثر و بیشتر میرا سر کھانے آجاتا۔ جو بھی تھا لیکن اس سے چند منٹ باتیں کر کے میری کافی تھکن اتر جاتی یا تو وہ لڑکا واقعی بہت بولتا تھا یا پھر صرف میرے آگے ہی اتنا بولتا تھا۔ اس دن بھی اس نے مجھ سے ڈائمینشن کا ٹاپک سمجھ کے آرام سے کتاب اور رجسٹر بند کر دیا۔ اب اس نے سکون سے بیٹھ کے میرا سر کھانا تھا۔

''آپ سے ایک بات پوچھوں اگر آپ کو برا نہ لگے تو؟''

میں مسکرائی۔ ''برا لگنے والی ہوئی تو لگے گی۔''

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ ''آپ اپنے ہسبینڈ کے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟'' چند لمحوں کے لیے میں بے زبان ہو گئی۔ اس نے پھر ماضی والا دریچہ کھول دیا تھا۔

''کیونکہ مجھے طلاق ہو گئی ہے۔''

اس کے چہرے کے تاثرات ایک دم تبدیل ہو گئے۔ ''اوہ، ایم سوری۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''پتہ ہے میں حیران ہوں کہ آج تک میرے ماما، پاپا کس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں؟ یقین کریں دو منٹ بھی وہ ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرتے۔ اس قدر لڑتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ میں تو دعا میں کرتا ہوں کہ کب میری پڑھائی ختم ہو اور میں انڈیپینڈ ہوں۔ پھر ایک لمحہ نہیں لگاؤں گا الگ ہونے میں۔'' اس کی زبان فراٹے بھرنا شروع ہو گئی تھی۔

''اچھا تو یہ صلہ دو گے انہیں، جب تمہیں سہارے کی ضرورت تھی تب انہوں نے تو ایک دوسرے سے اختلافات کے باوجود تمہیں سہارا دیا اور جب انہیں سہارے کی ضرورت ہو گی تو تم انہیں چھوڑ دو گے؟''

وہ ایک دم میری طرف مڑا۔ ''انہیں کوئی ضرورت نہیں ہے میرے سہارے کی۔''

''اب نہیں ہے ناں دس بیس سال بعد جب بوڑھے ہو جائیں گے تو ہو گی بچے تو نہیں ہو ناں تم۔ اچھی طرح جانتے ہو کہ بوڑھے ماں باپ کو تو اف کہنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔'' میری بات شاید اس کے ذہن میں اتر گئی تبھی چند لمحوں بعد سوچ کر بولا۔ ''اچھا ٹھیک ہے جہاں اتنا برداشت کیا ہے تو تھوڑا اور بھی کر لوں گا۔'' وہ یوں بولا جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہو۔ میں ہولے سے مسکرا دی۔ مئی میں انٹرن شپ ختم ہوئی تو مجھے اکٹھی آٹھ ماہ کی تنخواہ ملی۔ ایک لاکھ بیس ہزار اور پورا سال پرائیوٹ کالج، اکیڈمی اور ہوم ٹیوشنز سے ملنے والے پیسوں سے رہائش، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، اسٹیشنری اور میری دواؤں کا خرچ نکال کے صرف 40 ہزار اکٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھے۔ بہت تھوڑے تھے مگر تھے تو سہی۔

میں نے ساری رقم بینک میں جمع کروا دی۔ گرمیوں کی چھٹیاں گزریں تو میں نے ایک بار پھر انٹرن شپ کے لیے انٹرویو دیا صد شکر اس بار بھی جاب مل گئی۔ ویسے بھی وہاں کی پرنسپل اور پورا اسٹاف مجھے اور میرے حالات کو بہت اچھی طرح جان چکا تھا۔

جولائی میں حسن کا رزلٹ آگیا۔ بہت شاندار تو نہیں لیکن اچھا تھا۔ میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود ''بقول اس کے خود تنہا لڑکے'' نے مجھے ٹریٹ دی۔ میری بیٹیوں کا بھی کافی خیال رکھنے لگا تھا۔ F.sc میں اس نے

کمپیوٹر، میتھ اور فزکس رکھی اور ساتھ ہی مجھ پر احسان بھی دھر دیا۔
''یہ فزکس اور میتھ تو صرف آپ کی وجہ سے رکھ رہا ہوں۔''
اچھے وقت کی ایک خامی ہوتی ہے کہ جلد ختم ہو جاتا ہے اور برے وقت کی ایک خوبی ہے کہ دیر تک نہیں رہتا۔ میرا برا وقت بھی رفتہ رفتہ گزر رہا تھا۔

☆......☆

اس دن بھی شدید دھند کے بعد دھوپ نکلی تھی۔ حسن کو نہ جانے کیسے پتہ ہوتا تھا کہ میں کس دن گارڈن آؤں گی۔ اس دن بھی جب میں اپنا رجسٹر اٹھا کر گارڈن آئی تو وہ پہلے سے وہاں بیٹھا زور و شور سے رٹا لگانے میں مصروف تھا۔
''خیریت ہے پہلی بار تمہیں اس قدر محنت سے پڑھتے دیکھ رہی ہوں۔'' میں نے پیپر بناتے ہوئے اسے چھیڑا۔
''بس میں نے سوچ لیا ہے کہ اس بار اس چڑیل کو ہرا کے ہی دم لوں گا۔'' میں ہنس پڑی۔
''وہ بھی یوں ہی ہنستی ہے جب میرے نمبر اس سے کم آتے ہیں۔ خدا کی قسم میں نے تو اس خلائی مخلوق کو کبھی لفٹ بھی نہیں کروائی اور اس نے خود ہی پتہ نہیں کب مجھ سے مقابلہ لگا لیا۔ اتنا ٹارچر کرتی ہے ناں مجھے جس کی کوئی حد نہیں۔'' حسن کے تاثرات سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ اپنی اس کلاس فیلو سے انتہائی تنگ تھا۔
''تو شاید وہ تم سے زیادہ محنت کرتی ہو؟'' میں نے کہا۔
''کوئی نہیں کرتی بس ایک نمبر کی رٹو ہے۔ رٹے مار مار کے مجھ سے زیادہ نمبر لے لیتی ہے۔ اس بار نہیں لینے دوں گا۔'' وہ دوبارہ کتاب میں گھس گیا۔ میں مسکراتے ہوئے دوبارہ پیپر بنانے لگی۔
''پتہ ہے۔'' چند لمحوں بعد اس نے پھر سر کتاب سے باہر نکالا۔
''کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے کہ اس کے ساتھ کچھ ایسا کروں کے اسے نصیحت ہو جائے۔ آئندہ کبھی میرے سامنے بولنے کی ہمت نہ......'' اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی میں نے زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پہ رسید کیا تھا۔ وہ دم بخود بیٹھا مجھے دیکھتا رہ گیا۔
''تم لڑکوں کے پاس جب کوئی چارہ نہیں رہتا تو پھر یہ ہی ایک طریقہ اختیار کرتے ہو سارے۔ بڑا غرور ہے ناں تم لوگوں کو اپنی ذات پر کہ جو بھی ہو جیسے بھی ہو غلط تو صرف لڑکی ہی ہوگی ناں تمہیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مقابلے کی طاقت تو ہوتی نہیں ہے تم میں۔ بس اپنی مردانہ طاقت سے سامنے والے کو دبا دیتے ہو۔'' آنسوؤں اور غصے کی شدت سے میری آواز کانپنے لگی تھی۔ حسن نے انتہائی زوردار طریقے سے ماضی کا دروازہ کھٹکھٹا دیا تھا اور خود آنکھیں کھولے گال پر ہاتھ رکھے بے یقین نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔
''خود تو جیت جاتے ہو۔ اپنی فتح میں سرشار ہو جاتے ہو۔ یہ نہیں سوچتے کہ اس کی زندگی کیسے گزرے گی جسے تم نے کہیں کا نہیں چھوڑا ہوتا۔'' میں رو رہی تھی۔
''میری طرح گزرتی ہے پھر اس کی زندگی حسن! میری طرح روز جیتے ہوئے، روز مرتے ہوئے، سات بیٹیوں کے ساتھ ایک انجان شہر میں تنہا جیتے ہوئے۔''
حسن نے ہولے سے پوچھا۔ ''کیا ہوا تھا آپ کے ساتھ؟'' اور میں اس کے پوچھنے پر چپ نہ رہ سکی آنسوؤں اور سسکیوں میں اسے سب سناتی چلی گئی۔
''وہ خود تو جیت گیا لیکن میں، میں زندہ درگور ہوگئی۔ آج بھی سوچتی ہوں کے قصور کیا تھا میرا؟ یہ ہی کہ میں

اپنے حصے کی خوشیاں جینا چاہتی تھی۔ اپنا نام بہت اونچا دیکھنا چاہتی تھی۔ عارش کو ڈاکٹر بنانا چاہتی تھی اور بس۔ میں نے تو کچھ نہیں چھینا تھا اس سے جس کے بدلے اس نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔''

حسن ہولے سے اٹھ کے میرے قریب آیا اور میرے ہاتھوں پر اپنے ہاتھوں کو رکھ کر بولا۔''ایم سوری۔''

میں نے برے طریقے سے اس کے ہاتھ جھٹکے۔''دفع ہو جاؤ یہاں سے شکل مت دکھانا آئندہ مجھے۔ بزدل۔'' اپنی چیزیں سمیٹ کے میں اسی وقت ہاسٹل واپس آگئی۔

☆......☆

''ایم سوری۔'' وہ صبح صبح کالج یونیفارم میں میرے ہاسٹل کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ میں بنا کچھ بولے آگے بڑھ گئی۔ بہت غصہ آیا ہوا تھا مجھے اس پر۔ کالج سے فارغ ہو کر جب میں اکیڈمی پہنچی تو وہ وہاں موجود تھا۔

''میم! آئی ایم سوری۔'' شرمندگی اس کی آنکھوں میں نظر آرہی تھی۔

''حسن! مجھے تنگ نہیں کرو۔ گیٹ آؤٹ۔'' ابھی اسے تھوڑا اور سبق سکھانا تھا۔ لگاتار ایک ہفتے وہ بیچارہ خوار ہوتا رہا۔ آخر مجھے ترس آگیا۔

''تھپڑ بھی تو مار لیا ناں آپ نے۔ اب ناراض تو مت ہوں۔ کردیں معاف۔'' اس دن میں بچیوں کے لیے جرسیاں خریدنے گئی تھی جب وہ وہاں آدھمکا۔''اور ابھی تو صرف کہا تھا کچھ کیا تھوڑی ناں ہے۔'' میں نے اسے قہر بار نظروں سے گھورا۔

''اور خبردار! جو کیا ورنہ کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کے گھٹنوں پر بیٹھ گیا۔

''آئندہ ایسا سوچوں گا بھی نہیں۔ پلیز Forgive me۔'' مجھے ہنسی آگئی۔

''ٹھیک ہے۔''

''یاہو'' کا نعرہ مارتا وہ ایک دم کھڑا ہوا تھا۔

''پتہ ہے آپ میری واحد دوست ہو۔ ایسے مت ناراض ہوا کرو میرا دل دکھتا ہے۔'' وہ باقاعدہ ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا۔

وقت تھوڑا اور سرکا۔ مئی میں دوبارہ تنخواہ ملی۔ میرے اکاؤنٹ میں کل تین لاکھ روپے ہو گئے۔ میرا ارادہ تھا اس بار ایم فل میں ایڈمیشن لینے کا۔ جولائی میں GAT کا ٹیسٹ دیا۔ وہ بھی کلیئر ہو گیا مگر ہمارے اختیار میں صرف سوچنا ہوتا ہے، کرنا نہیں۔ کرنا اوپر والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس نے ابھی مجھے ایم فل نہیں کروانا تھا۔

☆......☆

اس دن میں کالج میں تھی جب مجھے ماریہ کے اسکول سے کال آئی۔ سدرہ کی طبیعت ایک دم بگڑ گئی تھی۔ میں فوراً اسکول پہنچی۔ سدرہ کا سانس بری طرح بند ہو رہا تھا۔ میں انتہائی پریشانی کی حالت میں اسے اسپتال لے کر آئی۔ اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ کئی گھنٹے وہ آئی سی یو میں پڑی رہی۔ اس کا سانس نارمل نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے اس کا ہر قسم کا ٹیسٹ کروانے کو کہا گیا۔ رپورٹس انتہائی خطرناک تھیں۔

''دیکھیں میڈم! آپ کو جلد از جلد بچی کی ناک کا آپریشن کروانا پڑے گا۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی کارٹیلج کا سائز بھی بڑھ رہا ہے۔ دیر ہو گئی تو ایک اور اٹیک ہونے کا خدشہ ہے جو بچی کے لیے انتہائی خطرناک ہو سکتا ہے۔''

میرے ہوش اڑ گئے میری چار سال کی ننھی سی جان اور اتنی بڑی تکلیف۔ اسے تاروں میں جکڑا دیکھ کر میرے آنسو

نکل آئے۔

''کتنا خرچ آئے گا اندازاً؟'' میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''تقریباً دو لاکھ۔'' میں سن رہ گئی۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا اور اگر ہوتا تو بھی کیا میں کچھ سوچتی؟ کیا میں سدرہ کے بغیر رہ سکتی تھی۔ کیا اس کی جگہ کوئی اور لے سکتی تھی، نہیں۔ کیا میرا ایم فل، میری بچی کی زندگی سے زیادہ اہم تھا؟ یقیناً نہیں کسی صورت نہیں۔ میں نے دو لاکھ روپے جمع کروا دیے۔ حسن نے میرا بہت ساتھ دیا۔ مجھے تو سدرہ کے علاوہ کسی کا ہوش ہی نہیں تھا۔ اس نے ہی باقیوں کا خیال رکھا۔ مجھے بے تحاشا حوصلہ دیا۔ پھر بھی آپریشن والی رات میرا ضبط جواب دے گیا۔ اپنے اوپر تکلیفیں سہنا آسان ہے مگر اپنے وجود کے ٹکڑوں کا تو رونا بھی نہیں دیکھا جاتا۔ ایسے ہی تو ماں کو خدا کا دوسرا روپ نہیں کہہ دیا گیا۔ ایسے ہی تو ماں کے قدموں تلے جنت نہیں رکھ دی گئی۔ حسن نے مجھے کندھے سے لگا کر چپ کروایا۔

''حسن! میں جتنا آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ مجبوریاں اتنا ہی پیچھے کھینچ لیتی ہیں۔ پتہ نہیں میری قسمت میں ایم فل ہے بھی کہ نہیں۔'' اس رات میری حالت پھر ویسی ہو رہی تھی۔ مایوسیوں سے آلودہ تاریکیوں سے بھرپور۔

''آپ کی قسمت میں ایم فل ہے میم! بس ذرا دیر سے ہے شاید۔'' وہ شاید ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سدرہ کا آپریشن کامیاب ہو گیا لیکن میری جدوجہد اور لمبی ہو گئی۔ مصیبتوں کا باب کچھ اور طویل ہو گیا۔

انسان انتہائی بے صبرا ہے انتہائی جلد باز۔ بھول جاتا ہے کہ جو پروردگار دکھ دیتا ہے وہی ان دکھوں کا ازالہ بھی کرتا ہے۔ دکھ دینا، سکھ دینا دونوں اسی کے اختیار میں ہے۔ میرے دکھ کا ازالہ بھی اس نے خود ہی کیا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بند رستہ یوں کھل جائے گا۔ اگست کے آخر میں جب انٹرن شپ کے انٹرویوز ہوئے تو تنخواہ ڈبل اور کنٹریکٹ کم۔ صرف چھ ماہ۔ میں کس قابل تھی اس کے سامنے؟ مٹی کے ایک ذرے لائق بھی نہیں۔ میری سالوں کی محنت اور مشقت کو اس نے چھ ماہ تک محدود کر دیا۔ مجھے جتا دیا کہ شکوہ کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ جیسے ہی مارچ ختم ہوا تو میرے تین لاکھ پھر سے مکمل ہو گئے۔ ماریہ تیسری کلاس میں چلی گئی۔ اقراء کے سوا باقی سب اسکول جانے لگیں۔ میرے لیے فرسٹ ٹائم میں کلاسز لینا زیادہ آسان تھا کیونکہ اس وقت تمام بچیاں اسکول میں ہوتیں اور اقراء کو میں چند گھنٹوں کے لیے ڈے کیئر میں چھوڑ دیتی۔ سو میں نے ایسے ہی کیا۔ پرائیویٹ کالج کو خیرباد کہہ دیا۔ اکیڈمی ٹائمنگ تین سے پانچ تھیں سو ہوم ٹیوشنز بڑھا لیں۔ کچھ تین بجے سے پہلے اور باقی شام میں ایڈجسٹ کر لیں۔ ایم فل کے علاوہ باقی تمام خرچے مجھے ان ٹیوشنز سے ہی نکالنے تھے۔ اگست سے ایڈمشنز شروع ہوئے۔ میرٹ لسٹ میں گیارہویں نمبر پر نام آیا۔ ایک اور کام بھی ہوا۔ حسن کا Fsc کا رزلٹ آیا اور اس نے Bsc کرنے کی بجائے باقاعدہ اپنے پاپا سے جھگڑا کر کے ڈنکے کی چوٹ پر B.s کمپیوٹر سائنس میں ایڈمشن لے لیا۔ میں نے اور اس نے اکٹھے ہی سارا کام کیا۔ ایڈمیشن فارمز، میڈیکل فیس وغیرہ اب پتہ نہیں اس کام سے وہ زیادہ ہی خوش تھا یا میں۔ پتا نہیں لیکن جو بھی ہوا تھا شاید بہت بہتر ہوا تھا۔ کلاسز اکتوبر سے شروع ہونا تھیں۔

☆......☆

''پتہ نہیں تمہیں یاد ہو گا یا نہیں۔ میں پہلے بھی آئی تھی یہاں۔ بہت سال پہلے تب بہت ستایا تھا تم نے مجھے۔ بہت تنگ کیا تھا۔ بہت رویا کرتی تھی میں۔ میں نے تمہیں پتہ نہیں کیا کچھ دیا تب تم نے مجھے M.sc کی ڈگری

دی تھی۔ وہ بھی سلور میڈل کے ساتھ لیکن آج جب کہ میں دوبارہ تمہارے پاس آئی ہوں۔ وہ پہلے والا حوصلہ نہیں ہے میرے پاس۔ آج اتنی ہمت نہیں ہے مجھ میں کہ تمہارے دیے دکھ برداشت کر سکوں۔ پہلے جیسی طاقتور اور مضبوط نہیں ہوں میں۔ بہت ٹوٹ گئی ہوں بہت بکھر گئی ہوں۔ پلیز اس بار ذرا اپنا ہاتھ نرم رکھنا۔ تھوڑا ترس کھا لینا اس بار مجھ پر۔ زیادہ تنگ مت کرنا پلیز۔'' یونیورسٹی کے مین گیٹ پر کھڑے ہو کر میں نے اس سے ریکویسٹ کی تھی۔ اب پتہ نہیں وہ مانتی کہ نہیں۔ بہر حال میں نے خود کو ہر طرح سے تیار کر لیا۔ اس دن بھی میں پہلی دو کلاسز لینے کے بعد حسن کو لے کر ناشتہ کرنے کینٹین پر آ گئی۔ اب دواؤں کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا تھا میرا۔

''اوئے ہوئے میم جی کیا ٹیبں ہے؟'' حسن نے انتہائی عاشقانہ انداز میں میری توجہ اس طرف مبذول کروائی۔ فیشن اور بولڈنیس کے ہر ریکارڈ توڑتی وہ لڑکی مجھے بھی حیران کر گئی۔

''یار! کتنی پیاری ہے ناں۔'' حسن اس پر مرتا جا رہا تھا اور پھر اچانک اس نے چاولوں سے بھری پلیٹ میں سے چمچ نکال کے میز پر پٹخا اور اپنے میک اپ اور حلیے سے بے نیاز دونوں ہاتھوں سے چاول کھانے لگی۔ حسن منہ کھولے اسے دیکھتا رہ گیا۔ مائدہ انور نام تھا اس کا اور وہ میری کلاس فیلو تھی۔ تئیس سالہ مائدہ انور میں سب کچھ تھا خوب صورتی بولڈنیس، فیشن، ذہانت...... اگر نہیں تھی تو عقل نہیں تھی۔ اس معاملے میں وہ حسن سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ ہر کسی کے ہاتھوں لمحوں میں بے وقوف بن جاتی۔ حسن اور مائدہ میں کبھی نہ بنی۔ اسے دیکھتے ہی حسن کی زبان میں خارش ہونے لگتی۔ کوئی نہ کوئی بات کہہ کر اسے تپا دیتا اور پھر بس مائدہ ہوتی اس کی زبان۔ اس کے ہاتھ اور حسن...... دونوں ازلی دشمنوں کی طرح لڑتے۔ مائدہ ذرا نہ سوچتی کہ وہ ایک لڑکی تھی اور ایم فل کی اسٹوڈنٹ تھی اور حسن ذرا نہ خیال کرتا کہ وہ اس سے چھ سال چھوٹا تھا۔ صرف میری وجہ سے ہم تینوں کی تکون قائم و دائم تھی اور تکون بھی عجیب ایک تیس سالہ طلاق یافتہ عورت ایک تئیس سالہ پھلجڑی اور ایک سترہ سالہ تنہا لڑکا۔ رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا کہ مائدہ انتہائی پرخلوص اور پیار کرنے والی لڑکی تھی۔ اسی لیے اسے ہر دوسرے لڑکے سے پیار ہو جاتا تھا۔ خود انتہائی خوب صورت تھی اور چوائس انتہائی خراب۔ آئے دن ایسے ایسے نمونے اس کے ساتھ نظر آتے کہ اکثر اوقات تو حسن رونے والا ہو جاتا۔

''چھ سال چھوٹا نہ ہوتا تو اسے یوں ضائع نہ ہونے دیتا۔'' اسے اپنے چھ سال چھوٹے ہونے کا بے انتہا قلق تھا لیکن جو بھی تھا۔ مائدہ کے ہر افیئر کے ختم ہونے کے بعد رونے کے لیے کندھا وہی دیتا۔ وہ بے چاری سسکیاں بھر رہی ہوتی اور خود وکٹری کے نشان بنا بنا کے جشن منا رہا ہوتا۔

اس دن بھی میں اور مائدہ جناح گارڈن میں بیٹھے مڈ کے پیپرز کی تیاری کر رہے تھے جب مٹھائی کا ڈبہ لے کر تیزی سے بھاگتا ہوا آیا اور دھم سے مائدہ پر گر گیا۔

''دفع دور۔'' مائدہ کی زبان انتہائی صاف تھی۔

''یہ لیں کھائیں۔'' اس نے میرے منہ میں برفی ٹھونستے ہوئے ڈبہ مائدہ کی گود میں رکھ دیا۔

''کس خوشی میں ہے یہ؟'' میں نے پوچھا۔ حسن نے یوں ادھر ادھر دیکھا جیسے پتہ نہیں کیا بتانے لگا ہو۔ پھر میرے کان کے قریب ہو کے آہستہ سے بولا۔

''میری کہانی چھپی ہے۔'' چند لمحوں بعد میری اور مائدہ کی ہنسی کا فوارہ اکٹھا پھوٹا تھا۔

''اچھا کس میں بچوں کی دنیا میں......'' مائدہ خوب ہنسی۔

''میں رومینٹک اسٹوریز لکھتا ہوں حاسدی۔'' اس کی اس بات پر ہم دونوں مزید لوٹ پوٹ ہو گئیں۔

''اچھا اچھا وہ تین عورتیں تین کہانیاں ٹائپ۔'' مائدہ اسے خوب ستا رہی تھی۔ حسن کا منہ بن گیا۔ حسن اس سے ڈائجسٹ چھیننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

☆......☆

جیسے ہی دوسرا سیمسٹر شروع ہوا ppsc کی 17 اور 18 گریڈ کی سیٹیں اناؤنس ہو گئیں۔ میں نے اور مائدہ دونوں نے اپلائی کیا۔

''مائدہ! چلو میرے ساتھ، فیس جمع کروانی ہے۔'' اسے ساتھ لے کر میں MCB آ گئی۔

''یہ دو واؤچر کس چیز کے ہیں؟'' میرے ہاتھ میں دو واؤچر دیکھ کے وہ حیران ہوئی۔

''ایک 17 کے لیے اور دوسرا 18 کے لیے۔'' میں نے بتایا۔ مائدہ کو یکدم غصہ آیا۔

''دیکھو حائقہ! میں تمہاری طرح نہ تو عقلمند ہوں اور نہ زمانہ شناس۔ نہ ہی تمہاری طرح اللہ کے نزدیک ہوں لیکن ایک بات جانتی ہوں کہ دعا وہ قبول ہوتی ہے جس پر یقین ہو تم 18 کے ساتھ 17 کا اسی لیے دے رہی ہو ناں کہ شاید 18 کا نہ ہو۔ تو جب تمہیں یقین ہی نہیں ہے تو کیسے مل جائے گا 18 گریڈ۔'' میں چپ کھڑی رہ گئی۔

''جب ٹھان لی ہے کہ AP بننا ہے تو پھر دفع مارو ہر چیز کو۔ صرف 18 کو منزل بناؤ گی تبھی اس تک پہنچو گی ناں اگر اس سے پہلے ہی 17 پر رکنے کا سوچنے لگو گی تو 18 کبھی بھی نہیں ملے گا۔'' اس نے میرے ہاتھوں سے 17 والا واؤچر چھین لیا۔

''حائقہ! صرف 18 گریڈ، صرف Ap بس۔'' مائدہ مجھے کندھوں سے تھام کے بولی۔ میں سن رہ گئی۔

''عارش! صرف ڈاکٹر، صرف ڈاکٹر......'' مجھے میری ہی آواز سنائی دی تھی۔ کیوں کہا تھا میں نے عارش کو وہ سب؟ کیونکہ مجھے اس پر یقین تھا اور وہی یقین آج مائدہ مجھ پر کر رہی تھی۔ میں نے صرف 18 والے کی فیس جمع کروادی۔ گرمیاں آئیں تو میری طبیعت حد سے زیادہ خراب ہو گئی۔ مجھے آرام چاہیے تھا جو کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ میں ایک بار پھر مرتے مرتے بچ گئی لیکن دواؤں کا پلندہ مزید بڑا ہو گیا۔ دوسرے سیمسٹر کے اختتام تک ایک اور دھماکہ ہو گیا۔ مائدہ انور کی منگنی ہو گئی۔ حسن کا منہ دیکھنے والا تھا۔

''مار دیا اس بے وقوف نے مجھے۔ اب نہیں اور جینے والا میں۔'' وہ باقاعدہ گریبان چاک کر کے ماتم کر رہا تھا۔ مجھے ہنسی روکنا دوبھر ہو گیا۔

''ایک امید تھی کہ شاید یہ میری ہو جائے مگر...... آنٹی جی نے بڑی ہی جلدی کر دی۔ قصور ان کا بھی نہیں ہے۔ بیٹی بانس کی طرح لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ منگنی نہ کرتیں تو ٹاور سے بیاہنا پڑتا۔'' میں نے بمشکل اس کی زبان بند کروائی۔

''تصویر تو دکھاؤ۔'' میں نے اس کا سرخ چہرہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ بتیس دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اس نے بیگ سے تصویر نکالی۔ حسن نے یکدم اس کے ہاتھوں سے اچک لی۔ ہر طرح سے اس لڑکے کو جانچا اور پھر فیصلہ سنا دیا۔

''یہ تو نہیں اچھا۔ شکل سے ہی وحشت گرد لگتا ہے۔'' مائدہ نے اس کے دھمک لگایا۔

''خبردار! جو انہیں کچھ کہا تو۔'' حسن کی آنکھیں کھل گئیں۔

''مجھے تو کبھی نہ اتنی عزت دی۔'' دونوں پھر الجھ گئے۔

☆......☆

دوسرے سیمسٹر کے ساتھ ہی ماریہ پانچویں کلاس میں چلی گئی۔ اقراء بھی اسکول جانے لگی۔ ان کے کپڑوں، کتابوں اور دوسری ضروری چیزوں کے خرچے بڑھتے چلے گئے۔ میں نے ایک بار پھر دوا ئیں استعمال کرنا چھوڑ دیں۔ دوسرے سیمسٹر میں میری LGPA تیسرے نمبر پر تھی۔ تیسرا اور چوتھا سیمسٹر ریسرچ کا تھا۔ میرا سارا اکاؤنٹ خالی ہو گیا۔ اب یونیورسٹی نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ مجھے انتہا کا خوار کر دیا۔ یونیورسٹی کے کمپیوٹر سیکشن میں خوار ہو ہو کر میں نے تھیسس بنایا۔ نظر انتہا کی کمزور ہو گئی۔ خدا خدا کر کے ریسرچ ورک مکمل ہوا اور اس سے پہلے کے فورتھ سیمسٹر میں میرا تھیسس جمع ہوتا۔ مجھے ایک انتہائی نا قابل یقین خبر ملی۔

ماریہ نے پانچویں کلاس میں ٹاپ کیا تھا۔

چند لمحوں تک تو مجھے یقین ہی نہ آیا۔ مائدہ اسے چوم چوم کر پیار کر رہی تھی۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے اپنی بچی کو کبھی ایک لفظ بھی ویسے نہیں پڑھایا جیسے پڑھانا چاہیے تھا۔ بس ان کی ضرورتیں پوری کرتی رہی کھانا، پینا، پہننا، اوڑھنا، سونا، کتابیں، کاپیاں، فیس اور اس کے علاوہ کبھی کچھ کرنے کا سوچا ہی نہیں۔ میرا خیال تھا کہ پہلے میں خود کچھ بنوں۔ اس کے بعد ہی میں اپنی بچیوں کے لیے کچھ کر سکوں گی اور اس بھاگم بھاگ میں، میں بھول ہی گئی کہ وہ میرا خون تھیں۔ کیسے نہ اثر دکھاتیں؟ کیسے نہ ثابت کرتیں؟ پانچ سال گورنمنٹ اسکول کی سیاست نے اسے ظاہر ہونے ہی نہ دیا۔ بورڈ کے پیپرز میں آ کے اس کا زور چل گیا۔ میں نے اسے گلے لگایا تو آنسوؤں کے سوا کچھ نہ نکلا۔

کیا میں کہہ سکتی تھی کہ خدا صلہ نہیں دیتا؟

کیا میں کہہ سکتی تھی کہ خدا مجھ سے پیار نہیں کرتا؟

اگست کے آخر تک تھیسس جمع ہو گیا۔ ستمبر میں وائیوا اور اکتوبر کے آخر تک DMC مل گیا۔ اسے ہاتھ میں لیے میری یہ حالت تھی ہر دھڑکن سیکنڈ کے وقفے سے آ رہی تھی۔ کانپتے ہونٹ، بہتی آنکھیں، ٹانگوں پر کھڑے رہنا دو بھر ہو رہا تھا۔ بہت دیر تک مائدہ مجھے خود سے لگا کر بیٹھی رہی۔ وہ صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا نہیں تھا۔ وہ ایک نئے اختتام کی شروعات تھی۔

''مائدہ! میں کسی قابل نہیں ہوں۔ کسی لائق نہیں ہوں۔ آتا کیا ہے مجھے پروردگار کے آگے رونے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ 10 سال میں اس کے آگے صرف روئی ہوں صرف گڑگڑائی ہوں اور اس نے اس رونے کو ہی میری عبادت مان لیا۔'' میرے الفاظ ٹوٹ رہے تھے۔

''کبھی پوری پوری رات نفل نہیں پڑھے۔ کبھی پورا پورا سال روزے نہیں رکھے۔ کبھی خیرات نہیں کی۔ کبھی کسی کی ضد نہیں کی لیکن اس نے تب بھی سن لی۔ کون کہتا ہے کہ وہ نہیں سنتا۔ مائدہ وہی تو سنتا ہے جب کوئی دوسرا نہیں سنتا۔ وہی تو ہوتا ہے جب کوئی نہیں ہوتا۔'' آس پاس کے لوگ حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ مائدہ مجھے سنبھال نہیں پا رہی تھی۔

''وہ اس رات بھی میرے ساتھ تھا جب میں بے یارو مددگار بس اسٹیشن پر کھڑی تھی اپنی سات بیٹیوں کے ساتھ اور وہ آج بھی میرے ساتھ ہے جب کہ مجھے یہ ڈگری ملی ہے۔'' بمشکل مائدہ مجھے وہاں سے لے کر آئی۔ وہ رات میں نے اسپتال میں گزاری۔

اس ذات باری تعالیٰ کا شکر ہی ادا نہیں ہو پا رہا تھا مجھ سے۔

☆......☆

DMC ملنے کے ایک ہفتے بعد ٹیسٹ اناؤنس ہوگئیں مجھے بہت اچھی سی تیاری کرنا تھی سو ہوم ٹیوشنز فی الحال چھوڑ دیں پنجاب کالج جوائن کرلیا اور پارٹ ٹائم اکیڈمی۔ مائدہ کی شادی ملتوی ہوگئی تھی سو اس نے موجی نے PHD میں ایڈمیشن لے لیا۔ حسن کا پانچواں سیمسٹر شروع ہوگیا تھا۔ اسکول والوں پر زور ڈال کے میں نے ماریہ کی دو کلاسز ایک سال میں کروائیں۔ اپریل میں جب ایڈمیشنز ہوئے تو وہ آٹھویں میں چلی گئی اور اس سال سدرہ پانچویں میں پوزیشن لے آئی۔ مجھے یقین نہ ہوا کہ چند ماہ پہلے ICU میں زندگی اور موت کی جنگ لڑتی وہ بچی آج ٹاپر تھی۔ میرا ٹیسٹ کافی اچھا ہوا۔ منزل چند قدم ہی دور تھی۔ اس دن میں کالج سے واپس آئی تو مائدہ اور حسن دونوں میرا انتظار کررہے تھے۔ مجھے ان کے چہروں کے تاثرات عجیب سے لگے۔

''خیریت کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میم آپ کا ٹیسٹ......'' حسن کی بات پر میرا دل یکدم بیٹھ گیا۔ پورا جسم ٹھنڈا برف ہوگیا۔

''کیا ہوا ٹیسٹ کو؟'' میری آواز کانپ رہی تھی۔ مائدہ نے سر جھکا لیا۔ میں یکدم دل پر ہاتھ رکھ کے نیچے کو بیٹھی تھی۔

''ہائے اللہ! حائقہ کچھ نہیں ہوا بہنا ہارٹ اٹیک نہ کروالینا۔'' مائدہ تیر کی طرح میری طرف آئی۔

''چڑیل میں نے منع بھی کیا تھا ایسا مذاق کرنے سے۔'' حسن نے مجھے تھاما تھا۔ میری آنکھیں بند ہورہی تھیں۔

''پاس ہوگیا ہے آپ کا ٹیسٹ میم! اتنے اچھے نمبر'' اس سے زیادہ میں سن نہ سکی۔ ہوش آیا تو وہ دونوں بے وقوف میرے سرہانے کھڑے رو رہے تھے۔

''میم! قسم سے میرا قصور نہیں ہے۔ اس لم ڈھینگ نے کہا تھا مجھے۔'' حسن کو دیکھ کر میں مسکراہٹ نہ روک پائی۔

''حائقہ! مجھے ذرا سا بھی آئیڈیا نہیں ہوا کہ تجھے اٹیک بھی ہوسکتا ہے سوری یار۔'' دونوں سسکیاں بھر بھر کے ہاتھ جوڑ رہے تھے۔ میرا ٹیسٹ کلیئر ہوگیا تھا۔ اب بس انٹرویو باقی رہ گیا تھا۔

☆......☆

پنجاب کالج میں پڑھانا ایک الگ ہی تجربہ تھا۔ نہ صرف محنتی اساتذہ بلکہ انتہائی محنتی اسٹوڈنٹس ایک سے بڑھ کے ایک ذہین۔ جتنا مزہ وہاں پڑھا کر آیا۔ وہ اب تک نہ آیا تھا۔ اسی لیے میں نے اس سال انٹرن شپ کے لیے اپلائی نہ کیا۔ پنجاب کالج میں زیادہ مزہ آتا تھا۔ نومبر میں انٹرویوز کی ڈیٹس آئیں۔ بس یہ آخری بار تھی۔ آخری رکاوٹ پار ہوجاتی تو......؟ بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ اللہ کے حضور بے تحاشہ رو کر گڑگڑا کر میں انٹرویو دینے گئی۔ کئی سوال تھے میں نے اکثر کے جواب دیے۔ انٹرویو پینل میں موجود ایک خاتون نے سب سے آخر میں پوچھا۔

''مس حائقہ! کوئی ایک وجہ دیں کہ جس کی بناء پر ہم آپ کو یہ جاب دے دیں۔'' ایک لمبا سانس لینے کے بعد میں بولنا شروع ہوئی۔

''میم! آئی ایم ڈائیورسی (طلاق یافتہ)۔ میری سات بیٹیاں ہیں جن کے ساتھ میں پچھلے سات سالوں سے ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں رہ رہی ہوں۔ آج تک ان کے لیے ایک گھر کا انتظام نہیں کرسکی ہوں میں۔ میم مجھے بلڈ کینسر ہے۔ کب سانسیں ختم ہوجائیں کوئی پتہ نہیں لیکن اس سب سے قطع نظر میں یہ جاب صرف اس لیے حاصل کرنا چاہتی ہوں کہ کسی کو دکھا سکوں کہ معجزے ابھی بھی ہوتے ہیں آخری سانس کے رک

جانے کے بعد بھی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔" اس خاتون نے ہولے سے سر ہلا کے مجھے واپس جانے کو کہا تھا۔ اب بس انتظار کرنا تھا۔ آر یا پار ہونے کا۔

آٹھویں کا رزلٹ آیا تو اس بار صحیح معنوں میں ماریہ نے دھومیں مچا دیں۔ 486 مارکس۔ میرے گلے لگی وہ میرے آنسو پونچھ رہی تھی۔

☆......☆

اس دن میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ سو اکیڈمی سے چھٹی کرلی۔ میں بچیوں کے یونیفارم پریس کر رہی تھی جب مائدہ دروازے میں آکر کھڑی ہوئی۔ اس کے پیچھے ہی حسن کا شرارتی سا چہرہ بھی نمودار ہوا تھا۔

"ایکسکیوزمی۔" مائدہ نے بڑے اسٹائل سے پوچھا۔

"کیا ہے اب؟" میں نے نگاہیں اٹھائے بغیر پوچھا۔

"اسسٹنٹ پروفیسر حائقہ ارشد اسی روم میں رہتیں ہیں کیا؟" مائدہ کی بات پر غور کیے بغیر میں ایک دم مڑی۔

"مائدہ! زیادہ ڈرامے نہ کرو۔ صاف صاف بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟" مائدہ اور حسن کے چہروں پر پھیلتی مسکراہٹ کو دیکھ کر میں یکدم رکی۔ کیا کہا تھا ابھی اس نے۔ بے یقین نظروں سے ان دونوں کو دیکھتی میں سن کھڑی رہ گئی۔ مائدہ نے آگے کو ہو کر ہاتھ میں پکڑی لسٹ میری آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

"یس حائقہ ارشد! یو ہو بین سلیکٹڈ۔" مائدہ مسکرائی تھی۔ میں یونہی کھڑی اسے دیکھتی رہی اور اس کے بعد کچھ یاد نہ رہا۔ ہوش آیا تو میں آئی سی یو میں تھی۔ مجھے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اگلے دن ڈسٹرکٹ سلیکٹ کرنا تھا۔ حسن مجھے بمشکل سہارا دے کر آفس لے کر گیا۔

ایک کو ٹک کر دیں۔" میرے آگے فارم رکھا گیا تھا۔ میں خالی خالی نظروں سے حسن کو دیکھتی رہ گئی۔

"میم! Choose کریں۔" حسن نے میرے ہاتھ میں بال پوائنٹ پکڑایا۔

"اٹک، اوکاڑہ، بہاولپور، بہاولنگر اے بی سی کے لحاظ سے ڈسٹرکٹ لکھے ہوئے تھے۔ میری انگلیاں ایکدم تھم گئیں۔

"حائقہ! آپ کا مقام تو ماشاءاللہ بہت اونچا ہے۔ بہت بلند۔ آرام سے PCS کا ٹیسٹ دے کر یہاں آنا یہ ہی منزل ہے آپ کی۔" میم رخسانہ کی آواز تھی۔

"حائقہ اللہ بہت پیار کرتا ہے آپ سے، آپ کا نصیب یہ ہی ہے جو اس وقت آپ کے پاس ہے، میم حائقہ ارشد۔"

کیا میں کہہ سکتی تھی کہ اللہ مجھ سے پیار نہیں کرتا۔ وہ مجھ سے اتنا پیار کرتا تھا کہ اس نے میرا نصیب تک نہیں بدلا۔ میرا نصیب آج بھی وہی تھا بارہ سال پہلے والا۔ میم حائقہ ارشد۔"

"جلدی سے ایم فل کرو اور واپس یہاں آؤ۔ فزکس لیب میں آپ سے زیادہ کھڑا کوئی اچھا نہیں لگتا۔" میم شمع کی آواز تھی۔

"تمہیں یوں مٹاؤں گا کہ پھر کبھی ابھر نہیں پاؤ گی۔" عمیر کی سانسوں کے نشان آج بھی میری گردن پر زندہ تھے۔ بالکل اس کے الفاظ کی طرح۔

"کیسے کھڑی ہوگی تم دوبارہ میرے سامنے، میں تم میں رتی برابر بھی جان چھوڑوں گا تب ناں۔" عمیر کے دیئے دکھ آج بھی زندہ تھے۔

''آج کیا ہے تمہارے دامن میں۔ ایک ذرہ بھی نہیں جسے تم اپنا کہہ سکو۔'' عمیر کی آوازیں آج بھی میرے ذہن میں زندہ تھیں۔

''بالکل ایسا ہی دیکھنا چاہتا تھا میں تمہیں، بے آسرا، بے سروسامان۔'' عمیر کی باتیں آج بھی تازہ تھیں۔

''میں جانتا ہوں اب تم کیا کرو گی۔ تم مر جاؤ گی۔''

''ہاں مر ہی تو گئی تھی میں اس لمحے۔''

''ضروری نہیں ہے کہ قبرستان میں کھڑے ہو کر صرف موت ہی چنی جائے۔ زندگی بھی چنی جا سکتی ہے۔'' میڈم ثمینہ کی آواز آئی۔

اور میں نے اس رات قبر میں کھڑے ہو کر زندگی چنی تھی۔

80 ہزار پر زندگی اور موت کا جو اکھیلا تھا میں نے اور سات سال بعد جیت گئی تھی۔

''تو تیار ہو قبر میں اترنے کے لیے؟'' عمیر نے اس رات پوچھا تھا۔

''قبر میں اتر کر بھی زندہ رہی تو؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''تو رہ کے دکھاؤ۔'' اس نے کہا تھا۔

اور پھر کون کہتا ہے کہ خدا زمین سے چلا گیا ہے۔ اسی نے پیدا کیا ہے ناں ہمیں تو پھر وہ ہمیں اندھیرے میں چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے۔

آج اس پاک پروردگار کی وجہ سے میں زندہ تھی۔

''دکھا دیا عمیر، زندہ رہ کر دکھا دیا میں نے۔'' ہلکی سی سرگوشی کرتے ہوئے میں نے ٹک کیا تھا۔

☆......☆

ایک ہفتے تک میں نے جوائننگ دینی تھی۔ آٹھ سال سے وہ سیٹ خالی تھی جو میم شمع کے ریٹائر ہو جانے کے بعد اب فل ہوئی تھی۔

''میں دو تین سالوں میں ریٹائر ہو جاؤں گی۔ پھر AP بن کے میری سیٹ پر ہی آ جانا۔'' انہوں نے تو مجھے بہت پہلے آفر کر دی تھی بس مجھے ہی جاتے جاتے دیر ہو گئی۔ پنجاب کالج سے ریزائن کیا، اکیڈمی چھوڑی، اپنا اکاؤنٹ منتقل کروایا۔ بچیوں کے سرٹیفکیٹ بنوائے اور ہاسٹل کو خیرباد کہا۔ اس بار سامان زیادہ تھا۔

''حائقہ مجھے بڑے عرصے بعد تم جیسی دوست ملی تھی۔ کیا کروں گی میں تمہارے بنا۔'' مائدہ وقفوں وقفوں سے رو رہی تھی۔ اس کی بات سن کے بڑی دیر سے چپ کھڑا احسن بھڑک گیا۔ ''اگر میں رہ لیا ناں تو تم بھی رہ لو گی۔ تم سے زیادہ دکھ تو میرا ہے، پہلی دوست ہیں یہ میری اور شاید...... آخری بھی، اچھا نہیں کر رہیں آپ۔'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''میری بات سنو دونوں، اکیلی تو میں ہو رہی ہوں تم دونوں تو ہو ناں ایک دوسرے کے لیے ہمیشہ ساتھ ناں۔'' میں نے مائدہ کے آنسو صاف کیے۔

''اسے کہیں جب تک میری شادی نہیں ہو جاتی یہ اس عجوبے سے شادی نہیں کرے گی۔''

حسن کی بات اسے تپا گئی۔ ''اچھا تمہاری خاطر بوڑھی ہو جاؤں میں بیٹھے بیٹھے۔'' وہ دونوں مجھے بس اسٹاپ چھوڑنے آئے تھے۔ صبح کے سات بجنے والے تھے جب بس نکلی۔ حسن نے سامان سمیت چھوٹی بچیوں کو بھی اوپر چڑھایا۔

قرۃ العین اسکندر

مکمل ناول

زندگی تجھ کو جیا کوئی افسوس نہیں



ثوبیہ جلدی جلدی کچن کے سارے نام نمٹانے کے چکر میں تھی۔ آج کا دن کوئی عام دن نہ تھا۔ آج اس کی شادی کو پورے چھ سال ہو چکے تھے اور ہر سال کی طرح وہ سر شام تیار ہو کر احمد کا انتظار کیا کرتی تھی اور احمد



ہمیشہ کی طرح اس کے لیے بو کے لاتا اور ساتھ ہی کوئی پیارا سا گفٹ۔ پھر وہ کھانا گھر میں ہی اکٹھے کھاتے اور لانگ ڈرائیو کے بعد گھر واپس آ جاتے تھے اور واپسی پر احمد، ثوبیہ کو اس کی من پسند آئس کریم کھلانا نہ بھولتا تھا اور آج بھی ثوبیہ شام سے پہلے کچن میں پر اہتمام کھانا تیار کرنے میں لگی تھی۔ پھر شام کو خوب دل لگا کر تیار بھی تو ہونا تھا۔ جب کوئی دل کا حکمران بن جاتا ہے تو دل چاہتا ہے کہ اب دل اس ایک دل پر بھی حاوی ہو کر حکومت کرے جس نے ہوش وحواس سب سلب کر لیے ہوتے ہیں۔ ثوبیہ احمد کے تصور سے ہی خوش کن انداز میں مسکراتی چلی جا رہی تھی اور دھیما دھیما سا گنگنا بھی رہی تھی۔

احمد کا تصور ہی کتنا پیارا تھا جو اس کو دل و جان سے پیارا تھا۔ اس کا حقیقی رب مہربان تھا جو اسے احمد جیسا مجازی خدا عطا کیا۔

☆......☆

ثوبیہ اور احمد کی لو میرج تھی اور اس لو میرج میں زیادہ دخل احمد کے جذبات کو حاصل تھا۔ ثوبیہ ایک مشرقی لڑکی کی مانند شاید دل کے جذبات دل میں ہی تاعمر رکھتی۔ انمول موتی کی مانند احمد کے تصور کو دل کے نہاں خانوں میں سینت کے رکھتی مگر احمد نے اسے پرپوز کر دیا تھا اور چند ایک ملاقاتوں کے بعد احمد نے شادی کا اہم فیصلہ کر ڈالا تھا۔ وہ محبت ہی کیا جو سر چڑھ کر نہ بولے اور احمد اور ثوبیہ کی محبت میں بھی یہ جادو سر چڑھ کر ہی بولا تھا۔ بظاہر کوئی دیوار بھی حائل نہ تھی احمد کے والدین نے احمد کو کلی طور پر شادی کا اختیار دے رکھا تھا اور جب احمد کے والدین ثوبیہ کا ہاتھ مانگنے گئے تو ثوبیہ کے گھر والوں کو بھی احمد کا رشتہ ہر لحاظ سے ثوبیہ کے لیے بہترین لگا۔

یوں بنا کسی رکاوٹ کے یہ شادی انجام پذیر ہوگئی اور ثوبیہ افتخار، ثوبیہ احمد بن کر احمد کی زندگی میں چھا گئی۔ اپنے خوشنما رنگوں کے ساتھ جس طرح قوس و قزح کے سات رنگ ہوتے ہیں احمد کو لگتا تھا کہ ایک اور رنگ بھی گہرا رنگ تھا جو اس کی زیست کا کل تھا۔ وہ تھا محبت کا رنگ اور پھر ثوبیہ نے تو احمد کی محبت کو دل کی گہرائیوں میں اتار لیا تھا۔ وہ بھی احمد کی بے پناہ محبت کی قائل ہوگئی تھی۔ محبت کے یہ انوکھے رنگ دونوں کو سرشار کر دیا کرتے تھے۔ ہر چھوٹی بڑی بات میں یہ محبت اپنا آپ پوری سچائی کے ساتھ ظاہر کرتی تھی۔ جو احمد کو پسند تھا وہی رنگ ثوبیہ کے بدن پر سجنے لگتا تھا اور جو ثوبیہ کو اچھا لگتا وہ بنا کہے ہی احمد جان لیا کرتا تھا۔ ثوبیہ سے بڑے دو بڑے بھائی تھے وہ دونوں ہی شادی شدہ تھے اور ثوبیہ کے بعد اسماء بیگم اپنے اس آخری فرض سے بھی سبکدوش ہوگئی تھیں۔ بیٹیوں کے فرض جتنی جلدی ادا ہو جائیں اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ شام تک ثوبیہ، احمد کی من پسند ڈشز تیار کر چکی تھی۔ پھر احمد کی پسند کا سرخ رنگ کا شوخ سا سوٹ زیب تن کیا جو احمد کا ہی گفٹ تھا۔ خوب دل سے تیار ہو کر اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔

وہ نہایت حسین دکھائی دے رہی تھی اور احمد کی نگاہوں کی تپش پڑنے کے بعد تو اس نے یوں بھی کندن بن جانا تھا۔ وہ زیرلب مسکرا دی۔ ٹائم زیادہ ہو رہا تھا اور احمد ابھی تک نہیں آئے تھے اس نے بے چینی سے سوچا۔ پھر بے اختیار موبائل فون اٹھا کر احمد کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب مسلسل بیل جانے کے بعد بھی کال موصول نہ کی گئی تو ثوبیہ کو یقین ہوگیا کہ احمد راستے میں ہی کہیں ہوں گے۔ اس لیے فون نہیں اٹینڈ کر رہے تھے۔ وہ سوچنے لگی کہ احمد جب گھر آئیں گے اور اسے یوں سجا سنورا دیکھیں گے تو وہ کس قدر خوش ہوں گے۔

ثوبیہ سے شادی کے بعد احمد کی پوسٹنگ لاہور ہوگئی تھی۔ جاب کے سلسلے میں پوسٹنگ کی بدولت دونوں کو

لاہور شفٹ ہونا پڑا۔ دو سال ثوبیہ اپنے سسرال میں ہی رہی تھی مگر چونکہ احمد یہاں اکیلے تھے اس لیے اسے بھی یہاں آنا پڑا۔ کیوں کہ احمد کا خیال رکھنے والا کوئی نہ تھا یہاں۔ یہاں شفٹنگ کے بعد ثوبیہ، احمد کو پہلے سے زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔ احمد اور ثوبیہ کو دنیا کی ہر خوشی میسر تھی سوائے ایک خوشی کے وہ تھی اولاد کی خوشی۔

بظاہر ایسا کوئی مسئلہ بھی نہ تھا۔ ثوبیہ نے اپنا مکمل چیک اپ کروا کر تسلی کر لی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے یہ کہہ کر تسلی دی تھی کہ یہ صرف رضائے الٰہی سے ہی ممکن ہے بظاہر سب کچھ ٹھیک ہے۔ یہ رب کریم کی عطا ہے۔ جب عطا کرے تو وہ جھولیاں بھر دیتا ہے۔ اس نوازنے والے کی کرم نوازیاں یوں ہی ہوا کرتی ہیں۔

ثوبیہ نے کئی مرتبہ باتوں ہی باتوں میں احمد کو احساس دلایا کہ وہ بھی اپنا مکمل چیک اپ کرالے تاکہ اگر خدانخواستہ کوئی کمی ہے تو اس کا علاج کروا لیا جائے۔ گھر کے سونے پن کو کسی ننھی کلی کے کھل جانے سے ہی پوری ہو سکتی تھی مگر احمد ہر مرتبہ ہی اس بات کو سن کر بھی ان سنی کر دیا کرتا تھا۔ جب ثوبیہ نے بہت اصرار کیا تو احمد اور ثوبیہ کے درمیان شدید قسم کی لڑائی ہوگئی اور دونوں کی یہ شادی کے بعد پہلی لڑائی تھی ثوبیہ کا رو رو کر برا حال تھا اور اس کا قطعاً ثوبیہ کو منانے کا ارادہ نہ تھا۔ پھر یہ بول چال ایک ہفتے کے بعد دوبارہ شروع ہوئی تھی۔

☆......☆

دونوں خاموشی سے اتنے دن تک معمول کے مطابق اپنے فرائض ادا کرتے رہے تھے۔ ثوبیہ، احمد کے کپڑے دھو کر پریس کر کے رکھ دیا کرتی تھی اور ناشتہ خاموشی سے ٹیبل پر لگا دیا کرتی۔ احمد بلا چوں و چراں ناشتا کر لیا کرتا مگر یہ دونوں طرف ہنوز خاموشی کے مہیب بادل چھائے تھے۔ ثوبیہ کو لگتا تھا کہ اس نے کوئی بھی غلطی نہیں کی ہے مامتا بھرا جذبہ ہر جذبے پر غالب آجایا کرتا اور یوں احمد بھی اپنی جگہ درست تھا مگر احمد کی محبت اپنی جگہ مگر مامتا کے جذبے نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ احمد سے اپنی یہ بات منوالے مگر احمد جو ہر بات پر ثوبیہ کو لبیک کہا کرتا تھا اس بات پر شدید مضطرب ہوا تھا اور پھر یہ مسئلہ بڑھ گیا اور کشیدگی کی فضا چھا گئی تھی اور یوں ایک دوسرے سے نظریں چراتے ہوئے معمول کے کام کرتے رہے۔ پھر جب ایک دن حسب معمول ثوبیہ ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ رہی تھی تو احمد نے ثوبیہ کا ہاتھ تھام لیا۔ احمد اور ثوبیہ کی نگاہیں آپس میں ٹکرائیں تو ثوبیہ کے آنسو جو نہ جانے کتنے دنوں سے بوجھ بن کر دل پر پڑے تھے آج ساون بھادوں بن کر برسنے لگے۔

جس انسان کو آپ بہت شدت کے ساتھ چاہتے ہیں اس کی ذرا سی بھی بے رخی اور بے اعتنائی انسان کو حال سے بے حال کر دیا کرتی ہے۔

مگر اب جب احمد نے محبت سے پوچھا تو ثوبیہ کے آنسوؤں پر بند لگانا ممکن نہ رہا تھا۔ ٹپ ٹپ گرنے والے تمام آنسو احمد کو بے طرح پریشان کر رہے تھے۔ آخر ثوبیہ اس کی من چاہی بیوی تھی مگر احمد ایک انجانے خوف میں مبتلا تھا مگر احمد ایک انجانے خوف میں مبتلا تھا اگر احمد میں کوئی کمی ہوئی تو کیا ثوبیہ یوں ہی احمد کو چاہے گی۔ وہی ثوبیہ جو ہر وقت اس پر محبت کے پھول نچھاور کرتی نظر آتی ہے کیا اگر ایسا کچھ ہوا تو پھر کیا ثوبیہ یوں ہی اس سے محبت کرتی رہے گی یا ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی جائے گی۔

دوسری طرف ثوبیہ کو یہ خوف لاحق تھا کہ اگر وہ احمد کو اولاد کی خوشی نہ دے سکی تو کہیں احمد کا دل پلٹ نہ جائے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح سمت میں سوچ رہے تھے مگر دونوں ہی اپنی سوچ بتانے سے گریزاں تھے۔ احمد اتنے دنوں سے ثوبیہ کو اداس اور مضمحل دیکھ رہا تھا۔ اب وہ اپنے دل میں ندامت محسوس کرنے لگا تھا اور ثوبیہ کے تواتر سے بہنے والے آنسو اس بات کے شاہد تھے کہ ثوبیہ کو احمد کے اس فیصلے سے کس قدر رنج ملا ہے۔

''دیکھو ثوبیہ مجھے اولاد کی خواہش ضرور ہے مگر اللہ نے اگر یہ خوشی ہمارے مقدر میں نہیں لکھی تو مجھے اس کی رضا میں راضی ہونا آتا ہے اور جب مجھے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے میں تمہارے ساتھ خوش ہوں تو تم کیوں بضد ہو دیکھو میرے لیے تو تمہاری محبت ہی کافی ہے۔''

احمد کی بات پر ثوبیہ نے شکوہ کناں نگاہوں سے احمد کو دیکھا۔ احمد کو ثوبیہ کی آنکھوں میں رقم شکوے کی تحریر پڑھ کر دکھ ہو رہا تھا مگر وہ اس قدم کو اٹھانے پر تیار نہ تھا جو ثوبیہ کی خواہش بن چکا تھا۔ اچانک ثوبیہ اپنے خیالات سے چونک گئی دروازے پر آہٹ ہوئی تھی۔ احمد کے پاس بھی مین گیٹ کی ڈپلی کیٹ چابی ہمیشہ رہتی تھی۔ ٹائم خاصا ہو چکا تھا۔ احمد کا سوچ کر وہ جلدی سے اٹھ کر گیٹ تک آ گئی۔ سامنے احمد ہی تھے مگر ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ کوئی نوجوان سی لڑکی تھی۔ ثوبیہ نے ذہن پر بہت زور دیا مگر وہ ثوبیہ کے لیے بالکل انجان ہی تھی۔

اسے دیکھ کر ثوبیہ عجیب سی الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔

''ثوبیہ یہ شبانہ ہے۔ اب یہ یہیں رہے گی۔ کچھ عرصہ کے لیے۔'' احمد کی بات سن کر ثوبیہ حیرت سے شبانہ کو دیکھنے لگی مگر شبانہ خود اس کا طائرانہ جائزہ لینے میں مصروف عمل تھی اور وہ ثوبیہ کی اس تیاری کو خاص نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جانچتی تولتی نظروں سے۔

بعض نظریں بے حد گراں گزرتی ہیں۔ اندر تک جھانکنے کی سعی کرتی ہوئی نظریں ایکسرے مشین کی مانند شبانہ بھی یونہی اس کو بغور دیکھ رہی تھی۔

ثوبیہ نے سلام کیا تو وہ مسکرا دی۔ پھر ثوبیہ نے اسے بیڈ روم سے ملحقہ کمرے میں بٹھایا۔ ''آپ یہاں سو سکتی ہیں اس کمرے کو استعمال کر سکتی ہیں۔'' ثوبیہ نے سادگی سے بتایا۔

''ہونہہ اچھا ہے کمرہ۔'' شبانہ نے کمرے کا بغور جائزہ لیا۔

''آپ یونہی سجی سنوری رہتی ہیں یا آج کوئی خاص بات ہے۔''

شبانہ نے بہت ہی عجیب سے لہجے میں باز پرس کے انداز میں کہا۔

''نہیں! آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔'' ثوبیہ نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

''اچھا پھر تو بہت مبارک ہو مگر احمد نے تو کوئی ذکر نہیں کیا مجھ سے۔''

شبانہ نے لہجے میں حیرت سموتے ہوئے کہا۔ اب ثوبیہ اس بات کا کیا جواب دیتی بس خاموش رہ گئی۔

''کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجیے گا۔'' ثوبیہ نے رسماً کہا۔

''ہاں تمہیں ہی بتاؤں گی اور کس کو بتانا ہے بھلا۔'' شبانہ ہنسی۔

ثوبیہ کو بے حد عجیب لگا پہلی ہی ملاقات میں وہ ثوبیہ کو ''تم'' سے مخاطب کرنے لگی تھی یا تو وہ بہت ہی فرینڈلی طبیعت کی تھی یا پھر ہر جگہ جلد گھل مل کر رشتے بنا لینے والوں میں سے تھی۔ ثوبیہ کمرے میں واپس آئی تو احمد ابھی جاگ ہی رہے تھے اور کسی گہری سوچ میں مدغم نظر آ رہے تھے۔

''کیا بات ہے کیا سوچ رہے ہیں؟'' ثوبیہ نے پوچھا تو وہ گہری سوچ سے چونک سے گئے۔

''یہی شبانہ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ شبانہ میری دور کی کزن ہیں۔ میرے آفس میں ہی کام کرتی ہیں کچھ عرصہ سے از حد پریشان تھیں۔ اس کا میاں ان پر بے پناہ مظالم ڈھائے ہوئے تھا۔ پھر کل تو حد ہی ہو گئی اس نے غصے میں آ کر آپے سے باہر ہو کر شبانہ کو طلاق دے دی۔ بطور کزن یہ میرا فرض تھا کہ اسے آسرا دوں تم جانتی ہو ان کے صرف والد ہیں جو بیرون ملک مقیم ہیں۔ والدہ کا تو بہت عرصہ قبل ہی انتقال ہو گیا تھا۔ صبح امی کو

فون پر ساری معلومات دوں گا۔ اس وقت تو خاصی رات ہو چلی ہے۔ وہ اس وقت بلا وجہ پریشان ہو کر نیند بھی خراب کرلیں گی۔ کچھ دنوں کی بات ہے پھر میں انہیں امی ابو کے پاس خود چھوڑ آؤں گا۔" احمد نے تفصیل سے ساری بات بتائی تو بیہ خاموشی سے ان کی ساری بات سن رہی تھی۔ اچانک احمد کی توجہ اس کے سجے سنورے روپ کی جانب گئی تو اچانک چونک سا گیا۔ "یہ تم نے اتنا میک اپ کیوں کر رکھا ہے آج؟ اچھا نہیں لگ رہا وہ تو اتنی پریشان ہے تمہیں سجا سنورا دیکھے گی تو اسے اپنا گھر کھونے کا احساس اور بھی شدت سے ہوگا۔ تم احتیاط کرنا جتنا عرصہ وہ یہاں مقیم ہے اس کو کسی قسم کی کوئی شکایت نہ ہو اور نہ ہی تم اس کے سامنے یوں تیار ہونا تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات؟"

احمد نے سوالیہ انداز میں پوچھا تو ثوبیہ پژمردہ انداز میں مسکرا دی۔

"جی آئندہ احتیاط کروں گی۔" ثوبیہ نے دھیمے لہجے میں کہا اور بے دلی سے چوڑیاں اتارنے لگی۔ تبھی احمد کی نظر سائیڈ ٹیبل پر رکھے ثوبیہ کے کارڈ پر پڑی۔ جہاں سالگرہ وش کرنے کے علاوہ ایک گفٹ بھی رکھا تھا اور ساتھ ہی شعر رقم تھا۔

میری دعا ہے اس کو راحت نصیب ہو
وہ جس کو چاہے وہ چاہت نصیب ہو
کبھی رائیگاں نہ کٹے زیست کا سفر
دست سوال ہو جب تو چاہت نصیب ہو

احمد نے یہ سب دیکھا تو اچانک تاسف نے اس کو گھیر لیا۔

"ثوبی آئی ایم سوری، پریشانی میں میرے ذہن سے نکل ہی گیا تھا کہ آج کا دن کس قدر اہم ہے مگر تم پلیز ناراض مت ہونا۔ یہ دن تو انشاء اللہ ہماری زندگی میں اب آتا ہی رہے گا۔ دوسروں کا احساس کرنا بھی تو واجب ہے۔ کچھ حقوق تو دوسروں کے بھی ہیں ناں ہم پر۔" نامعلوم احمد کیا سمجھانا اور بتانا چاہ رہا تھا۔ ثوبیہ سوچ کر رہ گئی۔

رات کے اس پچھلے پہر نہ تو شبانہ ان کو دیکھ ہی رہی تھی تو کیا دو بول شادی سالگرہ مبارک کہنے مین کوئی مضائقہ تھا۔ ثوبیہ سوچ تو رہی تھی مگر جھگڑے کے خوف سے ایک لفظ بھی اس نے منہ سے نہ نکالا تھا۔ یوں بھی وہ فطرتاً ملنسار اور مروت سے بنی ایک لڑکی تھی۔

☆......☆

صبح سویرے ثوبیہ نہ جاگ سکی اور نہ ہی حسب معمول احمد کو آفس ناشتا دے کر ہی بھیج سکی۔ رات کو وہ خاصی دیر تک مضمحل سی روتی رہی تھی اور پھر اسی لیے صبح اس کی معمول کے مطابق آنکھ نہ کھل سکی۔ کچن میں کھٹ پٹ کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تھی پہلے تو کچھ سمجھ ہی نہ آیا کہ اس کے کچن میں کون ہو سکتا ہے۔ پھر اسے رات کے تمام واقعات یاد آ گئے۔ وہ کپڑوں کی سلوٹیں درست کرتی ہوئی واش روم میں گھس گئی۔ فریش ہو کر باہر آئی تو شبانہ لاؤنج میں ٹی وی دیکھتی ہوئی نظر آئی۔

"اٹھ گئیں تم یار کتنا سوتی ہو تم۔" شبانہ نے ہنس کر کہا۔ تو وہ شرمندہ سی ہو گئی بجائے مہمان کی مہمان نوازی کرنے کے وہ اتنی لیٹ جاگی تھی۔

"میں ابھی آپ کے لیے ناشتہ بنا دیتی ہوں۔" ثوبیہ نے جلدی سے کہا۔

''نہیں رہنے دو۔ میں نے تو احمد کے ساتھ ہی ناشتہ کرلیا تھا۔'' شبانہ نے مسکرا کر کہا۔
''احمد نے ناشتہ کرلیا۔'' ثوبیہ نے حیرت سے پوچھا۔
''ہاں ناں، میں نے اس کے لیے تیار کیا تو سوچا میں بھی ساتھ ناشتہ کرلوں۔ ویسے بھی مجھے اکیلے ناشتہ کرنا پسند نہیں ہے اور پھر وہ بے چارہ صبح ہی صبح بھوکا نکلتا مجھے تو بہت ترس آرہا تھا اس پر۔'' شبانہ کے بے لاگ تبصرے سن کر ثوبیہ کو ایکدم ہی غصے نے گھیر لیا تھا۔
''آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ رات میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے صبح آنکھ نہ کھل سکی۔ ورنہ میں کبھی بھی احمد کو بنا ناشتہ کیے آفس نہیں جانے دیتی ہوں۔'' ثوبیہ نے وضاحت پیش کی جسے شبانہ نے سنی ان سنی کردیا۔
''خیر اب تم اپنے لیے بنالو ناشتہ۔ میں بنا تو دیتی مگر پھر ٹھنڈا ناشتہ کرنے میں کیا لطف ملتا بھلا۔''
شبانہ نے اسے اس کی کم مائیگی کا احساس دلایا تھا جیسے۔ ''جی میرا اپنا گھر ہے میرا جب دل کرے گا بنا کر کرلوں گی۔'' ثوبیہ کو شبانہ کے انداز نے سلگا دیا تھا۔ ورنہ وہ کبھی یوں منہ زوری سے جواب دینے کی عادی نہ تھی۔ وہ خاموشی سے کچن میں آئی اور برتن اٹھا کر پٹخ دیا۔ غصہ کم ہی نہ ہورہا تھا۔ پھر اپنے آپ کو معمول پر لائی۔ سب سے پہلے چائے کا پانی چڑھایا۔ پھر دوپہر کے کھانے کے لیے سوچنے لگی۔ قیمہ فریج میں رکھا تھا۔ ابھی تو کل کا کھانا بھی تھا۔ وہ سب ضائع تو کرنا نہ تھا۔ یوں بھی ثوبیہ بہت کفایت شعار تھی۔ کھانا جب تک مکمل طور پر ختم نہ ہو جاتا نیا کھانا تیار نہ کرتی تھی۔ اس نے سوچا کہ کل کی بریانی اور کڑائی سے دوپہر کا گزارا ہو جائے گا۔
شام کو قیمہ بنالوں گی۔ دل میں طے کرتی ہوئی وہ کچھ مطمئن سی ہوگئی۔ کیونکہ اس کا سر درد سے بوجھل ہورہا تھا اور فی الوقت وہ محض آرام کی متمنی تھی۔ اس نے دو سلائس کے ساتھ چائے کا کپ ختم کیا۔ سنک میں کپ دھویا اور باہر آگئی۔ شبانہ ٹی وی پر کوئی رومانٹک پکچر دیکھنے میں محو تھی۔
''لگتا ہی نہیں کہ دو دن پہلے اس کو طلاق ہوئی ہے۔'' ثوبیہ نے سوچا اور دل ہی دل میں اللہ سے توبہ استغفار کرنے لگی۔ شبانہ نے کن انکھیوں سے ثوبیہ کو دیکھا مگر شاید وہ بھی مائنڈ کرگئی تھی تبھی شبانہ نے ثوبیہ کو مخاطب ہی نہ کیا۔ ثوبیہ تھوڑی دیر صوفے پر بیٹھی رہی مگر شبانہ محض ٹی وی دیکھتی رہی اور ثوبیہ کو نظر انداز کردیا۔ ثوبیہ اٹھ کر کمرے میں آگئی۔ الماری کھول کر کپڑوں کی سیٹنگ کرنے لگی۔ خاصا ٹائم اسی میں لگ گیا۔ پھر باہر آکر ڈسٹنگ کرنے لگی۔ دوپہر کا ٹائم ہوا تو وہ کچن میں آگئی اور کھانا گرم کرکے لے آئی۔ شبانہ کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔
اس نے کھانا سرو کیا ٹیبل پر اور شبانہ کو کہا کہ وہ بھی آکر کھانا کھالے۔
مگر شبانہ کسلمندی سے اٹھی اور کھانا دیکھ کر بے زاری سے بولی۔
''اوہ باسی کھانا۔ تم نے تو کچھ تیار ہی نہیں کیا ہے میرے لیے۔ میں تو باسی کھانا کھانے کی عادی نہیں ہوں۔'' شبانہ نے نخوت سے منہ بنایا۔
''جی۔'' ثوبیہ حیرت زدہ منہ کھولے دیکھتی رہ گئی۔
''میں نے یہ سب کھانا رات کو ہی بنایا ہے۔ آپ کھا کر تو دیکھیں پلیز۔'' ثوبیہ نے لجاجت سے کہا۔ اب اس ٹائم دوپہر کے وقت وہ کھانے سے انکاری ہورہی تھی اور پھر صبح وہ ناشتہ بھی اس کو نہ کرواسکی تھی مگر شبانہ کی

سوئی تو انگی ہی رہی۔ احسان جتاتے ہوئے پلیٹ میں بریانی ڈالی اور کھانا کھانے لگی۔ بریانی بہت عمدہ بنی ہوئی تھی۔ اس نے دوبارہ پلیٹ میں ڈال لی۔ ثوبیہ نے صد شکر کیا اور وہ کھانے سے جوں ہی فارغ ہوئی تو ثوبیہ کچن میں اس کے لیے چائے بنانے لگی۔ ساتھ ہی قیمہ بھی بھون ڈالا۔ کیونکہ وہ شام تک فارغ ہو جاتی تھی کاموں سے۔ پھر وہ احمد کے سامنے کوئی ایسا سین نہیں چاہتی تھی جس کو دیکھ کر احمد کے دل میں یہ گمان پیدا ہو کہ وہ اس کی مہمان کا خیال ہی نہ رکھ سکی۔ چائے کے دو کپ ٹرے میں اٹھائے وہ لاؤنج میں ہی آ گئی۔

''کیا بور نہیں ہوتی تم سارا دن۔'' شبانہ نے پوچھا تو ثوبیہ مسکرا دی۔

☆......☆

''یہ میرا آشیانہ ہے یہاں بوریت کیسی۔'' ثوبیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

''نہیں میرا مطلب ہے کام ہی کتنے ہوتے ہیں دو بندوں کے پھر تمہاری سونی گود ہے۔ وہ بھی بکھیڑا نہیں۔'' شبانہ جب بھی بولتی تھی بے لاگ بنا سوچے کہ دوسرے انسان کے دل پر کتنے نشتر لگ رہے ہیں۔

''نہیں یہ تو اللہ کا کرم ہے۔ جب بھی اس کی نوازش ہو جائے اور پھر احمد کو بھی اتنی جلدی نہیں ہے۔'' ثوبیہ نے بھی احمد کے حوالے سے جتا دیا تھا۔ ثوبیہ کو شبانہ پہلی ہی ملاقات میں اچھی نہ لگی تھی مگر شبانہ کا رویہ بھی بے حد عجیب تھا۔ وہ ہر بات میں ''میں'' کی قائل تھی۔ حالانکہ وہ یہاں مہمان کے طور پر قیام پذیر تھی مگر وہ پھر بھی ہر بات میں اپنی بات کو منوانا چاہ رہی تھی۔ ہر بات میں اپنی خاص اہمیت حاصل کرنے کی خواہاں نظر آتی تھی۔

اور ثوبیہ کو اپنے آشیانے میں کسی دوسرے کی دخل اندازی ایک آنکھ نہ بھا رہی تھی مگر وہ پھر بھی تحمل سے شبانہ کی ہر بات برداشت کر رہی تھی۔ شام کو احمد گھر آئے تو نا معلوم کیوں ان کا اتنا موڈ آف تھا جب ثوبیہ نے والہانہ انداز میں سلام کیا تو بنا جواب دیے وہ سیدھا کمرے میں آ گئے اور آ کر اپنا بیگ سائیڈ پر پھینک دیا ثوبیہ نے احمد کو ہمیشہ محبت نچھاور کرنے والا پایا تھا احمد کا یہ انوکھا اور پرایا پرایا سا انداز ثوبیہ کا دل دہلا رہا تھا۔ اتنا غصہ تو احمد نے تب بھی نہیں کیا تھا جب ثوبیہ نے اسے اپنا مکمل چیک اپ کروانے کا کہا تھا۔

''دیکھو ثوبیہ! اگر تمہیں شبانہ کو یہاں نہیں رکھنا تھا تو صاف صاف منع کر دیتیں میں اسے اسی وقت امی ابو کے پاس چھوڑ آتا مگر یہ کیسا انداز ہے تمہارا۔ میں تو تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ پہلے تو تم نواب زادی بن کر ڈھٹائی سے سوتی رہیں اور وہ مہمان ہو کر خود ناشتہ بنا کر مجھے بھی دیتی رہی اور میں بے حد شرمندہ سارہ گیا کیا سوچتی ہوگی وہ اور پھر یہی کیا کم تھا کہ تم آج میری مہمان کی خاطر ایک ڈھنگ کا کھانا تک تیار نہ کر سکیں، وہی باسی کھانا تمہیں اس کے سامنے رکھتے ہوئے اپنی نہیں تو کم از کم میری ہی عزت کا خیال کر لینا تھا۔ وہ بے چاری اتنی آزردہ ہے اور تم نے اسے کہا کہ یہ تمہارا اپنا گھر ہے، جب دل چاہے گا اٹھو گی اور جب دل چاہے گا ناشتہ بناؤ گی اور یہ کہ وہ کون ہوتی ہے تمہیں سمجھانے والی۔'' احمد کا غصہ بے حد شدید تھا۔ ثوبیہ حیرت سے احمد کا منہ تکے جا رہی تھی۔ یہاں تو الزامات کی ایک لمبی فہرست تیار تھی۔ وہ کس کس بات پر اپنی صفائی پیش کرتی۔ وہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ یہ سب کیا ہے؟ احمد تو آفس میں تھے۔ انہیں یہاں کی پل پل کی خبر کس نے دی؟

''اوہ تو آپ کی کزن صاحبہ نے میرے خلاف آپ کا دل زہر آلود کر دیا ہے۔'' ثوبیہ کو یک لخت ہی حالات کی سنگینی کا احساس ہوا تو آپے سے باہر ہو گئی۔

''میں تو صبح سے اس کے آگے پیچھے گھوم رہی ہوں اور وہ آپ کو میرے ہی خلاف ورغلا رہی ہے۔'' ثوبیہ نے تاسف سے کہا۔

''آہستہ بولو، بند کرو اپنی یہ بکواس۔ اس معصوم نے کیا ورغلایا ہے۔ سارا دن وہ روتی رہی اور تم دو بول تسلی و تشفی کے بھی نہ بول پائیں۔ میری خاطر جھوٹے منہ ہی اس کو تم نے دلاسہ دے دینا تھا۔ نامعلوم تمہیں کیا ہو گیا ہے تم ایسی تو نہ تھیں ثوبیہ۔''

ثوبیہ کے دل پر احمد کے ان الفاظ سے گھونسا سا لگا۔ ثوبیہ جانتی تھی کہ احمد غصے کی حالت میں ہی ثوبیہ کہتے تھے، ورنہ ہر وقت لاڈ میں ثوبی ثوبی کی گردان لگائے رکھتے تھے۔

ثوبیہ کو کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا تو زار و قطار رونے لگی۔ کل کا دن ضائع جانے کا غم اور احمد کا یہ بیگانہ رویہ اور پھر شبانہ کا انداز حاکمانہ۔ وہ سب گڈمڈ ہو رہا تھا۔ وہ پسپائی اختیار کر چکی تھی اس وقت احمد اس قدر اشتعال میں تھا کہ وہ جو بھی جواز پیش کرتی، احمد کو وہ قابل قبول نہ ہوتا اور اس میں ہی بہتری تھی کہ وہ وقتی طور پر مصلحتاً خاموش ہو جائے۔ وہ بالکل چپ چاپ ہو گئی تھی۔ گم صم سی احمد واش روم میں گیا۔ شاور لے کر واپس آیا تو ثوبیہ ہنوز اسی جگہ گریہ وزاری کرتی ہوئی مغموم بیٹھی تھی۔ یہ وہی ثوبیہ تھی کہ جس کا ایک آنسو بھی احمد برداشت نہ کر سکتا تھا مگر جب دل میں غلط فہمی آجاتی ہے تو پھر ہر شے ہی پرائی ہو جاتی ہے۔

''اب تم کب تک ماتم کناں رہو گی۔ اٹھو باہر آؤ، کھانا کھاؤ بہت بھوک لگی ہے۔'' ثوبیہ مضمحل وجود لیے باہر کی جانب چل دی۔ شبانہ اس وقت تسبیح اٹھائے ذکر کر رہی تھی۔ ثوبیہ ایک پل کے لیے ٹھٹھک کر رک گئی۔ کیا یہ محض دکھاوا تھا؟'' ثوبیہ نے دل میں سوچا اور حیرت زدہ سی کچن کی جانب چل دی۔ سارا دن ٹی وی پر موویز دیکھنے والی میگزین کی ورق گردانی کرنے والی اس وقت بالکل مختلف ہی تاثر دے رہی تھی۔ یوں جیسے کہ وہ بہت دکھی اور مظلوم ہے۔

احمد، شبانہ کے ساتھ جا کر بیٹھ گئے۔

''آپ دکھی مت ہوا کریں۔ آپ کو غمزدہ دیکھ کر میرا دل بھی دکھتا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا انشاءاللہ۔'' احمد نے اسے تسلی دی اور وہ فرضی آنسو صاف کرنے لگی۔ ثوبیہ کا دل بے انتہا جل رہا تھا۔ شبانہ کی اس طرح کی دوطرفہ پالیسی پر مگر وہ بے بس تھی اور ابھی اس نے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے دی تھی کہ شبانہ چند دن کی مہمان ہے اس نے چلے ہی جانا ہے۔

کھانا بے حد خاموشی سے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد ثوبیہ برتن اٹھا کر کچن میں لے آئی۔ سنک میں رکھے اور دھونے لگی۔ ساتھ ہی چائے بنانے لگی احمد کی روٹین تھی کہ وہ رات کو چائے کا کپ ضرور پیتے تھے۔ یوں یہ عادت برسوں سے چلی آ رہی تھی شروع میں ثوبیہ کو عجیب لگتا تھا مگر اب تو وہ بھی احمد کے ساتھ جب تک چائے نہ پیتی اور دن بھر کی ساری باتیں شیئر نہ کر لیتی تھی تو اس کو چین ہی نہ آتا تھا اور احمد بھی ثوبیہ سے ہر بات ڈسکس کرتا تھا۔ ثوبیہ ایک لمحے کے لیے ٹھہر سی گئی۔

''مگر احمد نے تو کبھی شبانہ کا مجھ سے ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ ان کی کزن ہے اور وہ ان کے آفس میں کام کرتی ہے۔''

یہ خیال بجلی کی سرعت کی مانند اس کے ذہن و قلب میں کوندا تھا۔ دل اچانک مزید مغموم ہو گیا تھا۔

''انہوں نے مجھ سے شبانہ کے حوالے سے آج تک کوئی بات کیوں شیئر نہیں کی۔'' دل عجیب وسوسے کا شکار ہو چلا تھا۔ اس نے دل میں اترتے غمگین رنگوں کو تھپک تھپک کر سلانا چاہا مگر وہ ضدی دل بضد تھا کہ کچھ نہ کچھ غلط ہو رہا ہے کچھ انہونا۔

☆......☆

صبح وہ بہت جلدی جاگ گئی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ زور و شور سے جاری تھی۔ پرندے اپنی اپنی میٹھی بولی میں حمد و ثناء کر رہے تھے۔ اپنے رب کریم کا ذکر کرنا تو پرندے بھی نہیں بھولتے مگر ہم انسان ہو کر اپنے رب ذوالجلال کا ذکر کرنا بھول جاتے ہیں۔ جب کہ ہمیں اسی ذات کریمی نے انسانیت کے رتبے پر فائز کیا ہے ثوبیہ نے نماز فجر ادا کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے گریہ وزاری اور رقت آمیز انداز میں اپنا مسئلہ بارگاہ خداوندی میں پیش کیا۔ آج ثوبیہ نے نہایت پرسوزی سے رب العزت سے دعا مانگی۔ دعا مانگنے کے بعد اس کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ یوں جیسے ساری فکروں کا ذمہ اس ذات کریمی نے اٹھا لیا ہو۔ پھر جس کے ساتھ رب تعالیٰ ہو اس کو کون سی فکر۔

میرا دعویٰ خدا خالی ہاتھ لوٹاتا نہیں
تو دعاؤں میں گریہ وزاری لا تو سہی

ثوبیہ نے عبادت سے فراغت کے بعد کچن کا رخ کیا۔ آج اس نے آلو کے پراٹھے بنانے کا فیصلہ کیا اور پھر اس پر عمل بھی کر ڈالا۔ احمد کو ثوبیہ کے ہاتھ کے آلو کے پراٹھے بے حد پسند تھے۔ وہ احمد کو اپنے ردعمل سے اپنے ہر فعل سے یہ باور کروانا چاہتی تھی کہ وہ احمد سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ اس نے سوچا تھا جب تک احمد اس کو نہیں منائے گا وہ ہرگز نہیں مانے گی مگر احمد کو قطعاً اب دوبارہ شکایت کا کوئی موقع نہیں دے گی اور جتنا ہو سکے گا شبانہ سے کم سے کم بات کرے گی۔ نامعلوم وہ باتوں کو غلط رنگ دینے کی عادی تھی یا وہ صرف ثوبیہ کے حوالے سے ہی ایسا کر رہی تھی۔

''ارے واہ! آج تو جاگی ہوئی ہو اور خوشبوئیں بھی بڑی زبردست قسم کی آ رہی ہیں۔ کیا بنا رہی ہو؟'' شبانہ نے خوش دلی سے پوچھا تو ثوبیہ فقط مسکرا کر رہ گئی۔

''پراٹھے بنا رہی ہوں۔'' ثوبیہ کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ اسے ہمیشہ سے ہی دوغلے لوگوں سے دو چہرہ فطرت لوگوں سے ایک خاص قسم کی نفرت رہی تھی مگر وہ بہت با مروت بھی تھی اور اس لیے اس نے اب ظرف کا مظاہرہ ہی کرنا تھا۔

احمد بھی اٹھ چکا تھا۔ تیار ہو کر باہر ہی آ گیا۔ ثوبیہ کی خاموشی اور احمد کا ثوبیہ کو مسلسل نظر انداز کرنا شبانہ سے مخفی نہ رہا تھا۔ شبانہ مسلسل مسکراتی نگاہوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی اور اس کی نگاہوں میں جو فاتحانہ چمک تھی وہ بھی ثوبیہ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی۔ شبانہ کا انداز سراسر تضحیک آمیز تھا۔ خاص کر جب اس نے احمد کی پلیٹ میں مزید پراٹھا ڈالنا چاہا تو احمد نے نہایت بے رخی سے کہا۔

''رہنے دو اب یہ سب۔'' احمد کی بات پر ثوبیہ کا ہاتھ جہاں تھا وہاں ہی رک سا گیا تھا اور شبانہ مسکرا کر ثوبیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھی۔

''میں سوچ رہی ہوں اب دوبارہ سے آفس جوائن کر لوں کب تک یونہی چھٹی لے کر پڑی بیٹھی رہوں گی۔ جاب کا معاملہ ہے آخر۔'' شبانہ نے کہا۔

''آپ کیوں جاب کریں گی ہرگز نہیں۔ یہ سب یہ گھر یہاں کی ہر چیز آپ کی اپنی ہے۔ آپ بالکل ریلیکس رہیں۔ اب آپ کو بالکل بھی کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی اور پھر امی ابو کا گھر بھی حاضر ہے۔ آپ اب یہ مشقت بھری زندگی ترک کر دیں۔'' احمد نے کہا۔

''اوہ..... تو اب میں بوجھ بن گئی ہوں جو مجھے آنٹی کے پاس بھیجنے کی باتیں کر رہے ہو۔ ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو میں خود ہی اپنا بندوبست کر لیتی ہوں۔''

شبانہ نے رونے کی اداکاری کرتے ہوئے آنکھوں میں آئے فرضی آنسو پونچھتے ہوئے کہا تو ثوبیہ شبانہ کے انداز پر حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔

''ارے نہیں میرا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا میں تو خود چاہتا ہوں آپ ہمیشہ میرے ساتھ میرا مطلب ہے ہمارے ساتھ یہاں رہیں۔ مجھے تو کوئی پریشانی بھی نہیں۔ اللہ کا دیا بہت ہے اور پھر میں تو آپ کے لیے اس قدر غمگین ہوں۔''

احمد نے جلدی سے صفائی پیش کی تو ثوبیہ احمد کے اس انداز پر بھونچکارہ گئی۔ پھر احمد تو آفس چلا گیا مگر ثوبیہ کو نئی فکروں میں مبتلا کر گیا۔ آخر شبانہ میں ایسی کون سی خاص بات ہے کہ وہ اس کے پیچھے اپنے گھر کو برباد کرنے لگ گیا ہے۔

ثوبیہ نے دل میں بے حد فکرمندی سے سوچا۔

''کیا اب شبانہ تا عمر یونہی ان کی زندگی میں ایک تیسرا فرد بن کر رہے گی۔ کیا احمد کو اس بات کا احساس نہیں ہے کہ وہ میرے جذبات کو روند کر کسی اور کے احساسات کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔''

وہ کمرے میں آ کر بستر پر ڈھے کر رونے لگی۔

رو رو کر ثوبیہ نے اپنی آنکھیں سوجالی تھیں۔ تبھی بنا دستک کیے شبانہ اس کے کمرے میں آ گئی۔ وہ جو ابھی اپنی ذات کی کرچیاں سمیٹنے میں ہی جتی تھی، اب اس نئی افتاد پر حیران پریشان شبانہ کو دیکھ رہی تھی۔ اسے شبانہ کا یوں بلا اجازت کمرے میں گھسے چلے آنا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ کچھ لوگ بنا اجازت ہی زندگی میں گھسے چلے آتے ہیں جیسے کہ شبانہ بلا اجازت گھس آئی تھی۔

''کس بات پر رو رہی ہو تم ثوبیہ! کس قدر ناشکری ہو تم احمد، تمہارا اتنا احساس کرتا ہے اور تم ہر وقت منہ بسورے پھرتی نظر آتی ہو۔ کیا بات ہے تم اس طرح سے کیوں روڈ بولتی ہے مجھ سے بھی احمد سے بھی۔ کیا تمہیں میرا یہاں رہنا ناگوار خاطر لگ رہا ہے اگر ایسا ہی ہے تو میں نے تو آج کہا ہے میں چلی ہی جاؤں گی تم میری ٹینشن مت لو۔''

ثوبیہ شبانہ کی بات پر بالکل خاموش تھی۔ بولتی بھی تو کیا بولتی۔ اب اس کے آنسوؤں نے ہی تمام داستان نشر کر دی تھی۔ صحیح تو یہ تھا کہ ثوبیہ کو شبانہ سے کوئی ذاتی پرخاش نہ تھی مگر شبانہ کا انداز گفتگو اور پھر ہر بات میں دخل اندازی خاص کر احمد کو ثوبیہ کے خلاف بدگمان کر دینا یہ سب ثوبیہ کو بالکل بھی گوارا نہ تھا۔ ہر کسی کی بات وہ سہہ جاتی تھی مگر احمد کی ذرا سی بے رخی تھوڑی سی بے اعتنائی اس کی جان کا عذاب بن جایا کرتی تھی۔ اس وقت اس کا شبانہ سے بالکل بھی بات کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ شدت سے تنہائی کی متمنی تھی مگر اسے تھوڑی سی تنہائی بھی میسر نہ تھی اپنے ہی گھر میں وہ پرائی ہو کر رہ گئی تھی۔

''چلو باہر آؤ مل کر دوبارہ چائے پیتے ہیں پھر میں نے تم سے ڈھیروں باتیں بھی تو کرتی ہیں۔'' شبانہ نے اس طرح مسکرا کر کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ پھر ثوبیہ بھی اس کے پیچھے خاموشی سے چل دی۔ وہ ہرگز بھی اس طرح موقع فراہم نہیں کرنا چاہتی تھی کہ احمد مزید اشتعال میں آئے۔

☆......☆

آنے والے دن اس کی زندگی کے کٹھن ترین دن تھے۔ احمد کے لبوں پر صرف شبانہ کا نام ہی رہتا تھا۔ جب احمد کے آنے کا ٹائم ہوتا تو شبانہ یوں اہتمام سے تیار ہوتی جیسے احمد کے ساتھ اس کا دل کا بھی کوئی رشتہ استوار ہو اور ثوبیہ پژمردہ ہی رہا کرتی تھی۔ پھر احمد کے آنے کی دستک پر ثوبیہ سے پہلے شبانہ بڑھ کر دروازہ کھول دیتی۔ کھانا تو ثوبیہ دل لگا کر محنت سے بناتی مگر خراج شبانہ وصول کرتی تھی۔ ثوبیہ نے اپنے لبوں پر چپ کی مہر لگالی تھی۔ جب زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ ہی لٹ رہا ہو اور پھر زندگی کا قیمتی انمول خزانہ ہی لٹتے ہوئے نظر آئے تو پھر کیا امید رہ جاتی ہے باقی اور ثوبیہ بھی اپنے مال و متاع و جان سے بڑھ کر عزیز ترین ہستی اس کے وفادار شوہر کی وفا کو کھوتی چلی جارہی تھی۔

محبت جواز نہیں ڈھونڈتی وہ ہر جواز سے بیگانی ہو کر اپنی راہ متعین کرتی ہے۔ محبت صرف اپنی نگاہوں سے ہی اپنی پسندیدہ ترین ہستی کو دیکھتی ہے۔ خواہ اس میں سو عیب ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ تمام عیب خوبی بن جایا کرتے ہیں۔ ثوبیہ نے احمد کا بے لوث پیار بھی دیکھا تھا اور اب اس کی حد سے بڑھی بیگانگی کے مظاہرے بھی دیکھ رہی تھی۔ وہ تو آج بھی اسی مقام پر کھڑی تھی مگر احمد نے شاید اپنے راستے بدل لیے تھے۔ نامعلوم کیوں ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ ثوبیہ پس منظر میں جاتی جارہی تھی اور شبانہ ہر شے پر چھاتی جارہی تھی یا شاید شبانہ کو خود کو منوانا اپنی ذات کا اقرار کروانا بھی آتا تھا اور ثوبیہ احمد کی عزیز ترین بیوی ہو کر بھی آج اپنے گھر اور اپنے شوہر سے ہی دستبردار ہو چکی تھی مگر شبانہ کے لیے شاید اتنا کافی نہ تھا۔ وہ مزید کی ہوس و طلب گار تھی۔ وہ مزید کیا تھا؟ کیا احمد؟ یہ سوچ ثوبیہ کو لرزا دیتی تھی۔

احمد کی شراکت داری اسے کسی طور منظور نہ تھی۔ وہ اس خوف کے سائے تلے اپنی زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ درحقیقت وہ ایک کٹھ پتلی کی مانند ہو چکی تھی۔ احمد کا ہر حکم بلاچوں چرا تسلیم کرلیتی تھی۔ وہ جو کہتا جیسا کہتا مان لیتی تھی۔ مانتی تو وہ روز اول سے احمد کا کہا ہی تھی مگر آج بات کچھ اور تھی۔ آج احمد اسے اس کی ذات کی خوشی کی تکمیل کے لیے کسی بات پر زور نہیں دیتا تھا بلکہ ایک انجانی ہستی کی اہمیت کو منوانے اور تسلیم کروانے کا حکم جاری کرتا تھا۔ ثوبیہ اس سب پر بھی خاموش تھی۔ شاید یہ چپ یوں ہی رہتی اگر اس دن اچانک فون نہ آ گیا ہوتا اس کی ساس کا۔ فون پر ہیلو کہا تو ساس (حمیدہ بیگم) نے اس کا حال احوال دریافت کیا یہ گلہ کہ وہ ان کو بھول چکی ہے اور اب غلطی سے بھی فون نہیں کرتی۔

یہ سن کر ثوبیہ دھواں دھار رونے لگی۔ دوسری طرف حمیدہ بیگم بہت پریشان ہو گئی تھیں۔

''کیا بات ہے ثوبیہ! سب خیریت تو ہے ناں؟'' حمیدہ بیگم نے پریشانی سے پوچھا۔ وہ کیا بتاتی بس روتی چلی گئی اور بس پھر فون بند ہو گیا۔

مگر دوبارہ مسلسل بیل جارہی تھی۔ اس نے حوصلہ مجتمع کیا فون اٹھایا اور ساری صورت حال انہیں بتادی۔ دوسری طرف وہ سب سن رہی تھیں۔ بغور پوری توجہ سے جب ثوبیہ کی بات مکمل ہو گئی پھر بھی دوسری طرف مہیب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''پریشان مت ہو میں آتی ہوں کچھ دن میں۔'' فقط حمیدہ بیگم کا اتنا کہنا ہی اس کو تقویت دے گیا تھا۔ ماں کا آسرا بہت بڑا آسرا ہوتا ہے اور ثوبیہ اپنی ساس کو اپنی ماں سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ تبھی اس نے وہ تمام دکھ جو اپنی ماں کو بھی نہ بتا پائی تھی اپنی ساس کے سامنے گوش گزار کر دیئے تھے۔

☆......☆

پھر بہت سارے دن گزر گئے مگر حمیدہ بیگم نہ آئیں مگر ایک دن اس کی اکلوتی نند رابعہ آ گئی۔ اپنے دونوں بچوں سمیت اور بڑا بیگ کا بھرا ہوا خوب زور زور سے ثوبیہ کو گلے لگایا۔ ماتھا چوما اور یوں بھی وہ رابعہ آپی سے چھوٹی تھی۔ وہ احمد سے بڑی تھیں اور ان کا سسرال بھی احمد کے گھر کے پاس ہی تھا۔ دو بچیاں تھیں۔ دونوں ہی بہت پیاری ماں کا پرتو تھیں۔ ثوبیہ سے ملنے کے بعد اچانک رابعہ آپا کی نظر سامنے کھڑی شبانہ پر پڑی۔

''ارے شبانہ کیسی ہو؟ یہاں کیسے آنا ہوا؟'' رابعہ آپا نے شبانہ سے ہاتھ ملایا۔

''وہ میں پھر بتاؤں گی پہلے فریش تو ہو جاؤ آپ۔'' شبانہ کو کوئی تاویل سمجھ میں نہ آئی تو آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔

''ہونہہ! فکر والی تو بات ہی کوئی نہیں میں اب کافی عرصہ یہیں ہوں۔ بچوں کی بھی اسکول سے چھٹیاں تھیں تو سوچا میں اپنی پیاری سی اکلوتی بھابی سے مل آؤں۔ ثوبیہ خاصی کمزور ہو گئی ہو کیا بات ہے۔ احمد ٹھیک سے خیال نہیں رکھتا کیا تمہارا؟'' رابعہ آپا کی بات پر ثوبیہ کا رنگ یک لخت پھیکا پڑ گیا۔ اب کیا بتاتی وہ انہیں کس اذیت ناک پلوں سے وہ دوچار تھی۔ بعض لوگ آپ کے لیے اس قدر اہم نہیں ہوتے کہ ان کے بغیر جیا ہی نہ جاسکے مگر بعض تو اس قدر پیارے دل کے قریب روح میں اتر جانے والے ہوتے ہیں کہ جینا تو جینا ان کے بغیر تو مرنے کا تصور بھی سوہان روح بن جاتا ہے۔ اب ثوبیہ احمد کے بنا نہ جی سکتی تھی نہ مر سکتی تھی۔

''کس سوچ میں گم ہو گئی ہو؟'' رابعہ آپا نے مسکرا کر پوچھا تو وہ جھینپ سی گئی۔

''چلو بھئی مجھے تو اب آرام کرنے دو ذرا۔ میں تو چلی اپنے کمرے میں آ ؤ بچوں۔''

رابعہ آپا نے فٹافٹ بیگ تھاما اور ثوبیہ کے بیڈ روم سے ملحق بیڈ روم میں آ کر اس میں اپنا بیگ رکھ دیا اور وہاں جا کر آرام سے بیٹھ گئیں۔ ثوبیہ کو سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیسے بتائے کہ یہ کمرہ تو اب شبانہ کی دسترس میں ہے۔ درحقیقت رابعہ آپا جب بھی آتی تھیں تو اسی کمرے میں قیام پذیر ہوتی تھیں۔ اب جب وہ آئیں تو ادھر ہی آ گئیں جہاں وہ پہلے سے ٹھہرا کرتی تھیں۔

''ارے اس طرح کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو سارے آداب بھول گئی ہو کیا؟ جاؤ جلدی سے میرے لیے چائے بنا کر لاؤ اگر کچھ کھانے کو ہے تو وہ بھی لا دو۔ بلکہ ٹھہرو۔ شبانہ تم بھی تو فارغ ہی کھڑی ہو جاؤ جا کر میرے لیے چائے ناشتے کا اہتمام کرو۔''

رابعہ آپا کی بات پر شبانہ کا موڈ بے حد خراب ہو چکا تھا۔ ایک تو اس کے کمرے پر قابض ہو گئی تھیں پھر چائے بنانے کا بھی آرڈر دے رہی تھیں۔ وہ بے حد بے دلی سے اٹھی اور کچن میں آ کر برتنوں کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔

''ہونہہ...... بہت پیار نچھاور ہو رہا ہے اپنی بھابی پر۔ کچھ دن کی بات ہے احمد کو اپنا نہ بنا لیا تو میرا نام بھی شبانہ نہیں۔'' شبانہ نے خوابوں کا محل سجاتے ہوئے کہا۔

درحقیقت شبانہ کی اول روز سے ہی احمد پر نگاہ تھی۔ احمد کا نک سک سے سجا وجیہہ سراپا اس کے لیے ایک ایسا خوش کن تصور تھا جس کے خواب وہ ایک مدت سے دیکھا کرتی تھی۔ اس کا شوہر احمد ریاض ایک نہایت معمولی شکل وصورت کا مالک تھا اور پھر کم پڑھا لکھا تھا۔ اگرچہ احمد ریاض شبانہ کا ہر لحاظ سے خیال رکھتا اور جو منہ سے ایک بار لفظ شبانہ نکال دیا کرتی تھی وہ احمد ریاض کے لیے حکم بن جایا کرتا تھا۔ شبانہ کو یہ بات بھی بے حد گراں گزرتی تھی کہ احمد ریاض ایک تو معمولی نین نقش کا مالک کم وجیہہ صورت شخص تھا اس پر اس میں مردانگی کی بجائے ہر وقت صرف شبانہ کو خوش رکھنے کا بھوت سوار رہتا تھا۔ احمد ریاض جتنا بھی شبانہ کے آگے پیچھے گھومتا۔

شبانہ اتنی ہی گریزاں رہتی تھی۔ اس کو احمد ریاض جیسے نہیں کسی خوابوں کے شہزادے کا انتظار تھا۔ اس کے بڑے بھائی کو شبانہ کے فرض سے شاید چھٹکارا حاصل کرنے کی بہت جلدی تھی۔ اس کا ویزہ لگ چکا تھا وہ چاہتا تھا کہ والد کو ساتھ ہی لے جائے اور شبانہ کی شادی یوں آنا فانا کر دی گئی مگر بطور والد اور بطور بھائی دونوں نے شبانہ کے لیے اچھا ہی سوچا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ احمد ریاض کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ شبانہ ماں کی شفقت سے محروم رہی تھی۔ اس لیے اس میں خودسری کا عنصر نمایاں رہا تھا۔ بھائی بھی چھوٹا تھا اور گھر میں اس کا حکم ہی چلتا تھا مگر زندگی کے اتنے بڑے فیصلے میں اس کی ایک نہ چل سکی۔ اس کے والد نے بھی اپنے بیٹے کی ہاں میں ہاں ملائی اور یوں یہ شادی ہوگئی۔

احمد ریاض نے ہر ممکن سعی کی کہ وہ شبانہ کو دنیا کی ہر خوشی میسر کر سکے۔ اس کی ہر آرزو جس حد تک ممکن ہو اس کی تکمیل کرے مگر شبانہ کو اول روز سے ہی احمد ریاض سے محبت نہ ہو سکی۔ وہ خوابوں میں رہنے والی لڑکی تھی۔ اس نے اپنی عمر کا نازک دور خواب بننے میں بسر کر دیا تھا مگر جب حقیقت حال اس پر آشکار ہوئی تو اس کا ہر خواب چکنا چور ہو چکا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے ناخوش تھی۔

☆......☆

ہر دوسرے دن احمد ریاض سے جھگڑا کرتی مگر احمد ریاض اس کو منا لیتا تھا۔ احمد ریاض ہر ممکن سعی کر رہا تھا کہ اس کا گھر بس جائے۔ وہ حقیقی معنوں میں شبانہ کو اپنے دل اپنے گھر میں وہی مقام دے چکا تھا جو ایک بیوی کو ملنا چاہیے۔ جو ایک بیوی کا حق ہوتا ہے مگر شبانہ کو اس پر بھی قرار حاصل نہ تھا۔ اس نے ایک دن احمد ریاض سے ضد کی کہ وہ جاب کرنا چاہتی ہے۔ احمد ریاض نے اس بار اس کو منع کر دیا۔ شبانہ پہلے ہی گھر گرہستی میں کم دھیان دیا کرتی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جاب کرنے کے بعد وہ احمد ریاض کو یکسر فراموش کر دے مگر شبانہ کا تو دل گھر میں لگتا ہی نہیں تھا۔ شادی سے پہلے جب ابا اور بھائی کام پر چلے جاتے تھے تو وہ خراماں خراماں گلی میں جایا کرتی تھی۔ اس کی بہت سی سہیلیاں تھیں۔ وہ جب تک لگائی بجھائی نہ کر لیتی اس کو چین نہ پڑتا تھا مگر اب شادی کے بعد وہ کبھی کسی سے ملنے بھی جاتی تو احمد ریاض ناراض ہو جایا کرتا تھا۔ اس کا یہی کہنا ہوتا کہ وہ گھر پر توجہ دے مگر شبانہ کا پاؤں تو گھر میں ٹکتا ہی نہ تھا جس گھر میں جاتی اگلے دن بات کھل جاتی کہ شبانہ وہاں ملنے گئی تھی۔ کیونکہ شبانہ اپنی ازلی عادت سے مجبور تھی۔ لوگوں کے دلوں میں کدورت کے بیج بونے والی عادت۔ وہ اپنی اس عادت میں اس قدر راسخ تھی کہ اب چاہ کر بھی اپنی اس عادت کو بدل نہ سکتی تھی۔ نیا محلہ تھا نئے لوگ تھے وہ سب اس سے دوری اختیار کرنے لگے جہاں بچپن گزارا تھا وہ محلہ وہ آشیانہ تو وہ بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ جہاں اس نے اپنی ساری عمر گزاری تھی۔ وہ سکھیاں اس کی عادتوں سے واقف تھیں روٹھ بھی جاتی تو پھر مان بھی جاتی تھیں۔ سمجھتی تھیں کہ شبانہ کا کام ہی فتنہ ڈالنا ہے۔ کہتے ہیں کہ دوست انسان کی پہچان ہوتے ہیں اور انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔ دوست اچھے ہوں یا برے ان کے منفی اور مثبت اثرات انسان پر ضرور مرتب ہوتے ہیں اور شبانہ کا میل ملاقات بھی اس جیسے ہی لوگوں میں تھا مگر یہاں شادی کے بعد تو وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ بس گھر کے کام کاج تھے اور شام تک احمد ریاض کا انتظار اور پھر احمد ریاض کون سا اس کا من چاہا جیون ساتھی تھا۔ وہ تو مجبوری کی زندگی گزار رہی تھی۔ اب وہ جاب کرنے کی متمنی تھی اور یہ ضد روز بہ روز زور پکڑنے لگی۔ احمد ریاض کب تک اس کو خفا کر سکتا تھا۔ اس کے گھر کا ماحول تو یوں بھی خراب ہو رہا تھا۔ اس نے ہر طرح شبانہ کو سمجھا کر دیکھ لیا تھا۔ جب ناکامی حاصل ہوئی تو بالآخر اس نے یہ

طے کیا کہ وہ شبانہ کو جاب کی اجازت دے ڈالے اور اس نے ایسا ہی کیا اور شبانہ تو اس دن ہواؤں میں اڑ رہی تھی جس دن اسے جاب کرنے کی نوید ملی تھی۔ اس نے جلد ہی مختلف جگہوں پر اپلائی کر دیا مگر اتنی جلدی نوکری کہاں ملتی ہے۔ وہ گریجویشن کے بعد کچھ ڈپلومے بھی کرتی رہی تھی۔ یوں ہی وقت گزاری کے لیے اور آج وہی اس کے کام آ گئے تھے۔ ایک جگہ پر ٹائپسٹ کی جگہ خالی تھی۔ وہ وہاں سلیکٹ کر لی گئی۔ یوں اس کی زندگی کا ایک نیا باب کھل گیا۔ وہ بن سنور کر جاتی اور سر شام ہی گھر لوٹتی تھی۔

☆......☆

گھر کی حالت مزید بگڑتی چلی گئی مگر شبانہ خوش تھی۔ کیونکہ اس کی زندگی تو جیسے سنور ہی گئی تھی۔ وہ محض اپنی غرض کے مطابق زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کو دوسروں کی خوشی اور راحت سے کوئی غرض نہ تھی۔ پھر شبانہ سج سنور کر آفس روانہ ہو جاتی تھی اور وہاں کے ماحول میں ہی خوشی تلاشنے لگی تھی۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندوں میں شمار کی گئی ہوتی تو دیکھتی کہ خوشیوں کا نزول تو خود اس کے گھر سے شروع ہو رہا ہے۔ ایک پیارا سا گھر جہاں وہ مکمل آزادی کے ساتھ بنا کسی روک ٹوک کے جی رہی تھی اور ایک پیار لٹانے والا بے لوث محبت نچھاور کرنے والا اس کا مجازی خدا تھا مگر اسے تو یہ سب نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر تو صرف ''ظاہر'' کی پٹی بندھی تھی۔ وہ ''باطن'' پر نظر رکھنے والوں میں سے نہ تھی۔ پھر جب اس کی ملاقات احمد سے ہوئی اسی احمد سے جس کو وہ بچپن میں دیکھا کرتی تھی تو آئیڈیلائز کیا کرتی تھی۔ پھر جب اسے احمد کی شادی کی اطلاع ملی تھی تو وہ باقاعدہ ایک دن تک روتی رہی تھی۔ دھواں دھار احمد کا محبت سے بولنا اور احساس کرنا شبانہ نے اس کو کسی اور ہی رنگ سے دیکھا تھا۔ وہ ہر کسی سے ملنساری سے ملتا تھا اور شبانہ سے اچھا وہ اس لیے بھی بولتا تھا کہ اس کی امی نے اسے ہمیشہ یہی نصیحت کی تھی کہ وہ بن ماں کی بچی ہے۔ وہ جب بھی آئے جو بھی کہا کرے تم پلٹ کر کچھ مت کہنا۔ بس احمد کے ذہن میں ماں کے یہ الفاظ چپٹ کر رہ گئے تھے۔ اس لیے جب بھی شبانہ ان کے گھر آتی تو وہ کوشش کرتا کہ اس کا بھرپور خیال رکھے اور پھر حمیدہ بیگم بھی شبانہ کو کبھی بھی خالی ہاتھ گھر واپس نہ جانے دیتی تھیں۔ اس کو سوغاتیں ساتھ دے کر بھیجا کرتی تھیں۔

مگر شبانہ نے احمد کی نرمی اور حمیدہ بیگم کی محبت کو کچھ اور ہی سمجھ لیا تھا۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ آج نہیں تو کل ضرور حمیدہ بیگم اس کا ہاتھ اس کے ابا سے مانگ لیں گی مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ اس سارے قصے میں ایک نیا کردار اجاگر ہوا تھا۔ پوری آب و تاب کے ساتھ وہ کردار ثوبیہ کا تھا۔

شبانہ لب و لہجے میں خواہ جیسی بھی رہی ہو مگر شکل و صورت میں وہ بہت اچھی تھی اور جب وہ سنورتی تھی تو اس کا روپ اور بھی سنور جایا کرتا تھا۔ بظاہر تو اس میں کوئی خامی نہ تھی مگر قسمت کی بات تو یہ تھی کہ وہ احمد کی بیوی نہ بن سکی اور ثوبیہ صرف احمد کی بیوی ہی نہ تھی بلکہ من پسند من چاہی بھی تھی۔ یہی بات شبانہ کو بے حد گراں گزری تھی مگر جب اس کی بھی شادی ہو گئی تو وقتی طور پر وہ احمد کا ذکر بھول ہی چکی تھی مگر جب نئی جاب اسٹارٹ کی اور احمد کا سامنا شبانہ سے ہوا تو شبانہ کے سوئے ہوئے جذبات دوبارہ بیدار ہو چکے تھے۔ جب سارا دن خوشبوؤں میں بسا احمد اس کی نظروں کے سامنے رہتا اور گھر جا کر اسے احمد ریاض کا سامنا کرنا پڑتا جس کی شکل و صورت بے حد معمولی تھی اور پھر احمد ریاض کو لباس کے معاملے میں کوئی خاص فکر بھی نہ ہوتی جو اوڑھنے پہننے کو مل جاتا۔ وہ اس پر قناعت کر لینے والا شخص تھا مگر شبانہ کو اس کی یہ قناعت پسندی اور سادگی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ پھر احمد کے ساتھ جاب اسٹارٹ ہونے کے بعد وہ احمد کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی خواہاں تھی۔ وہ احمد

کو اکثر لنچ کا کہہ دیتی احمد بخوشی اس کی بات مان جایا کرتا تھا۔

☆......☆

کچھ عرصہ کے بعد شبانہ نے گاہے بہ گاہے احمد ریاض کی برائیاں کرنی شروع کر دیں۔ وہ احمد ریاض کی برائی کرتی اور نفرت انگیز انداز میں فرضی برائیاں بھی شامل کر لیتی۔ کیونکہ اس طرح وہ احمد کی دلجوئی اور ہمدردی حاصل کر رہی تھی۔ اسے احمد کی ہمدردی حاصل کر کے اچھا لگتا تھا۔ محبت نہ سہی ہمدردی ہی سہی مگر وہ غلط راہوں کی مسافر تھی۔ جس میں تباہی اور بربادی کے علاوہ کچھ بھی ہاتھ نہ آنے والا تھا اور بربادی کا آغاز اس دن ہوا جب احمد ریاض نے اسے کافی شاپ پر احمد کے ساتھ گپیں لڑاتے اور ہنستے ہوئے دیکھا۔ احمد ریاض کو یہ سب بے حد برا لگا۔ اس وقت اس کا دل چاہا کہ وہ شبانہ کے منہ پر بھری محفل میں تھپڑ جڑ دے مگر وہ باعزت شخص تھا اور یوں اپنی ہی عزت اچھال کر اسے کچھ بھی حاصل نہ ہونا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ شبانہ سے وہ آج دوٹوک بات کر کے رہے گا اور اس کی جاب بھی اب ختم کروا دے گا مگر جب شبانہ گھر آئی تو شبانہ نے الٹا ناراض اور غصہ ہونا شروع کر دیا۔

”یہ کیسا بہتان لگا رہے ہو مجھ پر احمد ریاض؟“ شبانہ نے دوبدو جواب دیا۔

”بہتان نہیں لگا رہا اپنی آنکھوں سے تمہیں ایک غیر مرد کے ساتھ دیکھا ہے۔“ احمد ریاض نے بھی غصے سے جواب دیا۔

”وہ غیر مرد نہیں ہے میرا کزن ہے تم نے کیا سمجھ رکھا ہے مجھے، وہ مجھے اور میں اسے بچپن سے جانتے ہیں اور پھر ایک جگہ جاب کرتے ہیں۔ اسی دوران بھوک لگی کافی پینے کا دل کیا تو پی لی۔ اس میں برائی ہی کیا ہے؟ میں نے تو آج تک تم سے کسی بات پر جواب طلب نہیں کیا۔ تم کیا کرتے ہو سارا دن کس کس سے ملتے ہو اور نہ ہی مجھے ان باتوں سے کسی قسم کی کوئی دلچسپی ہے۔ تم آئندہ میرے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش مت کرنا۔“ شبانہ نے بے شرمی اور ڈھٹائی سے کہا تو احمد ریاض افسوس سے اس کو دیکھنے لگا۔

”کاش شبانہ! کہ تم نے کبھی مجھے بھی کسی بات پر روکا ہوتا۔ اول تو میں نے کبھی تمہیں ایسی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا۔ دوسرے تمہیں جب مجھ سے کوئی غرض نہیں تو میری ذات سے کیا غرض۔ میں کس سے ملتا ہوں؟ کیا کرتا ہوں۔ کاش کہ تم بھی کبھی مجھے روکو مجھ پر حق جتاؤ۔ وہ حق جو اللہ کے سامنے گواہوں کی موجودگی میں تم نے مجھ پر جتایا مگر تم یہ سب نہیں سمجھتیں۔ تم کیسے آرام سے کہہ رہی ہو کہ تم اسے بچپن سے جانتی ہو۔ شبانہ اب تم بچی نہیں ہو۔ ایک شادی شدہ عورت ہو اور ہمارا معاشرہ ہماری اخلاقیات کیا یہ سب ہمیں اجازت دیتی ہیں کہ تم یوں میری اجازت اور مرضی کے بغیر کسی مرد سے یوں کھلے عام ملو۔ یاد رکھو کزن بھی محرم راز نہیں ہوتے ہیں اور پھر میری اجازت ہی نہیں۔ تم یہ بات اچھی طرح سمجھ لو اور کل سے اگر تم جاب پر گئی تو انجام کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔“

احمد ریاض نے سخت طیش اور دکھ کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شبانہ کا ہر احساس ختم ہو جائے گا۔ وہ جو اس کی دلجوئی اور محبت میں اس قدر آگے نکل آیا تھا۔ وہ شبانہ کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو دلی رنج ہوا تھا۔ شبانہ کی ایسی حرکتوں اور رویے سے مگر وہ اب پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہ تھا۔ بے شک محبت اپنی جگہ پوری سچائی کی وسعتوں کے ساتھ قائم و دائم تھی مگر یہ بھی ایک سچ تھا کہ کوئی بھی دنیا کا مرد اپنی عزت پر کوئی دھبہ، کوئی تازیانہ برداشت نہیں کر سکتا۔ ایسا ہی احمد ریاض نے بھی طے کیا تھا۔ اس نے

سوچا تھا کہ شبانہ ضرور ہو نچے گی اور ڈر جائے گی مگر جب وہ کام پر چلا گیا تو شبانہ حسب معمول جاگی تیار ہوئی اور جاب پر روانہ ہوگئی۔ احمد ریاض جب گھر لوٹا تو شبانہ گھر پر نہ تھی۔ اس کا خون کھول رہا تھا مگر اس وقت وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ بے چینی سے وہ شبانہ کا انتظار کرنے لگا۔ شبانہ مست گنگناتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی سامنے احمد ریاض کو دیکھا تو ایکدم سٹپٹا کر رک گئی۔ اب احمد ریاض ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ اسے بہت اجنبی اور برا لگنے لگا تھا۔ وہ اب نئی منزلوں کی جستجو کی راہ پر گامزن ہو چکی تھی، دل میں طے کر لیا تھا کہ اب جو بھی ہو جائے وہ ہر حال میں احمد کو پا کر ہی رہے گی۔ وہ ایک بار تو احمد کو کھو چکی تھی اب اس کے پاس یہ آخری موقع تھا کہ وہ اپنی تمام کشتیاں جلا کر احمد کے سنگ نئے سرے سے نئی زندگی کا آغاز کرے مگر بسا اوقات جب وہ سوچتی کہ احمد اب اس کے ساتھ اتنا ٹائم گزارنے کے بعد اس کے ہی گن گانے لگا ہے تبھی کبھی نہ کبھی نا معلوم کیسے ثوبیہ کا ذکر آجاتا۔ احمد کے منہ سے ثوبیہ کا نام سن کر شبانہ کا حلق تک کڑوا ہو جایا کرتا تھا۔ ثوبیہ اب اس کی ذات کے لیے ایک چیلنج بن چکی تھی۔ وہ اسے ہرا کر اپنی جیت کی خوشی حاصل کر لینا چاہتی تھی مگر احمد تھا کہ اس کے ہر فقرے کے اینڈ میں ثوبیہ کا نام آجاتا تھا اور شبانہ بے حد بے چینی کے ساتھ پہلو بدل کر رہ جاتی تھی۔

''کہاں سے آرہی ہو؟'' احمد ریاض کی آواز سناٹے کو چیر کر نکلتی ہوئی بے حد گونج دار اور سپاٹ تھی۔

''اس بات کا کیا مطلب ہے بھلا؟'' شبانہ نے بے حد بے زاری سے کہا۔

''صاف اور سیدھا سا مطلب تم کہاں سے آرہی ہو؟'' احمد ریاض نے اپنا سوال دہرایا۔

''میں جاب سے سیدھا گھر آئی ہوں۔ دیکھو احمد تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم مجھے جیسا سمجھ رہے ہو ناں، میں بالکل بھی ایسی نہیں ہوں۔ صرف جاب ہی تو کرنا چاہتی ہوں۔ تم اتنی دقیانوسی سوچ کے مالک ہو گے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' شبانہ نے بات کو غلط رنگ دے کر بات گھمائی تھی۔ احمد ریاض اب شبانہ کے ساتھ رہتے رہتے اس کی ہر چال کو سمجھنے لگا تھا۔

''میں دقیانوسی ہی ٹھیک ہوں شبانہ! کم از کم ان مردوں کی طرح بے غیرت تو نہیں ہوں جو اپنی بیوی کو بے پردہ دیکھ کر بھی مہر بہ لب رہتے ہیں۔ میں اب مزید یہ سب برداشت نہیں کروں گا اور میں تمہیں پہلے تو نہیں سمجھ سکتا تھا مگر اب سمجھ چکا ہوں۔ تم نے مجھ سے چھپایا ہے کہ تم روز ہی اس احمد کے ساتھ لنچ کرتی ہو۔ سارا اسٹاف سارا عملہ تم دونوں کے بارے میں جو باتیں کر رہا ہے کیا وہ لوگ بھی دقیانوسی ہیں اور تمہارا یہ انداز گفتگو؟ کیا یہی طریقہ ہے اپنے مجازی خدا سے بات کرنے کا۔ تم نے مجھے کبھی وہ عزت وہ مقام وہ رتبہ دیا ہی نہیں جو ایک شوہر کا حق ہوتا ہے۔ میں نے بہت سوچا ہے اور اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر تم نے ابھی اسی وقت میرے سامنے معافی مانگ کر وعدہ نہ کیا کہ کل سے تم جاب پر نہیں جاؤ گی تو میں ابھی اسی وقت اسی لمحے تمہیں طلاق دے دوں گا۔'' احمد ریاض کا لہجہ بے حد سرد ہو گیا تھا۔

''اوہ تو تم میری جاسوسی کرتے پھرتے ہو۔ مائی فٹ میں نہیں میری جوتی کرتی ہے تمہاری عزت، تم عزت کے قابل ہی کہاں ہو۔ ہر وقت روک ٹوک تھک گئی ہوں میں، تم نے مجھے چھوڑنا ہے ناں تو میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ دے دو مجھے طلاق۔ ابھی اسی وقت طلاق دو۔ جان چھوٹے میری تم جیسے سطحی ذہن کے مالک انسان سے۔ یوں بھی تمہاری محبت میرے دل میں تو کبھی پروان چڑھ ہی نہ سکی۔ تم نے کبھی آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے کیا، کیا تم ہو محبت کے قابل؟ عزت کے قابل؟ ہونہہ۔''

شبانہ نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ اس کا انداز بے حد نفرت انگیز تھا۔ اس کے لہجے میں شعلوں کی سی تپش تھی۔

احمد ریاض کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ یوں جیسے کوئی شخص بھرے بازار میں لٹ گیا ہو جس کا سب سے قیمتی اثاثہ اس سے چھن جائے اور کچھ بھی باقی نہ رہے۔ تہی دامن رہ جانے کا احساس لٹ جانے کا احساس۔

احمد ریاض نے آج جانا تھا کہ وہ محض ایک سراب کے تعاقب میں زندگی بسر کرتا رہا تھا۔ وہ محض ایک سراب ہی تو تھی۔ اس کی سوچ اور شبانہ کی سوچ میں کہیں کسی جگہ بھی کسی ایک مقام پر بھی ملاپ نہیں ہوتا تھا۔ اس کی سوچ الگ تھی۔ اس کا جینے کا طریقہ اور تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ احمد ریاض کے ساتھ رہنے کے بجائے آزادی کی خواہاں تھی۔ احمد ریاض نے اسے اسی وقت طلاق دے دی اور شبانہ طلاق کا طوق یوں وصول کررہی تھی جیسے کہ وہ کوئی انعام ہو۔ کوئی میڈل ہو۔ جوں جوں احمد ریاض کے لبوں سے لفظ طلاق ادا ہوتا گیا۔ شبانہ کی چہرے کی رنگت خوشی سے دمکتی جاتی تھی۔ وہ یہی تو چاہتی تھی۔

اور بس پھر اسے آزادی مل گئی تھی۔ ہر رشتے سے آزادی۔ باعزت زندگی بسر کرنے کی بجائے ذلت بھری زندگی کی آزادی۔ بے باکی کی آزادی۔ وہ اس راہ کی مسافر تھی۔ تو احمد ریاض کیونکر اسے روک سکتا تھا۔ وہ خاموشی سے واپس پلٹ گئی تھی۔ اپنے ہینڈ بیگ سے احمد کا نمبر ڈائل کیا اور احمد کے آنے تک وہ سارا منصوبہ اپنے ذہن میں ترتیب دے چکی تھی کہ اب اسے کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے اور اب جب کہ منزل بے حد قریب تھی۔ احمد اس کی محبت کو محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کا عادی ہونے لگا تھا۔ ہر بات میں اس کی رائے کو اہمیت دینے لگا تھا۔ تو نا معلوم کہاں سے اس کی رابعہ آپا آ گئی تھیں۔ وہ اپنے ذہن میں مختلف تانے بانے بننے میں مصروف تھی کہ سازشوں کا جال بنانا تو ازل سے ہی اس کی فطرت کا خاصا رہا تھا۔ پھر کسی ایک نقطے اور ایک سوچ پر آ کر وہ مطمئن سی ہو گئی تھی۔

☆......☆

''آپا! یہ شبانہ کا کمرہ ہے۔ میں آپ کو بتانے ہی والی تھی مگر آپ نے بتانے کا موقع ہی نہ دیا۔'' توبیہ بے حد پریشانی سے رابعہ آپا کو بتا رہی تھی۔

رابعہ آپا نے بے حد محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے اپنے پاس ہی بیڈ پر بٹھا لیا۔

''چندا دیکھو! مجھے ہر بات معلوم ہے۔ میں اتنی دور سے صرف اور صرف تمہاری خاطر آئی ہوں اور تم نے اب بالکل یہ بات ظاہر نہیں کرنی ہے۔ رہی بات یہ کہ یہ کمرہ شبانہ کے پاس تھا تو اب یہ میرے زیر استعمال رہے گا۔ شبانہ وقتی طور پر تو لاؤنج میں ہی سو جائے گی اور پھر بعد میں انشاءاللہ بوریا بستر سمیت اس گھر سے تم لوگوں کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے دفعان ہو جائے گی۔'' رابعہ آپا نے مسکرا کر کہا۔

''سچ آپا۔'' توبیہ ایکدم ہی بہت خوش ہو گئی تھی۔

''ہاں چندا! بالکل سچ۔ بس اب تم وہی کرتی جانا جو تم کو میں بولوں۔'' رابعہ آپا نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ توبیہ کو لگا اب وہ اس کوہ گراں میں اکیلی نہیں رہی۔ اب اس کے ہمدرد پیار کرنے والے بھی اس کے ہمراہ ہیں۔

''اور آنے تو دو احمد کو کس طرح میں اس کو سیدھا کرتی ہوں۔ اتنی پیاری سی بیوی کو چھوڑ کر اس خرانٹ میں نجانے کیا دکھائی دینے لگا ہے اس کو۔'' رابعہ آپا بے حد غصے میں تھیں اور توبیہ نے اتنے دنوں بعد خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔

شام کو احمد گھر آیا تو وہی پرانے تیوروں کے ساتھ مگر یہاں آ کر اسے معلوم ہوا کہ رابعہ آپا آئی ہوئی ہیں۔ وہ

رابعہ آپا سے بے حد ڈرتا بھی تھا۔ان کی عزت بھی بہت کرتا تھا۔وہ دو ہی بہن بھائی تھے۔اور وہ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے اپنا دکھ سکھ بھی بانٹ لیا کرتے تھے۔احمد نہایت خوش دلی سے رابعہ آپا سے ملا۔دونوں بچیاں اس کو گھیر کر بیٹھ گئیں۔شبانہ آج بہت ہی خاموش تھی اور ایک طرف الگ تھلگ بیٹھی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

پھر ثوبیہ شام کی چائے لے کر آئی تو وہ بھی ساتھ بیٹھ گئی۔احمد کی نگاہ ثوبیہ پر پڑی۔آج اتنے عرصے کے بعد ثوبیہ دوبارہ پہلے والی ثوبیہ لگی۔اتنے عرصے سے ثوبیہ بے دلی سے رہتی تھی۔نہ سجتی نہ سنورتی تھی۔ہر وقت روئی روئی سی رہتی تھی مگر آج تو ثوبیہ خوب سجی سنوری تھی اور بات بے بات قہقہہ بھی لگا رہی تھی۔احمد فقط اسے دیکھ کر رہ گیا۔ثوبیہ نے احمد کو چور نظروں سے دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا مگر وہ رابعہ آپا کی باتوں پر عمل پیرا تھی۔نہ تو وہ روئی نہ ہی اس نے دکھ کا اظہار کیا۔بالکل مطمئن سی ہلکی پھلکی سی تھی۔اس نے سب سے اچھے سے بات کی مگر احمد کو یکسر نظر انداز کر دیا جیسے کہ احمد سرے سے وہاں ہو ہی نا۔احمد کو ثوبیہ کا نظر انداز کرنا بے حد گراں گزر رہا تھا۔

''شبانہ! آپ بھی چائے لیں ناں۔'' احمد نے گم صم سی شبانہ کو دیکھ کر بلایا۔تو وہ جیسے موقع کی ہی انتظار میں تھی۔فوراً کھل سی گئی۔

''چلو شکر ہے مہمان کا کسی کو تو خیال آیا۔'' شبانہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''مہمان! ارے ہاں تم تو مہمان ہو شبانہ! کب جا رہی ہو واپس۔ویسے بھی مہمان تو صرف تین دن کا ہی اچھا لگتا ہے۔پھر تو وہ وبال جان بن جایا کرتا ہے۔'' رابعہ آپا نے ہنس کر کہا تو شبانہ نے مدد طلب نظروں سے احمد کی جانب دیکھا مگر احمد تو خاموش تھا۔اس نے بالکل بھی رسپانس نہ دیا۔

''میں تو جا ہی رہی تھی احمد کی ضد تھی کہ میں یہاں ان کے پاس ہی رہوں۔'' شبانہ نے جتاتے ہوئے کہا تو رابعہ ہنس دیں۔

تم تو نا سمجھ نہیں ہو ناں شبانہ۔برا مت ماننا مگر انسان کو خود ہی اپنی وقعت کا کچھ خیال کر لینا چاہیے۔تم کو اگر کہہ ہی دیا تھا احمد نے مروتاً تو تم مروت کو مروت ہی سمجھو بی بی۔''

رابعہ آپا نے لگی بندھی رکھے بغیر کہا۔

''آپا آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں یہ شبانہ یہاں میری مہمان ہیں آپ میری مہمان کو یوں بے عزت تو نہ کریں۔''

آخر احمد بول ہی پڑا۔

''تمہاری مہمان اچھا تو یہ تمہاری مہمان ہے۔تو ٹھیک ہے اٹھو ثوبیہ اپنا سامان پیک کرو۔یہاں میری اور تمہاری کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی گنجائش اب یہ صرف احمد کا گھر ہے۔اس کے گھر میں اب نہ تو اس کی بیوی کی گنجائش رہی ہے اور نہ ہی بہن کی اور احمد تم بھی ایک بات یاد رکھنا کہ ثوبیہ لاوارث تو یوں بھی نہیں ہے مگر وہ میری امی ابو کی ذمہ داری ہے۔تم یہ مت سمجھنا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے مگر مجھے تم سے یہ توقع ہرگز نہ تھی احمد۔''

رابعہ آپا نے گلوگیر لہجے میں کہا تو احمد بے طرح پریشان ہو گیا۔

''آپا آپ بالکل غلط سمجھ رہی ہیں۔یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ مہمان کی بھی عزت ہوتی ہے اور پھر مہمان تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتے ہیں۔ان سے اس طرح بات کرنا ٹھیک نہیں ہے۔اماں نے بھی تو یہی درس دیا تھا ناں۔'' احمد نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''اماں کی بھی تم نے خوب کہی احمد۔ اماں نے تو اور بھی بہت کچھ سکھایا ہے مگر لگتا ہے تمہیں اماں کے صرف چند من پسند فرمودات ہی یاد رہے باقی کی نصیحتیں فراموش کر گئے ہو۔'' رابعہ آپا نے بھی طنزیہ لہجے میں کہا تو احمد شرمندہ سا ہو گیا۔

''اور میں حق بات کہنے کی قائل ہوں۔ اصول کی بات تو یہ ہے کہ شبانہ کتنے دن یہاں رہ سکتی ہے اور پھر کس حق سے یہاں رہے گی۔ اب میں جب جاؤں گی تو شبانہ تم میرے ساتھ ہی چلنا۔ اماں بھی تمہیں بے حد یاد کر رہی تھیں۔ تمہارے لیے اداس ہو رہی تھیں تھوڑی محبتوں کا حق ہمیں بھی تو وصول کرنے دو۔ آخر کو اماں ابا کے حوالے سے ہی تو تم ہماری رشتے دار ہو۔ پھر امی نے خاص طور پر کہا ہے شبانہ کو ساتھ لانا۔''

رابعہ آپا نے بات ہی ختم کر دی۔ شبانہ کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا۔

''کیوں احمد اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا ناں۔''

''نہیں آپا آپ بڑی ہیں آپ کا ہر فیصلہ مجھے دل و جان سے قبول ہے۔'' احمد بھی بات کی اصل تہہ تک پہنچ گیا تھا اور پھر اب تو واقعی شبانہ کا یہاں رہنے کا کوئی جواز نہ تھا۔

''احمد تم ذرا میرے کمرے میں آؤ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

رابعہ آپا نے کہا تو احمد سعادت مندی سے ان کے پیچھے چل دیا۔

''احمد اب میں تم سے جو کہوں گی تم اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا پھر میں جو کہوں بتانا کہ وہ غلط ہے یا صحیح۔''

آپا نے احمد کو اپنے سامنے صوفے پر بٹھا لیا تھا اور احمد سعادت مندی سے سامنے ہی بیٹھا تھا۔

''جی آپا بولیں۔'' احمد نے کہا۔

''احمد ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں۔ وہاں کی کچھ اخلاقی حدود و قیود ہوتی ہیں۔ جن کی پاسداری اور احترام ہم پر لاگو ہوتے ہیں۔ ہم اگر معاشرے کی نفی کر کے چلیں گے تو دو چار قدم چلنے کے بعد ہم فقط تنہا رہ جائیں گے۔ کیونکہ ہماری بات کا ساتھ نہ تو یہ معاشرہ دے گا نہ ہی لوگ اور معاشرہ تو لوگوں سے ہی بنتا ہے۔''

''احمد تمہاری سب سے پہلی غلطی یہ تھی کہ تم شبانہ سے باہر جا کر بعد ملتے رہے۔ حالانکہ وہ تمہاری محرم نہیں ہے اور یہ سراسر غلط ہے۔ کیا ہمارا مذہب اس بات کو پسند کرتا ہے کہ ہم یوں نامحرم سے ملاقاتیں کریں۔ گپ شپ کریں، ہرگز نہیں۔ پھر یہ سب کیا ہے احمد؟ تم نے تو ثوبیہ کے وقت بھی ثوبیہ کو ڈائریکٹ شادی کے لیے پرپوز کر دیا تھا۔ اپنی عزت بنا لیا تھا۔ اس کے گھر والوں کے گھر باقاعدہ رشتہ لے کر ہم گئے ثوبیہ کو بیاہا، وہ تمہاری چاہت تھی۔ ہم نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ پھر احمد تمہاری یہ چاہت اتنی کھوکھلی نکلی کہ کسی دوسری عورت کے ہتھے چڑھ گئی۔ کیا اتنی ہی مدت تھی تمہارے بے لوث جذبات کی اور وہ ثوبیہ وہ کس پاداش میں یہ سب سہے۔ وہ مظلوم لڑکی خاموشی سے نجانے کتنے عرصے سے تمہارا ہر ظلم برداشت کرتی چلی جا رہی ہے۔ تمہیں اپنا حکمران مجازی خدا مان کر اور احمد تم شبانہ کو اس لڑکی پر فوقیت دے رہے ہو جو اپنے شوہر کو اپنی جنت کو اپنے آشیانے کو لات مار کر آ گئی ہے۔ محض اپنی نفسانی تسکین کے حصول کی خاطر۔ بتاؤ کیا یہ درست ہے؟ احمد بتاؤ اور ثوبیہ اچھی ہے یا شبانہ۔ تم یہ فیصلہ کرو۔ ثوبیہ جس نے تمہیں مان دیا، عزت دی، تمہارا ہر غلط رویہ بھی ہنس کر سہا۔ تمہارے سامنے اف تک نہ کی۔ اس لڑکی پر آفرین ہے کہ اس نے نہ تو تمہاری عزت اپنے سسرال

میں دوکوڑی کی کی۔ نہ ہی میرے سامنے میں نے تو خود آ کر یہاں کے حالات دیکھے۔ کیا تم جانتے ہو احمد کہ میاں جس کو اپنے گھر میں فوقیت دے وہ گھر کا کلی مالک بن جایا کرتا ہے اور تم نے یہ حق ثوبیہ سے چھین کر شبانہ کی گود میں ڈال دیا ہے۔ اب ثوبیہ محض شبانہ کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی بن کر رہ گئی ہے۔

اس لڑکی ثوبیہ کو کیا مجبوری ہے کہ وہ یہ سب سہہ رہی ہے۔ فقط تمہاری محبت میں احمد۔ صرف تمہاری خاطر۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے احمد کہ تم اس کی قدر کر دو یا اس کی محبت کو، ہمیشہ کے لیے بے دقعت کر دو۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا احمد۔ بے حد دکھ ہو رہا ہے مجھے۔''

رابعہ آپا نے افسوس سے کہا۔ ان کا لہجہ بے حد آزردہ ہو گیا تھا۔

احمد نے ساری باتیں سنی تھیں اور وہ خاصا شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ پھر باقی کے تمام مراحل خود بخود طے ہوتے چلے گئے تھے۔ شبانہ نے محسوس کر لیا تھا کہ اب یہاں اس کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ رابعہ آپا اپنے قول میں بالکل سچی نکلیں ہفتہ بھر رہنے کے بعد وہ شبانہ کو بھی ساتھ لے گئیں۔ وہ درحقیقت آ ہی اسی مقصد کے لیے تھیں کہ شبانہ کو اپنے ساتھ واپس لے جائیں۔

حمیدہ بیگم جانتی تھیں کہ یہ باب اس طرح بند نہ ہوگا۔ اس کا کوئی نہ کوئی حل مکمل طور پر تلاشنا ہوگا اس کے لیے انہوں نے شبانہ کے لیے بر تلاشنا شروع کر دیا اور پھر ایک جگہ خود شبانہ نے ہامی بھر لی تھی۔ حمیدہ بیگم نے ماں بن کر شبانہ کا یہ فرض ادا کیا تھا۔ شبانہ کو خود ہی بے حد شرمندگی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ زبردستی کے بنائے گئے رشتے پائیدار نہیں ہوتے۔ یہ عارضی رشتے ہوتے ہیں۔ جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ اصل حقیقت تو یہی ہے کہ جہاں عورت کو تحفظ ملے عزت ملے وہی اس کا ٹھکانا ہوتا ہے۔ ایسی جگہ ایسا مقام دقعت کا باعث نہیں بن سکتا جہاں آپ کی ضرورت ہی نہ ہو۔

تقدیر سے لڑا نہیں جا سکتا۔ شبانہ نے جب یہ بات تسلیم کر لی تو اللہ نے بھی اس کی اس بات کو پسند کیا اور شبانہ کی دوسری شادی جہاں ہوئی وہاں بھی اس کو عزت ملی تحفظ ملا اور شبانہ کی صورت کہ اس کا میاں خوش شکل ہو اور سلیقہ مند ہو۔

☆......☆

رابعہ آپا اور شبانہ کے جانے کے بعد وہی گھر تھا وہی در و دیوار تھے مگر ثوبیہ کا اب یہاں بالکل دل نہ لگتا تھا۔ اپنا گھر ہی اسے اب اجنبی لگنے لگا تھا۔ ہر جگہ اسے شبانہ چلتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ ہر جانب اسے اس کا عکس دکھائی دیتا تھا۔

ثوبیہ نے اپنا اعتماد کھو دیا تھا۔ وہ اعتماد جو احمد نے اسے ودیعت کیا تھا اور پھر چھین بھی لیا تھا۔

احمد اور ثوبیہ کے درمیان ایک نامعلوم دیوار آن کھڑی ہوئی تھی۔ ایک خلش آ گئی تھی جو نہ جانے اب کبھی جانی بھی تھی کہ نہیں۔ احمد اور ثوبیہ کی زندگی ایک روش پر چل تو پڑی تھی مگر اس میں اب کوئی پہلے جیسی رمق اور بات نہ رہی تھی۔

اب وہ دونوں بس ایک زندگی کو جی جا رہے تھے احمد نے کئی مرتبہ چاہا کہ اس حصار کو توڑ دے اس دیوار کو گرا دے جو ثوبیہ نے اپنے چاروں اطراف میں کھڑی کر رکھی تھی مگر احمد اس کوشش میں ناکام ہو گیا تھا اگرچہ ثوبیہ نے احمد کو اس کے کسی حق سے بھی محروم نہ کیا تھا مگر وہ اب اپنے دل کے مسند پر احمد کا عکس نہیں دیکھ پائی تھی۔ کیونکہ اب دل کا مکین ہی دل میں نہ رہا تھا۔ وہ آشیانہ دل خاکستر ہو چکا تھا۔ یہ محبت بھی عجب شے ہے۔ اس کا

سارا دارومدار فقط بھروسہ اور اعتماد پر کھڑا ہوتا ہے۔ یہ عمارت تبھی تک رہتی ہے جب تک یقین کا موتی حاصل ہو جہاں انسان کے ہاتھ سے یہ موتی چھن گیا سمجھو ساری کہانی ہی اختتام پذیر ہو گئی ہو۔

بالآخر اس خاموشی اس سکوت نے ثوبیہ کو ایک دن توڑ ہی ڈالا اور وہ شور وہ قلقاری تھی اس کی ننھی سی کونپل اس کی بیٹی عالیشہ کی قلقاری۔ عالیشہ نے آ کر ثوبیہ کی زندگی کو مکمل کر دیا تھا۔ اس کے وجود کے ادھورے پن کو ماتا کے احساس نے مکمل کر دیا تھا۔

ثوبیہ آج اس قدر خوش تھی کہ اس نے احمد کا ہر قصور معاف کر دیا تھا۔ احمد اور ثوبیہ کی زندگی میں حقیقی معنوں میں خوشیوں کے لازوال رنگ بکھیرنے والی ان کی لاڈلی چہیتی بیٹی عالیشہ تھی۔ عالیشہ جو ماں اور باپ دونوں کا عکس تھی۔ دونوں کی خوشیوں کا محور اور گہوارہ تھی۔

جب احمد سرِ شام آتا تو عالیشہ کو گود میں اٹھا لیتا تھا اور عالیشہ اپنی بولی میں احمد سے باتیں کیا کرتی تھی۔ عالیشہ کو گود میں لے کر احمد کو لگتا تھا کہ وہ دنیا کا خوش نصیب ترین انسان ہے۔

☆......☆

زندگی پھر اپنے معمول پر آ گئی تھی۔ سب کچھ نارمل ہو گیا تھا۔ اب احمد اور ثوبیہ پہلے کی طرح ہی نارمل زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ پھر ایک دن ثوبیہ گھر کی صفائی کر رہی تھی کہ اس کے ہاتھ احمد کی ڈائری لگ گئی۔ احمد اور ڈائری؟ ثوبیہ ازحد حیران تھی۔ احمد کو کب سے ڈائری لکھنے کا شوق ہو گیا تھا۔ ثوبیہ اپنا کام بھول کر اس ڈائری کو گود میں لے کر بیٹھ گئی اور اس کے صفحات پلٹنے لگی۔ احمد نے اوپر ہی ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

دل کے طاق پر جلتا ہوا چراغ
یہ ختم ہوتا ہی نہیں اس کا نقش پا
تج بھی دوں اگر میں یہ جہاں سارا
بن نہیں سکتا مگر پھر اس کا نقش پا

ثوبی میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ میں خود کو کتنا نادم پاتا ہوں۔ جب جب میں تمہیں رلاتا ہوں مگر مجھے خود بھی معلوم نہیں ہے کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ شبانہ مجھ سے جھوٹ بولتی ہے اور اکثر دروغ گوئی سے کام لیتی ہے مگر میں پھر بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوں۔ میں آزما رہا ہوں۔ شاید اپنی محبت کی شدتوں کو یا شاید تمہیں ہی۔ کیونکہ میری محبت کی شدت بھی تو تم ہی ثوبی۔

ثوبی اس دن میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ تمہیں ڈانٹا تھا اور میں نے خود کو بعد میں بہت برا بھلا کہا۔ میں نے ایسا کیوں کہا اس سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ ثوبی وقتی طور پر ہی سہی مگر میں شبانہ کی باتوں میں آیا تھا مگر میں دل میں ہمیشہ تمہیں ہی بسایا ہے ثوبی۔

ہو سکتا ہے کہ میرے قدم ڈگمگا جاتے اور میں شبانہ کے دوغلا پن کو کبھی سمجھ ہی نہ پاتا مگر ایک دن جب میری طبیعت خراب تھی تو میں آفس سے جلد گھر لوٹ آیا تھا اور پھر میں نے تمہاری اور شبانہ کی باتیں سن لی تھیں۔ جب شبانہ نے تمہیں کہا۔ ”تھوڑے دنوں کی بات ہے ثوبیہ میں احمد کو اپنا بنا لوں گی تم نے ایک دفعہ تو احمد کو مجھ سے چھین لیا تھا مگر اب اس دفعہ بات تمہیں ہی ہو گی ثوبیہ یاد رکھنا میری بات۔“

آواز کسی اور کی نہیں شبانہ کی تھی۔ تو کیا شبانہ نے یہ سب کسی منصوبہ بندی کے تحت کیا تھا۔ میں یہ راز جان کر سخت اذیت کا شکار ہو چلا تھا۔ تبھی تمہاری آواز نے مجھے چونکا دیا تھا۔

"ٹھیک ہے شبانہ تم یہ بھی آزما کر دیکھ لو اگر اللہ رب العزت نے احمد کا ساتھ میرے مقدر میں رقم کیا ہے تو میں تاعمر ہی ان کی بیوی رہوں گی۔ مجھے خود پر کوئی زعم نہیں ہے مگر احمد کی وفا پر تو ہے اور اس سب سے بھی بڑی ذات میرے رب کی ہے۔ احمد کو تم تو کیا کوئی بھی مجھ سے نہیں چھین سکتا کیونکہ مجھے وہ بطور انعام میرے رب تعالیٰ نے دیا ہے۔"

تمہاری آواز ثوبی مجھے ندامتوں کے گہرے پاتال میں ڈبونے کے لیے کافی تھی۔ میں الٹے قدموں واپس پلٹ آیا تھا۔ اس کے بعد میں نے صرف خاموشی اختیار کر لی تھی گہری چپ،

اگر رابعہ آپا نہ آتی تو میں نے سوچا تھا کہ شبانہ کا چہرہ ایک دن بے نقاب کر دوں گا مگر اس سے قبل ہی شبانہ کو رابعہ آپا اپنے ساتھ لے گئیں اور یہ بھی سچ ہے ثوبی کہ رب تعالیٰ اپنے بندوں کے پردے رکھتا ہے۔ وہ ستار ہے۔ غفار ہے۔ اس نے مجھ پر کرم کیا۔ میری آنکھیں کھول دیں مگر ثوبی اب جب کہ سب کچھ ٹھیک ہو چلا ہے اور ہمیں اولاد کی نعمت ملنے کی نوید بھی مل گئی ہے مگر تم ہنوز چپ رہو۔ مجھے دیکھتی تو ہو مگر تمہاری آنکھوں میں مجھے اب وہ محبت نظر نہیں آتی نامعلوم وہ کہاں جا سوئی ہے۔ میں اس کو ہر پل تلاشتا رہتا ہوں تمہاری جھیل کٹورے نینوں میں مگر ثوبی اس محبت کو میں نے اپنے ہاتھوں سے خود کھو دیا ہے۔ میرا جرم ہے کہ میں نے تمہیں دکھ دیئے مگر پلیز مجھے میری وہی پہلی محبت لوٹا دو۔ پلیز ثوبی، میں یہ سب لکھ تو سکتا ہوں مگر تم سے کہنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا۔"

تمہارا فقط تمہارا

احمد

ایک جھڑی تھی آنسوؤں کی جو بہے چلے جا رہی تھی۔ سیلاب کی مانند آج وہ اتنا روئی کہ دل کا تمام غبار چھٹ گیا۔ عالیشہ بھی اس کے رونے کی آواز پر اٹھ کر بلک بلک رو دی۔ اس نے عائشہ کو تھپک تھپک کر دوبارہ سلا دیا۔

آج واقعی اس کا دل احمد کی جانب سے صاف ہو گیا تھا اور واقعی یہ تو اللہ کی مرضی ہے کہ جب چاہے کسی کا دل پلٹ جائے۔ آج اس کا دل احمد کی جانب روز اول کی مانند پلٹ چکا تھا۔ سرشام وہ اسی چاؤ سے احمد کے لیے تیار ہوئی جیسے کہ وہ ہوا کرتی تھی۔

اس نے احمد کے پسندیدہ کھانے بنائے اس کا پسندیدہ کلر کا سوٹ زیب تن کیا اور پھر احمد آیا تو اس کا یا پلٹ پر حیران ہی رہ گیا۔ آج احمد کی آنکھوں کی حیرت اسے بے طرح شرما رہی تھی۔

احمد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اسے دیکھ کر احمد کو احساس ہوا کہ ثوبیہ اب وہی پہلے والی ثوبیہ بن گئی ہے۔

ثوبیہ نے مسکرا کر احمد کو دیکھا اور احمد نے ثوبیہ کی گود سے عائشہ کو لے کر پیار کیا۔ آج ان تینوں کی زندگی بالکل مکمل ہو گئی تھی۔ جہاں کسی تیسرے فرد کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ کسی شبانہ کا عکس آج کہیں بھی نہ تھا۔

"دیکھو ثوبی میں کہنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے معاف کر دو میں جانتا ہوں کہ یہ مشکل تو ہے مگر میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ بھی تمہاری آنکھوں میں میری وجہ سے آنسو نہیں آئیں گے۔"

احمد کی بات پر ثوبیہ نے اپنا سر احمد کے کندھے پر ٹکا دیا۔ یعنی کہ وہ اس بات پر متفق تھے اور احمد پر بھروسہ کرتی تھی۔

ہر طرف رنگوں کی کہکشاں اُمڈ آئی تھی چار سو۔

☆

ناولٹ

جفائے دل وفا کر بیٹھا

رات کے اندھیرے سائے میں کتوں کے بھونکنے کی آوازوں نے سکتے کو توڑے رکھا تھا، یہ اس کے پالتو شکاری کتے تھے جو اس خوبصورت و حسین پیکر کے تھے جو اپنی ہی حویلی کے پیچھے بنی کوٹھڑی میں



بند تھی، جہاں ایک طرف دیوار پر لٹکی لالٹین کوٹھڑی کے خوفناک کالے بادل کو دور کرنے کی اپنی روشنی سے ناکام کوشش کر رہی تھی، وہ سسک رہی تھی اپنے خوابوں کی تعبیر کو حاصل کرنے کی چاہ میں اندھیرے تک آگئی تھی، جدھر اس جلاد صفت انسان نے اس کا راستہ موڑ لیا تھا، جو اس وقت اس کے سراہنے بے ہوش پڑا ہوا تھا اس کے ہاتھ کی طرف چابک تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے لائبہ کے جسم پر نیلے نشان ڈال چکا تھا، یہ سفاک انسان کوئی اور نہیں اس کا بھائی آیان شاہ تھا، جس نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا، جو سزا اپنی بہن کو بھوکا رکھ کر خود کو بھی دی تھی یہ اس کی اپنی بہن سے محبت تھی۔

''یہ کیسی محبت ہے آیان بھیا! میری چاہت کی قدر نہیں کی۔ بچپن سے مجھے وہ ہر چیز دی جو میں نے مانگی۔ آج اپنی چاہت کی سزا مجھے ایسے دے رہے ہیں''۔ لائبہ سوچوں میں غلطاں ماضی کے جھروکوں کے در وا کرتی چلی گئی۔

''بھیا! آپ کے آنے کی خوشی میں، میں نے آپ کا من پسند کھانا چکن شاشلک اور چکن جلفریزی بنایا ہے''۔ تحفوں سے لدا آیان حویلی کے اندر داخل



ہوا تھا اور اپنی پیاری سی بہن لائبہ کو اپنی طرف دوڑ کر آتے ہوئے تحفوں کو ایک طرف صوفے پر ڈال کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

''آیان بھیا! یہ سب تحفے میرے لئے لائے ہیں''۔ تحفوں کو دیکھ کر للچاتے ہوئے لائبہ نے کہا جس پر آیان کو ڈھیروں پیار آیا۔

''بھئی اور کس کے لئے لاتا ہوں یہ تحفے یا لاؤں گا ایک ہی تو بہنا ہے میری جو شہر سے قیمتی جیولری، چوڑیاں، نیل پالش اور جانے کیا کیا منگوالی ہے''۔ اپنے بیگ میں سے ایک فائل نکال کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے آیان گویا ہوا۔

''بھیا! میں ہمیشہ آپ سے یہ سوال ضرور پوچھتی ہوں کہ یہ تحفے خاص میرے لئے ہی لائے ہیں کیونکہ میں آپ سے ایک اور نام پوچھنا چاہتی ہوں''۔ لائبہ نے آنکھوں میں شرارت لئے سنجیدگی سے کہا۔

''اُفوہ... ایک تو تم اور تمہارا سوال، چلو کھانا لگاؤ میں چینج کر کے آتا ہوں''۔

''آیان بھیا! ٹالیں نہیں بتایئے میرے لئے بھابی پسند کی، شہر کی اتنی بڑی یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں، میرے خوبصورت بھیا سے کوئی حسینہ ایسی ٹکرائی تو ہوگی جو...''

''بس باقی بٹ بٹ بعد میں، جاؤ جلدی کھانا لگاؤ''۔ تھوڑی دیر میں آیان کپڑے بدل کر فریش ہو کر کھانے کی ٹیبل کی کرسی پر براجمان تھا۔

دونوں بہن بھائی خاموشی سے کھانا کھالیں یہ کیسے ممکن تھا۔

''تم تو بھاوج کا ہی پوچھنا مجھے خود ہی بتانا پڑے گا، تمہارا بی ایس سی میں داخلہ ہو گیا ہے میری یونیورسٹی میں، کل ہی تمہیں میرے ساتھ کراچی چلنا ہوگا، آج ہی پیکنگ کر لینا''۔ آیان نے ہاتھ باؤل میں دھوتے ہوئے لائبہ کے چہرے پر آئی خوشی کی پھواریں دیکھی تھیں۔

''واہ بھیا! کیا خوشی کی خبر ہے مگر اس سے بھی زیادہ خوشی مجھے تب ہوگی، جب آپ میرے لئے بھابی لائیں گے''۔ لائبہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''ہاہاہاہا...'' آیان نے قہقہہ لگایا۔

''اور اس سے بھی خوشی کی خبر ہے میرے پاس''۔ آیان نے لائبہ کی چھوٹی سی ناک کو ہلکے سے چھو کر کہا۔

''وہ کیا بھائی جلدی سے بتائیں''۔ لائبہ نے تجسس سے کہا۔

''ہمارے دور کے کزن شہریار افتخار کا رشتہ تمہارے لئے آیا ہے جن سے تم خالہ جمیلہ کی بیٹی کی شادی میں مل چکی ہو''۔ آیان بھائی کی بات سن کر لائبہ کو ذرا خوشی نہیں ہوئی، اسے شہریار کا اس سے بات بات پر مذاق کرنا اور فری ہونے کی کوشش کرنا یاد آ گیا تھا، اس نے نخوت سے منہ بسور لیا تھا۔

''کیا ہوا، تم خوش نہیں ہوئیں؟ چلو یہ باتیں تو چلتی رہیں گی تم پہلے اپنی پڑھائی مکمل کر لو بعد میں تمہاری شادی کردوں گا''۔ آیان لائبہ کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا دیکھ کر بات کو ہلکے انداز سے ختم کر گیا۔

☆............☆............☆

گاؤں بسنت پور میں شاہ حویلی یہاں کے جاگیردار احسان شاہ اور ان کی بیگم شمائلہ احسان شاہ کی تھی جو ایک ایئر کریش میں اپنے دونوں بچوں اور لائبہ کو اس دنیا میں اکیلے چھوڑ گئے تھے، مگر ساتھ ہی بے انتہا دولت اور نوکر چاکر کا سامان مہیا کر گئے تھے، آیان چونکہ جوان تھا اپنی چھوٹی بہن لائبہ کو جلد ہی سنبھال لیا تھا اور اپنی تعلیم بھی جاری رکھے ہوئے تھا اور لائبہ کی ہر خواہش پوری کرنے کی سعی میں لگا رہتا تھا، جبھی وہ لائبہ کو صبح ہی لے کر کراچی کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔ یہاں بھی ان کا اپنا بنگلہ تھا۔

یونیورسٹی میں لائبہ کا پہلا دن تھا، جو خاصا خوشگوار گزر رہا تھا، اس کی بہت سی دوست بن گئی تھیں، کچھ سینئرز لڑکے لڑکیوں میں لائبہ کو دیکھ کر چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں جس کا لائبہ نے کوئی نوٹس نہیں لیا مگر اس کی فرینڈز نوٹس لے رہی تھیں۔ آیان اپنی فائنل ایئر کی کلاس لینے میں مشغول رہتا اور چھٹی کی ٹائمنگ میں ہی لائبہ سے ملاقات ہوتی تھی جب دونوں گھر کے لئے ایک ساتھ روانہ ہوتے تھے۔

☆.........☆.........☆

''یار لائبہ! تم نے کچھ نوٹ کیا کوئی تمہارا کتنا دیوانہ ہے''۔ لائبہ اپنی دوست صائمہ کی بات پر چونکی تھی۔

''کیا مطلب میں سمجھی نہیں''۔ لائبہ نے ناسمجھی سے صائمہ کی طرف دیکھ کر کہا جو ابھی کلاس لے کر کوریڈور سے گزر رہی تھیں۔

''بھئی میں ایم بی اے فائنل ایئر کے اسٹوڈنٹ شایان بخاری کی بات کر رہی ہوں، اتنا ڈیشنگ اسمارٹ وجیہہ شخصیت کا مالک جس کے پیچھے لڑکیاں بھاگتی ہیں وہ تمہاری جھلک کا منتظر دکھائی دیتا ہے''۔ صائمہ نے شرارتی لہجے میں کہا۔

''نظر آنے دو اور دکھانا تم مجھے اس کی شکل اچھی طرح نمٹوں گی اس سے، ساری عاشقی کا بھوت نکل جائے گا''۔ لائبہ کا غصے سے چہرہ تمتما رہا تھا۔ دونوں کیفے ٹیریا میں داخل ہو کر ایک طرف رکھی میز کی کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ ویٹر کو آرڈر دے کر دونوں باتوں میں مشغول ہو گئیں۔

''اچھا زولوجی کے کچھ نوٹس... ارے یہ کیا''۔ باتیں کرتے ہوئے صائمہ کی نظر کسی پر پڑی تھی اور اچانک بولی تھی۔

''کیا ہوا؟ کوئی بندر دیکھ لیا''۔ لائبہ نے اچنبھے سے صائمہ کے چونکنے پر ادھر اُدھر دیکھا۔

''وہ تمہارے بالکل سامنے شایان بیٹھا ہے''۔ اتنے میں ویٹر چاٹ اور کولڈ ڈرنک لے کر آ گیا۔

صائمہ نے اشارے سے لائبہ کو کھانے کو کہا اور پھر دونوں کھانے میں مصروف ہو گئیں۔ لائبہ نے چاٹ اور کولڈ ڈرنک ختم کر کے ویٹر کو بل دینے کے لئے آواز دی۔

''میڈم آپ کا بل پے ہو چکا ہے''۔ ویٹر نے مودبانہ انداز میں کہا۔

''کس نے پے کیا؟''

''جی وہ آپ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے صاحب نے''۔ ویٹر کہہ کر چلا گیا۔

لائبہ تنک کر اٹھی اور شایان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ غصے میں تمتماتا چہرہ دیکھ کر شایان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''اے مسٹر! یہ کیا بدتمیزی ہے اتنا ہی پیسہ ہے تو غریبوں کے بل پے کرتے پھرو اور اپنی نظریں نیچی کرو، ورنہ آئندہ تمہاری کسی بھی احمقانہ حرکت پر اپنے بھائی سے کہہ کر تمہاری درگت بنوا دوں گی''۔

☆.........☆.........☆

اسٹوڈنٹ ویک شروع ہو چکا تھا۔ آیان اور لائبہ نے کھیلوں، ڈراموں، بیت بازی اور ڈیبیٹ میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ اب باری فن فیئر کی تھی جس میں دونوں بہن بھائی اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ مختلف اسٹالز کے گرد گھوم رہے تھے۔ لائبہ اپنی دوستوں کے ساتھ کچھ دور نکل آئی جہاں کچھ چھچھورے لڑکوں نے انہیں گھیر لیا۔

''یہ کیا تماشا ہے چلو پھوٹو یہاں سے''۔ اچانک ہی شایان نے پیچ کلر کے ڈریس پینٹ شرٹ میں ملبوس وہاں بارعب آواز میں ان لڑکوں کو ڈپٹتے ہوئے لائبہ اور اس کی دوستوں کو اپنی آڑ میں لے لیا۔ وہ لڑکے شایان کو دیکھ کر رفو چکر ہو گئے۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ تو فرشتہ بن کر

آ گئے''۔ لائبہ نے شایان سے متاثر ہو کر اور ساتھ ہی پچھلی مڈبھیڑ پر ندامت سے کہا تو شایان زیرلب گویا ہوا۔

''میں تو سمجھتا تھا کہ آپ کہیں گی کہ یہ لوفر لڑکے میں نے بھیجے ہیں، خیر اب آپ سب وہاں سب اسٹوڈنٹس کے ہجوم میں شامل ہو جایئے''۔ آیان کو اس طرف آتے دیکھ کر شایان کھسک گیا۔

☆........☆........☆

''میرا جذبہ تم سے شدید محبت کا ہے جس نے میرے دل کی دنیا میں قیامت مچا دی ہے جو تم سے ملنے کی آرزو کرتا رہتا ہے، سوگا ہے بگاہے اس گلاب جیسے رشتے کو مضبوط تر کرنے کے لئے اور کچھ نہیں تو میل ملاپ کے کچھ بہانے ہی تلاش کرتے رہا کریں گے ہم''۔ شایان مخمور لہجے میں موبائل فون پر لائبہ سے محو کلام تھا۔

''سو ہر بار کی طرح آپ کی فرینڈ صائمہ کے گھر ملاقات ہو جائے''۔

''نہیں شایان! مجھے ایسے تم سے چھپ چھپ کر ملنا اچھا نہیں لگتا، ایسا لگتا ہے میں آیان بھائی کو دھوکہ دے رہی ہوں، آپ کو آیان بھائی سے میرا ہاتھ مانگنا چاہئے''۔ لائبہ دوٹوک لہجے میں بولی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ نجانے کیوں لائبہ کی آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔

''ٹھیک ہے میں آج خود ہی تمہارے گھر آ جاؤں گا تمہارا ہاتھ مانگنے، مگر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں آیان تمہاری شادی مجھ سے کبھی نہیں ہونے دے گا''۔

''نہیں میرے بھائی ایسے نہیں ہیں، میں انہیں ابھی سب کچھ بتا دوں گی۔ مجھے یقین ہے وہ میری چاہت کے آگے کچھ نہیں بول سکیں گے اور منع کرنے کی وجہ بھی کیا بنتی ہے۔ نہ ہمارے درمیان طبقاتی فرق ہے، نہ مذہب کا، نہ تعلیم کا اور نہ ہی عمر کا اور نہ ہی خوبصورتی و بدصورتی کا''۔ لائبہ حیرانی و تعجب سے گویا ہوئی۔

''یہ تو تمہیں آنے والا وقت ہی بتائے گا، اگر تمہارے بھائی آیان نے رشتے سے انکار کر دیا تو پھر تم کو میرا ساتھ دینا ہوگا، تم میرے پاس آ جانا ہم دونوں نکاح کر لیں گے ورنہ میں کبھی بھی شادی نہیں کروں گا''۔ شایان نے جاندار مسکراہٹ کے ساتھ اپنا فیصلہ لائبہ کو سنایا اور فون بند کر دیا۔ لائبہ ہکا بکا سی موبائل کو تک رہی تھی کہ آیان کمرے میں داخل ہوا تھا۔

''لائبہ بیٹا! فون کی طرف ایسے کیا دیکھ رہی ہو، کیا کسی فرینڈ کا میسج پڑھ رہی ہو''۔ آیان نے بیڈ کے ساتھ لگی سیٹی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''آیان بھائی مجھ... مجھ، مجھے آپ سے ضروری... بات کرنی ہے''۔ لائبہ نے بمشکل اٹکتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

''کیا بات ہے بیٹا! خیریت ہے تمہارے ماتھے پر پسینے کیوں آنے لگے ہیں، بیٹھو''۔ پاس رکھی ٹیبل پر جگ سے پانی گلاس میں ڈال کر لائبہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آیان بھائی! مجھے کوئی پسند کرتا ہے اور آج وہ آپ سے میرا رشتہ مانگنے آنے والے ہیں''۔ پانی کا گھونٹ حلق میں اتار کر ایک ہی جھٹکے میں لائبہ بول کر چپ ہو گئی تھی کہ سامنے بھائی کا ردعمل دیکھنا تھا۔

''اچھا... تو اس میں ڈرنے والی کون سی بات ہے لیکن افسوس مجھے شہریار افتخار کا دل توڑنا پڑے گا، بے چارا تمہاری آس لگائے بیٹھا ہے کہ تم کب اپنی تعلیم پوری کرتی ہو اور وہ تم کو بیاہ کر لے جائے۔ خیر تم اب بڑی ہو گئی ہو اپنے فیصلے خود کر سکتی ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں، آج تمہارے وہ کو دیکھ لیں گے''۔ تھوڑی ناراضی تھوڑی سنجیدگی کے ساتھ آیان جملہ کہہ

کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆.........☆.........☆

''شام ڈھل چکی ہے رات ہونے والی ہے ڈنر کا انتظام بھی ہے مگر تمہارے مہمان کا کچھ پتہ نہیں، جب وہ آ جائے کیا نام بتایا تھا اس کا''۔ اس سے پہلے لائبہ کچھ کہتی ڈور بیل پر لائبہ کے قدم خود بخود دروازے کی طرف چل پڑے، نوکر کھانے کی میز سجانے لگے۔

آنے والا کوئی اور نہیں شایان بخاری تھا جو فتح مند مسکراہٹ کے ساتھ لائبہ کے ہمقدم چل کر آ رہا تھا۔

''وہیں رک جاؤ! خبردار جو ایک قدم بڑھایا تو جان سے مار دوں گا، تم نے لائبہ کے بارے میں سوچا بھی کیسے شایان بخاری''۔ غصے سے بے قابو ہوتا آیان نے شایان کے پاس جا کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

''ہاتھ اٹھانا مجھے بھی آتا ہے مسٹر شایان شاہ! کرنی کے پھل تو بھگتنے ہی ہوتے ہیں، اس وقت تو میں جا رہا ہوں مگر فتح مند ہو کر جا رہا ہوں۔ سوئٹ ہارٹ لائبہ یاد ہے ناں اپنا فیصلہ''۔ شایان آیان کی گرفت سے اپنے گریبان کو چھڑا کر لائبہ کی طرف ایک آنکھ دبا کر چلا گیا۔

غصے میں پیچ و تاب کھاتے آیان نے لائبہ کو ہونقوں کی طرح جاتے ہوئے شایان اور کبھی آیان کی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا۔

''لائبہ! بس بہت پڑھ لی تم نے پڑھائی، اب تمہاری شادی صرف شہریار سے ہی ہو گی''۔ آیان نے دوٹوک لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا۔

''لیکن بھائی! ایسا نہیں ہو سکتا، میں شایان سے ہی شادی کروں گی''۔

چٹاخ... آیان کا ہاتھ لائبہ کے گال پر پڑ چکا تھا، آیان نے اپنا ہاتھ کرسی پر مارا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆.........☆.........☆

پروگرام کے مطابق رات کی تاریکی میں لائبہ چپ چاپ باہر نکل آئی جہاں شایان اپنی کار کے ساتھ کھڑا اس کا منتظر تھا۔ لائبہ کار میں آ کر شایان کے ساتھ بیٹھ گئی تھی اور شایان نے گاڑی آگے بڑھا دی، کچھ دور کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ایک پجارو نے ان کا راستہ روک لیا۔ شایان نے کار روک دی اور نیچے اتر آیا، پجارو سے کوئی اور نہیں آیان شاہ اترا تھا اور شایان کی طرف بڑھا تھا۔

''تمہاری یہ جرات میری بہن کو بھگاؤ گے، کیا کرنا چاہتے تھے اس کے ساتھ''۔ آیان اور شایان کی جھڑپ شروع ہو چکی تھی۔

''آج عظمت جس جگہ ہے ان سب کی وجہ تم ہو''۔ شایان نے آیان پر مکا جڑ کر کہا۔

آیان کہاں پیچھے رہنے والوں میں سے تھا اس نے شدید جوابی کارروائی کرتے ہوئے شایان کو پیچھے دھکا دے دیا۔ شایان کا سر پتھر سے ٹکرایا تھا اور وہ وہیں بے ہوش ہو گیا، پھرتی سے آیان نے لائبہ کو کار سے نکالا۔

''بھائی! میں شایان کو ایسے نہیں چھوڑ سکتی، میں شادی کروں گی تو صرف شایان سے''۔ آیان اس کی باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اسے گھسیٹتے ہوئے پجارو میں بیٹھ گیا تھا اور پجارو کا رخ گھر کی طرف موڑ لیا، رات کو ہی آیان لائبہ کو لے کر بسنت پور کے لئے روانہ ہو گیا۔

☆.........☆.........☆

''کسی طوطے کی طرح شایان، شایان کی رٹ لگا رکھی ہے تم نے، بس اب بہت سن لی میں نے تمہاری بک بک، تمہاری شادی شہریار سے ہو گی، تم نے اگر میری بات نہیں مانی تو میں تمہاری چمڑی ادھیڑنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا، شہریار آنے

والا ہے''۔ بسنت پور پہنچتے ہی لائبہ کی من مانی اور ضد کو دیکھتے ہوئے آیان نے لائبہ کو کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ دو دن گزر چکے تھے۔ شدت غیرت میں آ کر آیان نے چابک اٹھایا تھا اور پھر کب بے ہوش ہو گیا پتہ نہیں چلا۔

لائبہ سوچوں سے نکل آئی اور اس بے ہوش انسان پر نظر کی جو اب ہوش میں آ رہا تھا، آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھا اور ایک بار پھر کہا۔

''ضدمت کرو کھانا کھالو اور شہریار سے شادی کر لو۔ تم جانتی نہیں ہو اسی میں تمہاری بھلائی ہے''۔ آیان نے آنکھوں میں آئی نمی کو اندر سموتے ہوئے کہا۔

''آیان بھیا! شایان سے...'' لائبہ کو ہاتھ کے اشارے سے آگے بولنے سے منع کیا۔

''انگارے مانگ رہی ہو، ہونہہ...'' آیان باہر نکل گیا۔

صبح شہریار کھانا لے کر اندر آیا تھا جس کو دیکھ کر لائبہ نے منہ بسور لیا۔

''دیکھو لائبہ! میں جانتا ہوں تم مجھے پسند نہیں کرتیں، میں تم سے شادی کرنے سے انکار کر دوں گا، بس تم کھانا کھالو''۔ شہریار نے لائبہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ایک تو مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا بھائی کو شایان سے کیا بیر ہے''۔ لائبہ اپنے آپ ہی بڑبڑائی۔

''تم شایان بخاری کی بات کر رہی ہو، جو عظمت کا بھائی ہے''۔ لائبہ نے حیرت سے شہریار کو دیکھا۔

''تمہاری گتھی ہی سلجھانے آیا ہوں لیکن پہلے کھانا کھاؤ''۔ ناچار لائبہ نے اصل بات جاننے کے لئے دو تین نوالے منہ میں ڈالنا شروع کیے۔

☆.........☆.........☆

''میں آیان شاہ اسمارٹ، ہینڈسم، cool اور وہ شایان بخاری تمہارا بھائی اسٹوپڈ، ایڈیٹ، فول''۔ آیان اور عظمت ایک ساتھ یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں بیٹھے کولڈ ڈرنک پی رہے تھے اور آیان عظمت کو شرارت سے تنگ کر کے محظوظ ہو رہا تھا۔

''خبردار جو شایان بھائی کو کچھ کہا''۔ عظمت زچ ہو گئی تھی۔

''بھئی تمہارے بھائی کا لڑکیوں کے دلوں سے کھیلنا اور پھر توڑ دینا ایک مشغلہ ہے، اوپر سے موصوف مجھے اپنے جیسا سمجھتے ہیں، کل ہی اس سے میں نے تمہارا ہاتھ مانگا تھا مگر اس نے تو میری پٹائی کر دی۔ کہہ رہا تھا تمہارے آس پاس نہ دِکھوں''۔ آیان کی خجالت دیکھنے لائق تھی۔

''تو پھر کیا کریں، اگر میرے بھائی اتنا ہی تمہارے لئے برے ہیں لڑکیوں کے لئے برے ہیں تو میں بھی بری ہی ہوں گی ناں، اب ہم نہیں ملیں گے''۔ عظمت نم آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر جانے لگی مگر آیان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس کرسی پر بٹھایا۔

''تم خود کو برا کیوں سمجھتی ہو، تم تو صندل، ہیرا، پارس ہو جسے کوئی بھی چھو لے تو کندن بن جائے، رہی تمہارے بھائی کی بات وہ تو کوئلہ ہے تم جیسے گلاب کے اطراف پھیلا ہوا کوئی کانٹا''۔

''بس آیان! مجھے پسند نہیں آتیں تمہاری یہ باتیں''۔ وہ خفا ہو رہی تھی۔ شایان کے خلاف ایک بات بھی سننے کو تیار نہ تھی۔

''آخر تم چاہتے کیا ہو شایان بھائی سے۔ وہ ایک بہن کے بھائی ہیں اور بھائی تو بہنوں کے لئے اپنے سے بڑھ کر اچھا سوچتے ہیں جیسے تم بھی ایک بہن کے بھائی ہو''۔ وہ آیان کو شرمندہ کر گئی۔

''اچھا بابا مان لیتا ہوں مگر بہن بیٹی والے بھی دوسروں کی بہن بیٹیوں کی قدر کرتے ہیں''۔ اس بار عظمت شرمندہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ اسے خود بھی

شایان سے یہ توقعات نہیں تھیں۔

''اب کیا کرنا ہے شایان بھائی تو تم سے اپنی خفگی ختم نہیں کریں گے''۔

''ٹیک اٹ ایزی، کل تم تیار رہنا ہم کل نکاح کر لیں گے، وہ پہلے تو تھوڑا سا ناراض ہوگا، بعد میں اپنی بہن کی خاطر یقیناً اس کی ناراضی خود بخود ختم ہو جائے گی''۔

''ریئلی آیان...'' وہ بچوں کی طرح خوش ہوئی تو آیان نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا تھا۔

☆............☆............☆

وہ نکاح کر کے واپس آ رہے تھے گاڑی آیان ڈرائیو کر رہا تھا۔

''اجلے نکھرے رنگوں سے مزین دلکش پیراہن روزانہ تمہارے وجود کا حصہ بن کر تمہیں جاذب نظر بناتے آ رہے ہیں، آج اس گلابی سوٹ، نفیس کڑھائی کے ساتھ تم روایتی خوشنما سا احساس دے رہی ہو، اب میری دلہن ہو جو میری آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے''۔ آیان مخمور لہجے میں بول رہا تھا اور عظمت کی پلکیں شرم سے جھک کر لرز رہی تھیں کہ اچانک ایک کار نے سامنے سے آ کر اُن کا راستہ روکا تھا اور وہ دونوں کار سے اترے تھے۔ آیان اور عظمت کے سامنے انہیں بے بس کرنے والی دیوار شایان غصے میں بپھرتا ہوا آیا تھا۔

''تم نے میری بہن سے نکاح کیا؟'' آیان کے ایک جھانپڑ رکھتے ہوئے شایان غرایا۔

''تمہاری مجھ سے یہ اکڑ اور نخوت اب بھی نہیں جائے گی تو کب جائے گی''۔ آیان اور شایان میں ہاتھا پائی شروع ہو گئی تھی مگر ان کے بیچ آنے والی عظمت کو شایان سے ایسا دھکا لگا کہ اس کا سر دیوار سے جا ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو گئی، آیان اور شایان کے تو ہاتھ پیر پھول گئے، دونوں عظمت کی طرف بڑھے تھے شایان نے آیان کو پرے دھکیلا تھا، دونوں آگے پیچھے اپنی گاڑیوں میں ہسپتال پہنچے تھے۔ بدقسمتی سے عظمت کوما میں چلی گئی۔

''شایان نے اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے آیان کا ہسپتال جانا بند کروا دیا تھا، وہ عظمت کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنے ہونٹوں پر جھوٹی مسکراہٹ سجائے وہ تمہارے لئے جی رہا ہے، شایان صرف تمہارے ذریعے آیان سے بدلہ لینا چاہتا ہے''۔ شہریار نے ساری روداد لائبہ کے گوش گزار کر دی تھی اور اپنے کوٹ کی جیب سے عظمت اور آیان کی ایک ساتھ کھینچی ہوئی تصویر دکھائی۔

''شایان تم اتنا بڑے دھوکے باز، فریبی اور ظالم ہو، میرے بھائی آیان اتنے مظلوم ہیں جن پر ظلم کرنے کی آخری کوشش مجھے مہرہ بنا کر کی''۔ شایان کا اصلی چہرہ پہچان کر اس کے پیروں سے زمین نکل رہی تھی۔

''میں آیان بھائی اور عظمت بھابی کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتی ہوں، اس کے لئے شہریار مجھے آپ کے ساتھ کی ضرورت ہے''۔ لائبہ آیان اور عظمت کو تصویر میں ایک ساتھ کھڑے دیکھ کر کچھ سوچ کر بولی تھی۔

''میں تمہارے اس نیک کام میں پیش پیش رہوں گا لیکن اس بارے میں تم نے کچھ سوچا بھی ہے''۔ اس نے پوچھا۔

''ہاں میرے ذہن میں ایک اسکیم آئی ہے''۔ اس نے بتایا اور اسے پروگرام کے بارے میں آگاہ کرتی چلی گئی۔

☆............☆............☆

''آیان بھائی! مجھے آج آپ کے درد کا اندازہ ہوا ہے مگر آپ اب میرے لئے اتنے فکرمند نہ ہوں، میں آپ کو اپنی ذات سے کوئی دکھ نہیں پہنچاؤں گی''۔ شہریار ہی لائبہ کو کوٹھڑی سے نکال کر حویلی کے اندر لایا تھا۔ راہداری سے گزر کر لان میں صوفے پر غصے میں

بیٹھے آیان کو لائبہ نے کہا تھا۔

''ادھر آؤ لائبہ! میری جان''۔ آیان کا غصہ لائبہ کی بات سے اڑنچھو ہوا تھا اور آنکھیں نم ہو گئی تھیں کیونکہ دوسری طرف شہریار نے آیان کو تسلی بخش اشارہ کیا تھا اس لئے اپنی بانہیں لائبہ کے لئے پھیلائی تھیں۔

''آیان بھائی! مجھے معاف کر دیں''۔ لائبہ آیان کے سینے سے لگی رو رہی تھی۔

''بس بس، اب میں اپنی بہن کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھنا چاہتا''۔ اپنی ہتھیلی سے لائبہ کی آنکھوں سے آئے آنسو صاف کرتے ہوئے آیان نے کہا۔

''تو پھر آپ میری بات مانئے، ہمارے پیپر ہونے والے ہیں، کراچی چلتے ہیں''۔ آیان لائبہ کو بغور تشویش سے دیکھنا لگا

''تم بدگمان نہ ہونا آیان! میں لائبہ کے ساتھ ساتھ رہوں گا، تم دونوں اکیلے نہیں ہو اور شایان کی فکر نہ کرو''۔ شہریار نے آیان سے کہا۔

''ہاں آیان بھائی! ابھی کچھ ادھورے کام ہیں انہیں نمٹانا ہے، اس میں شہریار میری مدد کرے گا''۔ لائبہ نے بتایا۔

''ہوں...'' آیان جس کے انداز میں ایک دم ڈھیروں خدشے آٹھہرے تھے جو شہریار کی بات پر سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''ٹھیک ہے ہم کل ہی کراچی کے لئے نکلتے ہیں''۔ آیان سنجیدگی سے کہتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆..........☆..........☆

پیپرز شروع ہونے میں ایک مہینہ تھا۔ شہریار لائبہ کو یونیورسٹی میں چھوڑ کر نظروں میں رکھتا۔ آیان شہریار کی وجہ سے بے فکر ہو گیا۔

''لائبہ آج تم یونیورسٹی کیوں نہیں جا رہی ہو، کوئی پرابلم ہے؟'' آیان کے الفاظ پر لائبہ ٹھٹکی۔

''اف آیان! اب لائبہ کی فکر چھوڑ دو، وہ میرے ساتھ جا رہی ہے، کہاں یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں، تم یونیورسٹی جاؤ''۔ شہریار نے تنگ آ کر آیان کو ہلکا سا مصنوعی ڈپٹا، آیان مسکرا کر چلا گیا۔ جو ابھی کچھ دیر پہلے اچھا خاصا الجھ گیا تھا۔

☆..........☆..........☆

''اب تو میرے اور تمہارے پیپر بھی ساتھ خیریت سے گزر گئے، شہریار نے اچھا ساتھ دیا، شایان کی طرف سے بھی کوئی پیشرفت دیکھنے میں نہیں آ رہی''۔ آیان لائبہ اور شہریار کو ایک ریسٹورنٹ میں لے آیا تھا اور خاصا خوش دکھائی دے رہا تھا مگر دل ابھی بھی افسردہ تھا جس کا اس کی آنکھوں سے پتہ چل رہا تھا۔ لائبہ نے ایک گہرا سانس لیا۔

''آیان! اب تمہیں اپنی یہاں کی فیکٹری بھی سنبھال لینی چاہئے''۔

''ہاں ہمارے منیجر ولید انکل نے فیکٹری سنبھالی ہوئی ہے، میں ان سے رابطے میں بھی رہا ہوں لیکن سوچتا ہوں کہ بسنت پور... دیکھو ابھی لائبہ کی پڑھائی ادھوری ہے، اس کے بی ایس سی کا فائنل ایئر شروع ہوا ہے''۔

''اور تم دونوں کی شادی بھی تو کرنی ہے۔ شایان سے کچھ بعید نہیں وہ کیا کرے''۔

''آیان! میں تم دونوں بہن بھائی کا دوست ہوں اور رشتے میں کزن، کیا میں تم لوگوں کے حق میں کچھ غلط ہوتے دیکھ سکتا ہوں''۔ آیان نے اسے بغور دیکھا اور پھر دھیرے سے مسکرا دیا۔

''آپ پریشان نہ ہوں مگر میں عجلت میں کوئی بھی قدم نہیں اٹھانا چاہتا، پلیز ابھی آپ اس کے لئے مجھے اور لائبہ کو فورس مت کریں''۔

آیان اب بے فکر دکھائی دے رہا تھا۔

☆..........☆..........☆

چھ مہینے بعد۔

''شایان صاحب! آپ کے لئے خوشخبری ہے آپ کی بہن عظمت کو ہوش آ گیا ہے''۔ ڈاکٹر اقبال نے ہی شایان کو فون پر بتایا۔

''میں آ رہا ہوں''۔ خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے اپنے آفس سے شایان نکلا اور جلد ہی ہسپتال پہنچا تھا۔

عظمت کسی نقاب پوش لڑکی سے باتیں کر رہی تھی جس کے ساتھ شہریار کھڑا تھا۔

''عظمت میری جان، میری بہن تمہیں ہوش آ گیا۔ اوہ! میں کتنا خوش ہوں تمہیں اس طرح زندگی کی طرف لوٹ آنے پر دیکھ کر عظمت''۔ عظمت جو ابھی اس نقاب پوش لڑکی سے باتیں کر رہی تھی، شایان کو دیکھ کر زبردستی مسکرائی تھی، ڈاکٹر اقبال بھی وہیں موجود تھے۔

''ڈاکٹر صاحب! میں آپ کا بڑا مشکور ہوں آپ نے تو کمال کر دیا''۔ شایان جذباتی ہو رہا تھا اور آنکھوں میں نمی تھی۔

''مسٹر شایان بخاری! شکریہ کا حق دار میں نہیں یہ لڑکی ہے جو آپ کی غیر موجودگی میں عظمت کی خدمت و کیئر کرتی آئی ہیں، میں تو کہتا ہوں یہ آپ کی محسن ہیں''۔ ڈاکٹر اقبال نے نقاب پوش لڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا جو اٹھ کر جانے لگی تھی۔

''رک جاؤ لائبہ!'' عظمت نے نقاب پوش لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر روکا تھا اور چہرے سے نقاب ہٹا دیا تھا۔ شایان حیران و ششدر سا دیکھ رہا تھا۔

''ہاں شایان بھائی! آپ کی بہن کو اللہ کے فضل سے زندگی تک لانے میں کوئی اور نہیں آیان کی بہن لائبہ ہے، دن رات خدمت کی ہے اس نے میری''۔

''تم نے میری بہن اور میرے ساتھ کتنا اچھا سلوک کیا اور میں نے... خیر میرا جرم ناقابل معافی ہے، تم اتنا بتاؤ اس کے بدلے مجھ سے کچھ چاہتی ہو تو بولو میں اپنی تمام دولت تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا''۔

''کتنی چھوٹی بات کی ہے آپ نے، دولت کی تو مجھے کمی نہیں، ہاں اگر اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتے ہیں تو عظمت بھابی کو رخصت کر دیں''۔ شایان بخاری خاموش ہو گیا۔

''لگتا ہے بہت بڑی چیز مانگ لی ہے میں نے آپ سے، آپ کی خاموشی بتا رہی ہے کہ آپ کو اس سے انکار ہے، خیر اتنا خودغرض انسان میں نے کہیں نہیں دیکھا اور نہ ہی آگے زندگی میں دیکھنا چاہتی ہوں''۔ یہ کہہ کر لائبہ اور شہریار رکے نہیں چلے گئے۔

☆........☆........☆

عظمت گھر آ چکی تھی جو شایان بھائی، شایان بھائی کہتے تھکتی نہ تھی، کھانے پر بھی شاپنگ کرتے ہوئے ہلکی پھلکی شرارت سے عظمت شایان کو خوش دکھائی دینے کی کوشش کرتی تو شایان اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑا ہو جاتا۔

''کیا دے رہا ہے اپنی بہن کو اور کیا چھین رہا ہے اپنی بہن سے، طلاق کے کاغذات تو تو پہلے ہی تیار کرا چکا ہے، دیکھا جائے آیان بھلا مانس لڑکا ہے، عظمت سے محبت کرتا ہے اور لائبہ جو اپنے بھائی کے لئے اتنا سب کچھ کر سکتی ہے، جس نے میرے فریب سے زخم کھائے وہ میری بہن کو کتنی عزت دیتی ہے، اور عظمت اس کی چاہت تو صرف آیان ہے، جس میں دیکھا جائے تو کوئی برائی نظر نہیں آتی، اس کی پرسنیلٹی پر لڑکیوں کو عشق میں پڑتے دیکھا ہے مگر وہ ایک نگاہ الفت بھی ان کی طرف نہیں اٹھاتا، وہ میری طرح نہیں ہے ورنہ میرے اقدام پر عظمت کو ضرور نقصان پہنچا سکتا تھا''۔

☆........☆........☆

ابھی بھی صبح آٹھ بجے اورنج جوس کا گلاس لئے عظمت شایان بخاری کے پاس آئی تھی۔

''عظمت! چلو میرے ساتھ''۔

''کہاں شایان بھائی؟''

عظمت کو گاڑی میں بٹھا کر گاڑی آیان کے بنگلے پر آکر رکی تھی۔ اتوار کا دن تھا۔ آیان، لائبہ اور شہریار گھر پر ہی تھے۔

''آیان، آیان''۔ عظمت کو ہاتھ سے پکڑ کر شایان بخاری چلا رہا تھا۔

آیان اپنے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

''کیا بات ہے کیوں چلا...''

''عظمت! تم ہوش میں آ گئیں؟'' آیان سیڑھیاں عبور کر کے نیچے لان میں آکر عظمت کی طرف لپکا۔ لائبہ اور شہریار بھی آوازیں سن کر اپنے کمروں سے باہر نکل آئے تھے۔

''آیان! اپنی امانت کو کب لینے آؤ گے یا یونہی لو گے''۔ آیان سرپرائز ہوا شایان کی کایا پلٹ پر۔

''آپ لوگ رخصتی کی تاریخ طے کریں میں منہ میٹھا کروانے کے لئے باورچی خانے میں جاتی ہوں''۔ حیرت و خوشی میں گھرے آیان کو لائبہ نے کہا اور چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں ٹرے میں لوازمات لے کر آئی تھی۔

شایان، آیان، عظمت اور شہریار میں خوب اچھے موڈ میں گفتگو ہو رہی تھی۔ لائبہ نے ٹرے وہیں رکھی اور شہریار کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ شایان کے دل پر نجانے کیوں دھچکا پڑا۔

☆..........☆..........☆

رخصتی کا دن آ پہنچا تھا۔

''شہریار! میں سوچتا ہوں آج ہی تمہاری اور لائبہ کی منگنی کا اعلان کر دوں''۔ شیروانی میں ملبوس دلہا بنا شہریار سے لائبہ کی موجودگی میں آیان نے کہا۔

''آیان! میں لائبہ کی پسند نہیں ہوں، اب تو میں اپنی خالہ زاد کزن سے شادی کرنے والا ہوں کیونکہ میں نے لائبہ کو چاہا وہ مجھے نہیں مل سکتی، جبکہ میری خالہ زاد سحر مجھے پسند کرتی ہے، چاہنے سے چاہے جانے کا احساس الگ ہی ہوتا ہے، تم برا مت ماننا آیان''۔

آیان کو احساس ہوا تھا کہ اس کی اور عظمت کی محبت میں لائبہ کس حد تک پس گئی تھی، کہ اب آیان کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی تھی۔

''آیان! آپ فکر نہ کریں ابھی عظمت بھابی کو لینے چلتے ہیں وہی اب لائبہ کے لئے دولہا تلاش کریں گی''۔ شہریار نے بغور آیان کو فکرمند دیکھا تو بولا۔

رخصتی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ عظمت کو رخصت کرتے وقت شایان نے لائبہ کے ہاتھ میں ایک گفٹ تھمایا تھا۔

''یہ آپ کے لئے خاص''۔ لائبہ نے سپاٹ انداز میں گفٹ رکھ لیا تھا۔ اتنے مہمان تھے ورنہ اس کا دل چاہا تھا کہ اس کا گفٹ اس کے منہ پر دے مارے جس کے ساتھ ابھی بھی اس کی گرل فرینڈز تتلیوں کی طرح منڈلا رہی تھیں۔

''تو یہ تھا وہ کھلونا جس سے تم اپنا دل بہلایا کرتے تھے''۔ یہ شایان کی گرل فرینڈ سونیا تھی جو اکثر و بیشتر اس کے ساتھ نظر آتی تھی۔ کھانے کے وقت ہی اس کے پاس سے گزرتے ہوئے سونیا نے جملہ کسا تھا جس پر لائبہ نے صبر کے گھونٹ پیے تھے۔ شایان سونیا کے الفاظ پر ششدر رہ گیا تھا۔

☆..........☆..........☆

ولیمہ Reception کی تقریب بخیریت ہوئی تھی جس میں عظمت گرین کلر کا شرارہ پہنے ہوئے تھی جس پر گولڈن کلر کا نفیس کام ہوا تھا، آیان بلیک کلر کا کوٹ پینٹ شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ جو بھی

دیکھتا جوڑی کو سراہے بغیر نہ رہتا۔ ان کے ایک طرف خوش دکھائی دینے والی لڑکی لائبہ فیروزی کلر کا بائیس کلیوں والا انگرکھا پہنے ہوئے تھی جس پر سلور نفیس کام ہوا تھا، شایان اس کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کی سوچوں کا محور لائبہ تھی جس کے پوزیٹو یا نیگیٹو ردعمل کا انتظار کر رہا تھا۔ تقریب کا اختتام جلد ہی ہو گیا تھا۔

☆............☆............☆

صبح عظمت اور آیان، لائبہ کے ساتھ ایئرپورٹ آئے تھے، شایان کو سی آف کرنے وہ آیان اور عظمت سے مل کر لائبہ کی طرف آیا تھا، جو ان سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی تھی۔

''مجھے لگتا ہے آپ نے میرا گفٹ کھول کر دیکھا تک نہیں ہوگا، اپنے کمرے کے ڈسٹ بن کی زینت مت بنائیے گا، اتنی لڑکیوں سے ملا ہوں مگر آپ کو ایک الگ اور ان سب سے منفرد شخصیت پایا ہے''۔

''آپ کی فلائٹ کا ٹائم ہو گیا ہے، اناؤنسمنٹ ہو رہی ہے''۔ عظمت نے شایان کے پاس آ کر کہا۔

''ہاں اناؤنسمنٹ ہو رہی ہے مگر لگتا ہے نجانے کیوں کوئی مجھے روکے گا ورنہ میں تو جا رہا ہوں ان جان راہوں میں نہ جانے کتنے سالوں کے لئے''۔ عظمت آیان کے پاس گئی تھی تب ہی شایان نے لائبہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''خوش فہمی ہے آپ کی ایسا سوچیں گے تو منہ کے بل گر جائیں گے، آپ یہاں سے ہی نہیں میری زندگی سے بھی ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں، مجھے خوشی ہے آپ کے جانے کی، اب میں آپ کی صورت کبھی نہیں دیکھوں گی''۔ ایسا لائبہ نے زبان سے نہ کہا بلکہ دل ہی دل میں شایان سے ہمکلام ہوئی تھی کیونکہ آیان اور عظمت ان کے قریب آ چکے تھے۔ لائبہ کی نم آنکھیں اور سپاٹ چہرہ دیکھ کر آیان ششدر رہ گیا۔

''سونیا تو پلین میں بیٹھ چکی ہے، ان کا میسج آیا ہے''۔ موبائل کی اسکرین پر نظر ڈال کر شایان نے کہا اور چلا گیا۔

☆............☆............☆

گھر پہنچتے ہی اپنے کمرے میں جا کر اپنے گلے اور کانوں سے آویزے نوچ کر پھینکے تھے اور اپنے بیڈ پر گر کر تکیے میں منہ چھپا کر لائبہ رونے لگی تھی۔ نہ جانے کیوں یہ آنسو دل کا غبار تھے جو تواتر سے بہہ رہے تھے۔ شوکیس پر رکھے منہ چڑاتے گفٹ پر نظر پڑی تو بے اختیار اس نے گفٹ کھول لیا، اس میں سونے کے کنگن رکھے ہوئے تھے اور ساتھ ہی ایک خط تھا جس کو کھول کر لائبہ نے دیکھا تھا۔

''لفظ کتنے ہی تیرے پیروں سے لپٹے ہوں گے
تو نے جب آخری خط میرا جلایا ہوگا
تو نے جب پھول کتابوں سے نکالے ہوں گے
دینے والا بھی تجھے یاد تو آیا ہوگا''

لائبہ میں تمہارے ایک ایک درد اور ایک ایک آنسو جو تنہائی میں تمہاری آنکھوں سے بہتے ہیں سے بخوبی واقف ہوں، میں نے تمہارا دل دکھایا ہے، تمہارے بھائی سے بدلہ لینے کے چکر میں تم جیسی معصوم لڑکی کے کانچ سے بنے دل کو چکنا چور کیا ہے، تم نے میری یاد مٹانے کی کوشش شروع کر دی ہوگی، مگر میں بھی ایک انسان ہوں، میرے سینے میں بھی دل ہے یہ کب تمہارا ہو گیا پتہ ہی نہ چلا۔ سونیا، سمیرا، سحرش، لیلیٰ ایسی کئی پریاں میرے اردگرد گھومتی ہیں مگر اب ان کی اصل حقیقت کہ وہ کاغذ کے پھول ہیں جن کی مہک میرے جیسے انسان کو تسخیر نہیں کر سکتی، تم تو وہ پھول ہو جس کے ہوشربا حسن و مہک نے میرا دل جھنجھوڑ

ڈالا ہے، اس سے میں واقف ہو گیا ہوں اور تم سے معافی چاہتا ہوں۔ یہ سونے کے کنگن ہمارے خاندانی کنگن ہیں یہ اگر تم رکھ لوگی تو میں سمجھوں گا کہ ابھی بھی میرے لئے تمہارے دل میں نرم گوشہ ہے، تم نے مجھے معاف کر دیا ہے، تم مجھے غلط مت سمجھنا میں تمہاری سیرت و اخلاق کے حسن و مہک کی بات کر رہا ہوں جو آج تک کسی لڑکی میں دکھائی نہیں دیئے، جن سے میں اب تک ملا ہوں۔ میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں''۔

''ڈھیٹ انسان ہو تم شایان، اتنی ہٹ دھرمی، میں تم سے نفرت کرتی ہوں اور یہ کنگن تمہارے خط کے ٹکڑوں کے ساتھ تمہیں لوٹاؤں گی، تمہارے سابقہ خطوط تو میں نے واقعی جلا دیئے ہیں مگر اب یہ آخری خط پھاڑ کر تمہیں واپس کروں گی، اس میں ہی میرا جواب ہوگا تم جیسے انسان کی اصلیت جاننے کے بعد تمہارا مکروہ چہرہ دیکھنے کے بعد مجھ جیسی لڑکی تم پر تھوکے گی بھی نہیں''۔ خط کے پرزے کر کے خود ہی بڑبڑاتی ہوئی لائبہ رونے لگی۔

''مگر لائبہ! شایان تمہاری پہلی خواہش ہے پہلا پیار ہے''۔ ذہن میں کہیں سے خیال کوندا تھا۔

''یہ میری پہلی اور آخری غلطی ہے، اب میرا وفا کا پیکر دل جفا کرے گا تم سے''۔ خود کو جواب دیتے ہوئے اپنی آنکھیں ہاتھوں سے رگڑ ڈالیں۔

☆..........☆..........☆

ڈھائی سال بعد۔

''لائبہ نے ایم ایس سی کر لیا اور کالج کی لیکچرار لگ گئی۔ ڈھائی سال سے شادی کرنے کو منع کرتی رہی وہ سب تمہارے بھائی کی وجہ سے ہوا ہے، اس نے میری بہن کے ساتھ اچھا نہیں کیا عظمت''۔

''مجھے احساس ہے اس بات کا مگر مجھے خوشی اُس وقت ہوئی جب میں لائبہ کے کمرے میں کسی کام سے گئی تھی، اس کے شوکیس میں ہمارے خاندانی کنگن دیکھے جس کا شایان بھائی نے مجھے ذکر کیا تھا، کہہ رہے تھے کہ بہت جلد یہ تمہاری ہونے والی بھابی کے ہاتھ میں ہوں گے''۔ عظمت نے خوشی سے بتایا۔

''مگر... لائبہ تو سخت ناراضی رکھتی ہے شایان بھائی سے''۔ عظمت نے دکھ سے کہا۔ عظمت اور آیان دونوں اس وقت لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''بھئی عظمت! تمہارے بھائی کی کم غلطی نہیں تھی، حق تو بنتا ہے میری بہن کی ناراضی کا۔ موصوف اب بھی لڑکیوں کے گھیرے میں نظر آتے ہیں''۔ آیان نے خفگی سے کہا اور میز پر پڑا ہوا اخبار اٹھا لیا جسے سرعت سے عظمت نے چھین لیا۔

''کیا کر رہی ہو یہ پڑھنے دو، حالات حاضرہ سے واقفیت ہونی چاہئے''۔ عظمت اخبار پیچھے کرنے لگی۔

''مجھے آپ کو ایک خوشخبری سنانی ہے، بھائی کل پاکستان آ رہے ہیں اور ایک خاص مقصد کے لئے آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا''۔ پھر آیان کے کان میں سرگوشی کرنے لگی۔ جسے سننے کے بعد آیان کے چہرے پر اطمینان اتر آیا جو نہ جانے کب سے لائبہ کے لئے مضطرب دکھائی دینے لگا تھا۔

☆..........☆..........☆

اس روز چھٹی تھی، لائبہ دن چڑھے گھر سے نکلی۔ ایک قریبی مارکیٹ سے اپنی ضروریات کی کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔

شاپنگ میں اسے خاصی دیر لگ گئی، اس وقت وہ ایک ہاتھ میں شاپنگ بیگ لٹکائے اور دوسرے میں

چند کتابیں تھامے ایک جنرل اسٹور میں ایک شوکیس پر جھکی ہوئی تھی جب ایک آواز سن کر گویا اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

''لائبہ....'' کہنے کو یہ صرف ایک لفظ تھا۔ اس کا نام تھا۔ اس نام سے دن میں بیسیوں افراد بیسیوں مرتبہ اسے پکارتے تھے مگر وہ ہرگز نہیں چونکتی تھی، وہ تو کسی بھی بات پر نہیں چونکتی تھی لیکن اس آواز کی بات ہی اور تھی۔ ڈھائی برس گزر گئے مگر وقت اس کے ذہن کی سوچ سے اس آواز کو کھرچ پھینکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ یہ آواز یہ لہجہ اسی طرح سماعت میں جاگزیں تھا جس طرح آج سے ڈھائی برس پہلے۔

اس لئے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ یہ آواز بھلا وہ اس وقت اور یہاں کیونکر سن سکتی تھی یقیناً اسے مغالطہ ہوا تھا مگر یہ مغالطہ بہت ہی خوفناک تھا، اس کے اعصاب کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی۔

تب اسے پکارنے والا اس کے برابر آن کھڑا ہوا، لائبہ نے دھیرے دھیرے نظر اٹھائی، شایان بخاری واقعی اس کے پاس کھڑا تھا، وہی وجیہہ اور خوش لباس، بارعب شخصیت جس کی آمد سے کبھی اس کے خیالوں کی راہ گزر پر جلترنگ سے بج اٹھتے تھے۔

اس دوران ایک سیلز مین ان کے قریب آگیا۔ شایان دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''آؤ لائبہ چلیں، مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے، آؤ''۔ وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ شایان اس کے شانہ بشانہ چل رہا تھا، باہر آ کر وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''ادھر چلو میری گاڑی ادھر کھڑی ہوئی ہے، چل کر کہیں بیٹھتے ہیں، کافی یا چائے پیتے ہیں''۔

''آپ کو شاید معلوم نہیں میں اپنی گاڑی میں یہاں مارکیٹ آئی تھی، مارکیٹ میں تماشا نہ بنے اس لئے میں آپ کی بک بک برداشت کرتی رہی، ہاں اگر آپ میرے گھر چلیں تو میں آپ سے آخری حساب کتاب کروں گی''۔ لائبہ غصے میں بولی اور خاموشی سے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر آگے بڑھ گئی۔

☆..........☆..........☆

لائبہ گھر پہنچ گئی تھی، پیچھے شایان بخاری بھی آ پہنچا تھا، آیان اپنے اسٹڈی روم میں تھا اور عظمت باہر لان میں مل گئی۔

''ارے لائبہ! یہاں صوفے پر بیٹھو، شایان بھائی سے باتیں کرو میں تمہارے لئے چائے لاتی ہوں، شاپنگ کر کے تھک گئی ہو گی''۔ عظمت نے لائبہ کا غصہ بھانپ لیا تھا اور شایان کے اشارے پر ان دونوں کو اکیلا لان میں چھوڑ کر چلی تھی۔

''لائبہ! میری بات سنو، میں کل ہی لندن سے آیا تھا آج عظمت نے بتایا کہ تم مارکیٹ گئی ہوئی ہو تو تمہاری واپسی کا انتظار کرنے کے بعد میں خود ہی تمہیں لینے پہنچ گیا، تم سے ملنے کے لئے اتنا بے چین ہوں اور تم کترا رہی ہو''۔

''مسٹر شایان بخاری! آپ کا لڑکیوں سے جی نہیں بھرا کہ آپ فلرٹ کرنے میرے پاس آگئے۔ ایک منٹ!'' لائبہ اپنے کمرے سے تھوڑی دیر میں کنگن اور کاغذ کے ٹکڑے لے آئی۔

''یہ تمہاری امانت اور جواب تمہیں دے رہی ہوں شاید آپ اسی سلسلے میں میرے پاس آئے ہیں''۔ کنگن اور خط کے ٹکڑے شایان کے اوپر اچھال کر لائبہ خفگی سے بولی تھی۔ شایان نے تاسف سے لائبہ کو دیکھا۔

''لائبہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں''۔ پیروں پر پڑے کنگن اٹھا کر لائبہ کی طرف بڑھاتے ہوئے شایان نے کہا۔

"میرے دل میں آج ایک خلش ہے خلا ہے ایک سوال ہے، آخر یہ سونیا اور ان لڑکیوں کا کیا مقام ہے جو اپنے خط میں ان کے نام لئے تھے، کیا ان سب سے آپ کا دل بھر گیا اور سونیا جس کے ساتھ آپ لندن گئے تھے اس نے آپ کو چھوڑ دیا ہے"۔ وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

"سونیا میرے دوست کی بیوی ہے میری بزنس پارٹنر، اس کے سسر کی طبیعت خراب ہے، میرا دوست اپنے باپ کی کیئر میں لگا ہوا ہے اور سونیا میرے ساتھ مل کر بزنس کر رہی ہے، میں اس کی بہت عزت کرتا ہوں"۔

"اور آپ کی وہ گرل فرینڈز میرا، سحرش، لیلیٰ وہ پریاں جو آپ کے اردگرد گھومتی ہیں، وہ سب کیا ہے"۔ لائبہ نے نخوت سے سوال کیا۔ شایان مسکرا دیا۔

"دیکھو! وہ سب کچھ نہیں ہے لڑکیاں خود آتی ہیں اور ان سے میری دوستی رہی ہے اس سے آگے کچھ نہیں"۔

"دوست، دوست کی جگہ رہنی چاہئے ان سب سے شادی تو نہیں کرسکتا، محبت میں تم سے کر بیٹھا ہوں"۔ شایان نے زیرلب کہا۔

"آپ کا دل جفا کا پیکر ہے، ہر کسی سے جفا کی ہے، میں آپ کو کبھی معاف نہیں کرسکتی"۔ دوٹوک لہجے میں کہہ کر لائبہ رونے لگی۔

"تمہارے آنسو بتا رہے ہیں کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم نے اب تک شادی نہیں کی اور میں..."

"اور آپ کو کوئی بھی لڑکی شادی کے لائق نہیں سمجھتی ہوگی"۔ لائبہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"مجھے لڑکیوں کی کمی نہیں، مگر کیا کروں میرا جفائے دل تم سے وفا کر بیٹھا ہے، یہ کہیں لگتا ہی نہیں، میں نے ڈھائی سال کا عرصہ سونیا کی مدد کرتے ہوئے گزارے ہیں اور تم پر یہ ظاہر کرنا چاہ رہا تھا کہ اس میں انٹرسٹڈ ہوں، میں تو لڑکیوں سے دوستی کرنے کا مشغلہ کب سے ختم کرچکا ہوں، جب سے تم کو اپنا مانا ہے، مگر لگتا ہے تم کو یقین نہیں آرہا۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں اگر تم کو یقین ہو تو یہ کنگن پہن لینا"۔ یہ کہہ کر شایان دروازے کی طرف بڑھا اور چند قدم چلنے کے بعد رک کر مڑ کر دیکھا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، لائبہ ایک ہاتھ میں کنگن لئے دوسرے ہاتھ میں کنگن پہن رہی تھی۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔

"شایان! میں تم سے کبھی جفا نہیں کرسکتی، میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوگئی ہوں مگر تمہیں مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا یہ ادھر اُدھر تتلیوں کو اپنے گرد گھمانا چھوڑ دو"۔

"ہاہاہا!" شایان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"پگلی وہ دوست تھیں اور تم ان سب سے الگ ہو"۔

"اب بس، اب میری بھابی کو تنگ مت کرنا شایان بھائی، شادی کی تیاری کرتے ہیں"۔ آیان اور عظمت کب سے ان کی باتوں کو سن کر محظوظ ہو رہے تھے۔

سب سیڑھیاں عبور کر کے نیچے آگئے۔ لائبہ کے گال شرم سے گلنار ہوگئے تھے، شایان کا دل مسرت سے بھر گیا تھا، اس نے تہیہ کرلیا تھا وہ اس کانچ کی گڑیا کا کانچ سے بنا دل اب ٹوٹنے نہیں دے گا اس لئے اپنے دل میں خود ہی ہمکلام ہوا تھا۔

"اے میرے دل جفا پر مت اکسانا، وفا کا ارادہ قائم رکھنا، لائبہ وفا کی مثال ہے"۔ لائبہ کے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر جن میں اس نے کنگن پہنے ہوئے تھے، شایان کے لبوں پر وفائے تسکین کی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆.........☆.........☆

افسانہ

ٹیس

شریفاں ست قدموں سے چلتے ہوئے اپنے محلے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس محلے کی تنگ و تاریک گلیوں میں دن کے وقت بھی تاریکی کا راج ہوتا تھا۔ سورج کی روشنی ان تنگ گلیوں کے نکڑوں پر پہنچ کر یوں رک جاتی جیسے اس سے آگے کوئی ایسی رکاوٹ لگی ہو جسے پار کرنا اس کے بس میں نہ ہو۔ ان گلیوں کے ٹوٹے پھوٹے کچے مکانات ایک دوسرے کے ساتھ یوں سر جوڑے کھڑے تھے جیسے اپنے خستہ حال مکینوں کے مسائل کے حل پر غور وفکر کر رہے ہوں۔ شریفاں اب اپنی گلی میں پہنچ چکی تھی۔ وہ اس گلی کے ایک ڈربے نما مکان میں اپنی شوہر اور بچوں کے ساتھ کرائے پر رہتی تھی۔ آج وہ معمول سے بہت لیٹ تھی مگر اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے گھر پہنچنے کی کوئی خاص جلدی نہ ہو۔

''اماں میرا انار لائی ہو؟'' شریفاں نے تھکن سے چور بدن کے ساتھ گھر میں قدم رکھا تو گڈو کی آواز نے اس کے قدموں کو مزید ست کر دیا۔ اس نے صحن میں بچھی جھلنگا سی چارپائی پر بیٹھ کر اپنی چادر اتاری اور اس سے اپنے چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھ کر اسے اپنی گود میں رکھ لیا۔ گڈو اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ہاں صدقے! کل تیرے لیے ضرور انار لے آؤں گی۔'' اس نے گڈو کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر اس سے ایک بار پھر جھوٹا وعدہ کیا۔

''اماں! تو ہر روز ایسے ہی کہتی ہے۔'' وہ اس کے ہاتھ ہٹا کر دور جا بیٹھا۔

''گڈو کئی دنوں سے انار کھانے کی ضد کر رہا تھا۔ اس کو انار بہت پسند تھے۔ شریفاں کا شمار ہمارے ملک کے ان لوگوں میں ہوتا تھا جو دو وقت کی روٹی بھی بمشکل پوری کر پاتے ہیں۔ شریفاں کا پورا کنبہ زندہ رہنے کے لیے تگ و دو میں مصروف تھا۔ گڈو اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس سے بڑی چار بہنیں تھیں جن میں سے دو کی شادی کم عمری میں کر دی گئی تھی اور چھوٹی دونوں ایک فیکٹری میں کام کرنے لگی تھیں۔ دونوں مل کر چھ ہزار روپے کما لیتی تھیں۔ تین ہزار روپے شریفاں کو ملتے تھے۔ وہ ایک گھر میں کل وقتی ملازمہ تھی۔ شریفاں نے گڈو کے حوالے سے بہت سے خواب دیکھ رکھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے غربت کے باوجود اپنے بیٹے کو اسکول میں داخل کروایا تھا۔ وہ پڑھائی میں بہت اچھا تھا اور چوتھی جماعت میں پڑھ رہا تھا۔

شریفاں ہر سیزن میں کسی نہ کسی طرح گڈو کو دو تین دفعہ انار ضرور کھلا دیتی تھی مگر اس دفعہ گھر کے کرائے اور بلوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ مسلسل بڑھتی ہوئی مہنگائی نے ایسی کمر توڑی تھی کہ وہ بلبلا اٹھی تھی۔ اب مہینے کے آخر میں اس کے پاس اتنے اضافی پیسے بھی نہ تھے کہ وہ اس کے لیے آدھا



کلو انار ہی خرید لیتی۔

''نا میرا بچہ! کہا ہے نا کہ لا دوں گی انار، تو میری بات کا یقین کر پتر۔'' اس نے پھر گڈو کو پچکارا تو وہ ماں کے چہرے پر پریشانی اور بے بسی دیکھ کر بولا۔

''اچھا اماں، ٹھیک ہے۔'' وہ بات مکمل کر کے گھر سے باہر چلا گیا اور شریفاں بے دم ہو کر اسی چارپائی پر لیٹ گئی۔ وہ کتنے دنوں سے اپنے بچے کو جھوٹے وعدوں اور بہانوں سے بہلا رہی تھی۔

''ہائے ری غربت اور مجبوری! میں اپنے بچے کی ایک معصوم خواہش پوری کرنے کی سکت نہیں رکھتی۔'' اس نے اپنا چہرہ چادر سے ڈھانپ لیا۔

☆......☆

اگلے روز کام سے واپسی پر شریفاں پھلوں والی ریڑھی پر انار دیکھ کر رک گئی۔ اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے بندھے ہوئے بیس روپے کھولے۔ یہ روپے اس کے آج کے آنے جانے کا کرایہ تھا مگر آج اس نے وین پر آنے جانے کی عیاشی ختم کر کے یہ روپے بچا لیے تھے تاکہ واپسی پر گڈو کے لیے انار خرید سکے۔

''بھیا! انار کتنے روپے کلو ہیں؟''

''تین سو روپے کلو۔'' ریڑھی والے نے اس کی خستہ حالت اور پسینے سے بھیگے حلیے کو دیکھ کر لاپروا ہی سے جواب دیا اور اپنے گاہکوں کو بھگتانے لگا۔ اس نے اپنی مٹھی میں دبے ہوئے بیس روپوں کو بے بسی سے دیکھا۔

''بھائی! کوئی چھوٹا سا انار ہو تو مجھے بیس روپے میں دے دو۔'' شریفاں نے بڑی لجاجت سے کہا۔ پھل والا اپنے گاہکوں سے فارغ ہو چکا تھا۔

''او بی بی! تمہیں ان میں سے کوئی ایک دانا بھی ایسا نظر آ رہا ہے جو بیس روپے میں دیا جا سکے۔'' وہ رکھائی سے بولا۔ شریفاں اس کے انداز پر شرمندہ ہونے کے باوجود وہیں کھڑی رہی۔

''بھائی! اگر تم مجھے بیس روپے کا آدھا انار دے دو تو......'' تھوڑی دیر خاموش کھڑے رہنے کے بعد اس نے دوبارہ لب کشائی کی تو پھل والے نے اس کی بات کاٹ دی۔

''جاؤ بی بی! میرا ٹیم (ٹائم) خراب نہ کر۔ جا رستہ ناپ اپنا۔ مانگنے کے نئے نئے طریقے ڈھونڈ لیتے ہو تم لوگ۔'' وہ ذلت کے احساس سے پانی پانی ہو گئی اور خاموشی سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆......☆

''اماں! اگر آج تم میرے لیے انار نہ لائی تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔'' شریفاں کام پر جانے کے لیے گھر سے نکلی تو گڈو نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے گویا دھمکی دی تھی۔ وہ خاموشی سے اسے اسکول چھوڑ کر کام پر روانہ ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ آج وہ سامعہ بی بی سے اپنی تنخواہ میں سے پانچ سو روپے ایڈوانس لے کر گڈو کے لیے ضرور انار خرید لے گی۔ پھر سارا مہینہ چاہے جیسے بھی گزرے۔

سارا کام مکمل کر کے وہ سامعہ بی بی کے پاس آئی۔

''بی بی! مجھے تنخواہ میں سے پانچ سو روپے ایڈوانس دے دیں، میں......'' مگر سامعہ نے اس کی بات مکمل نہ ہونے دی۔

''دیکھو! شریفاں تم جانتی ہو کہ مہینے کا آخر ہے۔ میرا ہاتھ پہلے ہی تنگ ہے تمہیں ایڈوانس دینے کے لیے میرے پاس بالکل پیسے نہیں ہیں۔'' اس نے کورا جواب دے دیا۔

شریفاں کا دل بہت برا ہوا۔ اس کے سامنے بار بار گڈو کا چہرہ آ رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچ کر ایک فیصلہ کیا وہ سامعہ بی بی کے اِدھر اُدھر ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ اپنے کمرے میں گئیں تو شریفاں آہستگی سے کچن میں داخل ہو گئی۔ یہ کچن اس کے گھر

کے دونوں کمروں جتنا تھا۔ وہ دائیں طرف کی بڑی کھڑکی کے ساتھ رکھے ہوئے فریج کے پاس جا کر رک گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر لرزتے ہاتھوں سے فریج کھولا اور ایک انار اٹھا کر اپنی چادر میں چھپا لیا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ وہ کوئی عادی چور نہیں تھی۔ غریب ہونے کے باوجود بہت خوددار تھی اور چوری چکاری سے کوسوں دور مگر ہر روز اپنے بیٹے کی آس توڑنا اسے تکلیف دے رہا تھا۔ بچے کی محبت نے اس سے وہ کام کروایا تھا جو اس نے ساری زندگی نہیں کیا تھا۔

جب تک بڑی بیگم صاحبہ زندہ رہیں، اس گھر کے سارے نوکروں کو ہر موسم کا پھل چکھنے کا موقع مل جاتا تھا کہ نئے موسم کا جو بھی پھل گھر میں آتا پہلے وہ اس میں سے نوکروں کا حصہ الگ کرتیں اس کے بعد باقی گھر والے اسے کھاتے تھے۔ بڑی بیگم صاحبہ کا یہ بھی اصول تھا کہ ہر اتوار کو جب ہفتے بھر کی سبزیاں اور پھل آتے تو وہ فریج میں موجود پہلی سبزیاں اور پھل نکال کر نوکروں میں برابر بانٹ دیتی تھیں۔ اللہ نے انہیں جتنی نعمتوں سے نوازا تھا وہ اتنا ہی غریبوں اور مسکینوں کا خیال رکھتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر اللہ نے ان کو یہ ساری نعمتیں عطا کی ہیں تو اس نے ان پر یہ ذمہ داری بھی عائد کی ہے کہ وہ اپنی ان نعمتوں میں محروم لوگوں کو شامل کریں۔ ان کی خوش بختی تھی کہ وہ اپنی پوری زندگی اللہ کی طرف سے عائد اس ذمہ داری کو بہت اچھے طریقے سے نبھا گئی تھیں۔

مگر ان کے گزر جانے کے بعد جب گھر کا انتظام ان کی بہو سامعہ کے ہاتھ آیا تو اس نے سب سے پہلے اس ''فضول خرچی'' پر پابندی لگائی۔ وہ بہت تنگ دل اور اور چھوٹے ظرف کی مالک تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو ضرورت سے زائد چیز کو ضرورت مندوں میں تقسیم کرنے کی بجائے ضائع کرنا پسند کرتے تھے۔ جب پھل اور سالن فریج میں رکھے گل سڑ جاتے تو وہ انہیں اٹھا کر ڈسٹ بن میں پھینک دیتی مگر نوکروں کو دینا گوارا نہ کرتی۔

ابھی شریفاں کچن سے باہر نکلنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ سامعہ بی بی کسی کام سے کچن میں چلی آئی۔ شریفاں ایک دم گھبرا گئی۔ اس کا اس طرح ڈرنا اور چادر میں چھپے ہوئے ہاتھ سامعہ کو مشکوک کر گئے۔

''شریفاں! چادر کے اندر کیا چھپایا ہے؟'' اس نے تیوریاں چڑھائیں۔

''کچھ...... کچھ نہیں...... بی بی!'' وہ ہکلا گئی اور اس کی ہکلاہٹ نے سامعہ کے شک کو تقویت دی۔ اس نے شریفاں کی چادر کا سرا پکڑ کر کھینچا تو سینے سے لپٹا ہوا پلو نیچے جا گرا۔ شریفاں کے لرزتے ہاتھوں میں موٹا سا سرخ انار دبا ہوا تھا۔ سامعہ کا پارہ ایک دم ہائی ہو گیا۔

''تم لوگوں کی نیتیں کیوں نہیں بھرتیں؟ کیوں حاسدوں کی طرح ہر چیز پر نظر رکھتے ہو تم لوگ؟ تم...... تم بے ایمان چور عورت تمہارا ایمان کیا ختم ہو گیا ہے۔ تمہیں چوری کرتے ہوئے ذرا خوف خدا نہیں آتا۔ یہ گھٹیا کام کرتے ہوئے ذرا شرم نہیں آتی تمہیں۔'' اس نے اسے جی بھر کر جلی کٹی سنائیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسے دو چار تھپڑ جڑ دے مگر وہ اپنی طبیعت پر جبر کر کے اس کا لحاظ کر گئی تھی کہ وہ اس گھر کی پرانی ملازمہ تھی۔ اسے ایک پل کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ شریفاں نے آج تک ایسی حرکت نہیں کی تو پھر آج ایسا کیا ہو گیا تھا کہ اس نے اپنی فطرت کے خلاف کام کیا تھا۔

''بی بی! آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ غربت بعض اوقات انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے یہ تو پھر ایک انار کی چوری ہے مگر پیٹ بھرے لوگ جن

کے ہاں نعمتیں پیروں میں رُلتی ہوں وہ اپنی ایک ایک خواہش کے لیے سسکتے لوگوں کا درد کیسے جان سکتے ہیں۔" یہ ساری باتیں وہ صرف دل میں کہہ پائی تھی۔

سامعہ نے اس کے ہاتھ سے انار چھین کر دوبارہ فریج میں رکھا اور فریج لاک کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شریفاں نے اپنی دونوں آنکھیں اپنی چادر سے رگڑ ڈالیں۔ مارے شرمندگی کے اس سے قدم اٹھانا محال ہو رہا تھا۔

☆......☆

گڈو ہر روز اسکول سے واپسی پر اپنے باپ کے پاس چلا جاتا تھا۔ کیونکہ اس وقت گھر پر تالا لگا ہوتا تھا۔ سو وہ ایک بجے اسکول سے باپ کے پاس چلا جاتا جو سڑک کے کنارے بنے ہوئے ایک ڈھابہ ٹائپ ہوٹل پر کام کرتا تھا جس کا مالک بہت سخت تھا۔ اس کا یہ ہوٹل اچھا خاصا چلتا تھا مگر وہ گڈو کے باپ سمیت اپنے دو دوسرے ملازموں سے رات گئے تک کام لینے کے بعد شام کو سو سو روپے پکڑا دیتا تھا۔ جس دن کوئی چھٹی کر لیتا اس دن کی دیہاڑی کاٹ لی جاتی۔ گڈو کا باپ اپنے پیر کے لنگ کی وجہ سے کہیں اور کام نہیں کر سکتا تھا تو بیکار سے بیگار بھلی کے مصداق یہاں کام کرتا تھا۔ گڈو واپس آتا تو اس کا باپ اپنے حصے کا آدھا کھانا اسے کھلا دیتا اور گڈو وہیں بیٹھ کر آتے جاتے گاہکوں کو دیکھتا اور کبھی اپنے باپ کو گاہکوں اور کبھی ہوٹل کے مالک سے جھڑکیاں کھاتے۔ مغرب سے تھوڑا پہلے اس کی ماں کام سے واپسی پر اسے اپنے ساتھ لے کر گھر آتی تھی۔ اس کی بہنیں مغرب کے بعد گھر پہنچتی تھیں۔ جس دن اس کی کوئی بہن گھر پہ ہوتی اس دن وہ اسکول سے سیدھا گھر جاتا تھا۔

معمول کے مطابق گڈو ہوٹل کے تھڑے پر بیٹھا آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ پچھلے پانچ روز سے وہ اپنی ماں سے انار کھانے کی فرمائش کر رہا تھا مگر اس کی یہ فرمائش اس کی ماں کی پہنچ سے بہت دور تھی۔ اس وقت بھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ شاید اس کی ماں آج اس کے لیے انار لے آئے۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ ہوٹل کی ذیلی گلی سے ایک پھل فروش اپنی ریڑھی دھکیلتا ہوا نکلا۔

اس کی ریڑھی پر دوسرے پھلوں کے ساتھ ڈھیر سارے بڑے بڑے انار بھی تھے۔ انار دیکھ کر گڈو کے منہ میں پانی اور آنکھوں میں حسرت بھر گئی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ریڑھی والا سڑک کے درمیان میں جا پہنچا تھا۔ وہ سڑک پار کر کے دوسری طرف کے بازار میں جا رہا تھا کہ اچانک اس کی ریڑھی سے ایک انار سڑک کے بیچ میں آن گرا۔ ریڑھی والے کو اس کی خبر نہ ہوئی کہ وہ پوری توجہ سے سڑک پار کر رہا تھا۔ سڑک پر آتی جاتی گاڑیوں کا شور تھا۔ ریڑھی والا سڑک پار کر گیا۔

گڈو اس موقع کو غنیمت جان کر اندھا دھند بھاگا اور جھک کر انار اٹھا لیا مگر جونہی وہ پلٹا مخالف سمت سے آنے والی ایک تیز رفتار گاڑی سے ٹکرا کر دور جا گرا۔ گڈو اچانک بیچ سڑک پر آ گیا تھا۔ گاڑی والے نے جب اسے دیکھا تو گاڑی کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی مگر رفتار زیادہ ہونے کی وجہ سے گاڑی گڈو کو ہٹ کر کے فٹ پاتھ پر جا چڑھی۔ ایکسیڈنٹ کی آواز سن کر سڑک پر لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا۔ کسی نے ہوٹل میں آ کر گڈو کے باپ کو اطلاع دی تو وہ گرتا پڑتا وہاں پہنچا۔ وہ اپنے بے جان بیٹے کا سر گود میں رکھ کر سسکنے لگا اور وہ انار جس کی قیمت گڈو نے اپنی جان دے کر چکائی تھی ہجوم کی ٹھوکروں سے ادھر ادھر لڑھک رہا تھا۔

☆......☆

ماورا بشارت چیمہ

افسانہ

روح کا سودا

کمرے میں خاموشی کا راج تھا۔ اس کمرے میں موجود واحد انسان سوچوں کے سمندر میں غرق تھا اور چہرے پہ صدیوں کی تھکن تھی۔ ایسے ہی ہوتا ہے جب آپ منزل کے قریب پہنچ گئے ہوں اور آپ کو محسوس ہو کہ یہ رائیگاں سفر ہی رائیگاں گیا۔ اس کا سفر بھی رائیگاں گیا اتنے دنوں کی محنت بے کار گئی تھی۔ اس کی دن رات کا ثمر اس کی محنت بستر پہ پڑے صفحے تھے۔ وہ بالکل ساکت بیٹھی تھی اور سائیڈ ٹیبل پہ پڑا چائے کا کپ بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

☆......☆

محمد امین کا گھرانہ غریب سہی پر پیار، خلوص کے خزانوں سے بھرا ہوا تھا۔ محمد امین اور اس کی بیوی رخسانہ اور چار بچے دو کمروں اور چھوٹے سے صحن والے گھر میں رہتے ہوئے بھی یہ محسوس کرتے تھے جیسے محل میں رہتے ہوں۔ محمد امین ٹانگ سے معذور تھا مگر ہمیشہ اپنے گھر میں حلال کمائی ہی لایا تھا۔ اس کی امید اس کا بڑا بیٹا علی امین تھا جو کہ بارہویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ رخسانہ صبح سویرے اٹھتی نماز پڑھ کے ناشتہ بناتی تھی۔ سارا گھرانہ صبح سویرے اٹھنے کا عادی تھا۔ ناشتے کے بعد محمد امین کام کے لیے نکل جاتا۔ علی امین کالج اور چھوٹی بہن اسکول چلی جاتی تھی۔ رخسانہ گھر کے کام کاج کر کے ہمسائیوں کے گھر کے چکر لگا آتی۔ علی امین اس گھر کی رونق تھا۔ ماں باپ کے کئی کام کرتا بہنوں کے لاڈ پیار اٹھاتا تھا۔

☆......☆

کمرے میں چھائی خموشی کو فون کی گھنٹی نے توڑا۔ وہ بنا فون اٹھائے بھی جانتی تھی کہ کون ہوگا۔ اس لیے اس نے موبائل آف کر کے رکھ دیا۔ کل دن سے اس کے موبائل پہ یہ کالز آنی شروع ہوئیں۔ جنہوں نے اسے یہ احساس کرا دیا تھا کہ منزل تک پہنچنا سہل نہیں۔ لیکن اس کا حوصلہ پھر بھی قائم تھا۔ لیکن شام میں آنے والی کال نے اس کا ضبط ختم کر دیا۔ اس وقت سے وہ یوں ہی کمرے میں بند تھی۔ کمرے کے دروازے پہ دستک ہوئی اس نے ٹائم دیکھا رات کے نو بج رہے تھے۔ یقیناً بابا ہوں گے۔ دروازہ کھول کر واپس بیڈ پہ آ کے بیٹھ گئی۔ بابا آ کے اس کے پاس بیٹھ گئے۔

''صحافی صاحبہ! آج کمرے میں کس خوشی میں بند ہے جو اس بوڑھے کا بھی خیال نہیں آیا۔'' بنا بولے اس نے وہ صفحے بابا کے سامنے رکھ دیے کیونکہ جانتی تھی بابا پوری بات جانے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔

☆......☆

رات کے آٹھ بجے دروازے پہ دستک ہوئی۔ رخسانہ نے حیران نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ محمد امین دن کا تھکا ہارا سو چکا تھا۔ گاؤں میں اس وقت خاموشی کا راج تھا۔ ایسا سناٹا تھا جیسے آدھی رات کا سماں ہو۔ اس نے خود ہی اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے چوہدری کے خاص ملازم کالڑ کا تھا جو علی امین کو بلانے آیا تھا۔ رخسانہ نے آ کے علی کو اٹھایا اور اس کو باہر بھیجا۔ علی دروازے تک گیا تھوڑی دیر تو وہ بیٹھی رہی پھر دروازے تک آئی۔ علی اسے دیکھ کر بولا۔



"اماں! دروازہ بند کرلو میں تھوڑی دیر تک آجاؤں گا۔"

"پر اس وقت کہاں جارہے ہو؟" رخسانہ نے پریشان ہوکر پوچھا۔

"اماں! کل گاؤں میں کبڈی کا مقابلہ ہے۔ سارے لڑکوں نے مل کے انتظام کرنا ہے۔ اس لیے میں بھی جارہا ہوں۔" رخسانہ نے سر ہلاتے ہوئے اسے جانے کا کہا اور دروازہ بند کرتے ہوئے اندر آگئی۔ اس وقت سردی بھی شدت کی تھی۔ علی پہلے بھی اس وقت باہر جاتا تھا پر آج رخسانہ کا دل ہول رہا تھا۔ علی کے بارے میں سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔

☆......☆

ظفر صاحب نے سارے صفحے پڑھے اور اپنی حساس دل بیٹی کی طرف دیکھا۔

"علیشہ بیٹی! تم نے آج سے پہلے بھی ایسے مسئلوں پر کئی پروگرام کیے ہیں۔ تو پھر آج یہ پریشانی کیوں؟"

"بابا! آپ کو پڑھ کے دکھ نہیں ہوا۔ اس ظلم و بربریت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"علیشہ بیٹی! دکھ اور افسوس کے اظہار کے لیے لفظوں اور آنسوؤں کا سہارا ضروری نہیں ہوتا۔ آپ بتاؤ پریشانی کی وجہ کیا ہے۔" اسی وقت دوبارہ فون کی گھنٹی بجی اس نے کال اٹھائی اور اسپیکر آن کردیا۔ دوسری طرف سے لفظوں کے بجائے آگ کے گولے پھینکے جارہے تھے۔

"اے لڑکی! ہمیں تیرے بارے میں ساری معلومات ہیں۔ جو کرنے کا تو سوچ رہی ہے نا وہ کرنے سے پہلے اپنی جان اور عزت سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ اور رہ گیا وہ تیرا بوڑھا باپ تو وہ پہلے ہی دل کا مریض ہے اپنی بیٹی کی ذلت برداشت نہیں کرسکے گا۔" اس کے ساتھ ہی فون بند ہوگیا۔ علیشہ بابا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

☆......☆

پورے گاؤں میں کہرام مچا ہوا تھا۔ جن لوگوں پہ قیامت ٹوٹی تھی وہ بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ محمد امین کا واحد سہارا، معذوری اور غریبی کا انعام علی امین کی خون میں لت پت لاش صحن میں پڑی تھی۔ رخسانہ دیوانوں کی طرح آگے بڑھی اور علی امین کے سرد جسم کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کا جواں بیٹا شہزادوں جیسا لعل اس حالت میں سامنے تھا کہ جسم کا کوئی حصہ اپنی اصلی حالت میں نہیں تھا۔ قیامت سی قیامت تھی ظلم و بربریت کی انتہا تھی اور آنکھوں سے آنسو بھی تو تب نکلتے نا جب ظلم پہ یقین آئے۔

☆......☆

محمد امین کا گھرانہ اجڑے ایک سال ہوگیا تھا۔ کچھ ماہ تو اس گھر کا کوئی بھی فرد اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ لیکن ہوش کی وادی میں آتے ہی فیصلہ ہوگیا۔ محمد امین غریب تھا پر کمینہ نہیں تھا کہ اپنے بیٹے کا خون بیچ دیتا۔ لیکن ایک سال ہوگیا۔ اسے انصاف نہ ملا۔ پولیس کو بھاری رقم ملتی تو کیس آگے جاتا۔ ایسے میں اس کے گھر ایک صحافی آئی جس نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے ساتھ ہے ظلم کو میڈیا تک لائے گی۔ علیشہ ظفر نے ساری تحقیقات کیں پولیس بھی میڈیا کے ڈر سے تھوڑا سا ساتھ دے رہی تھی۔ اور علیشہ بات کی تہہ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ یہ جان کر حیران رہ گئی کہ مخالف پارٹی بھی کم حیثیت تھی لیکن جنہوں نے یہ انسانیت سوز اقدام کیا ان کے سر پہ گاؤں کے چوہدریوں کا ہاتھ تھا۔ اور چوہدری کے ڈر کی وجہ سے یہ گاؤں کے لوگ انصاف کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ یہ سب باتیں جان کر علیشہ کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا۔ وہ محمد امین کو انصاف دلائے گی۔ علی امین کا بے دردی سے ہوا قتل اور پولیس کی بے حسی ارباب اختیار کے سامنے لائے گی۔ سارے ثبوت اور شواہد اس کے پاس تھے اور کچھ دنوں بعد وہ لوگ اپنے انجام کو پہنچ جاتے۔ اور جب وہ منزل کے قریب آگئی تو حالات بدل گئے۔ اسے اس پروگرام سے روکنے کے لیے

دھمکی آمیز کالز آنے لگیں۔ اس کی عزت اور جان کو خطرہ تھا لیکن اس نے ہار نہیں مانی تھی۔ اور اب حالات اس کی مرضی کے مطابق نہیں رہے تھے۔

"علیشہ بیٹا! آپ ہار نہیں مان سکتیں۔ ان کالز سے گھبرا کر تم اپنے فرض سے پیچھے نہیں ہٹ سکتیں۔" سارا معاملہ جان لینے کے بعد بھی ظفر صاحب حق کے ساتھ تھے۔

"نہیں بابا! اب کچھ نہیں ہو سکتا محمد امین کا گھرانہ ہی پیچھے ہٹ گیا ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کا خون بیچ دیا ہے بابا۔ انہوں نے محمد امین کی بیٹی اٹھوالی ہے۔ اور میرے پروگرام نہ کرنے کی صورت وہ واپس کر دیں گے۔" یہ کہتے ہوئے علیشہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

"میں ہار گئی بابا! بلند و بالا دعوی کرنے والی علیشہ ظفر ہار گئی۔ میں نے اس معاشرے میں ناسور لوگوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ میں غریب کو جینے کا حق دلانا چاہتی تھی۔ پر نہیں بابا میں جس ملک میں رہتی ہوں اس میں ایسے ظالم لوگ بستے ہیں کہ کسی کا جواں بیٹا مار کے اس کو کاروائی سے روکنے کے لیے اس کی بیٹی اغوا کروا لیتے ہیں۔ ظلم کے بازار میں ترازو رکھتے ہیں ایک پلڑے میں جواں بیٹے کا خون اور دوسرے میں خاندان کی عزت و ناموس اور ہر عزت دار انسان کے لیے عزت و ناموس والا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ جس ملک کی عوام اور حکمران صرف دولت کے پجاری ہوں ان کے پاس اتنی دولت اور خزانوں کی بھرمار ہو جس کے لیے ملک کے بینک بھی ناکافی ہوں۔ وہاں حق کا بول بالا نہیں ہوتا۔ وہاں طاقتور انصاف خریدتا ہے اور غریب جیل کی کال کوٹھڑی میں سڑتا ہے۔ وہاں جسم کے ساتھ ساتھ روح بکتی ہے۔ اور بابا آج علیشہ ظفر نے بھی علی امین کو انصاف نہ دلا کے اپنی روح بیچ دی ہے،" وہ روتے ہوئے یہ ہی سوچ رہی تھی کیا وہ کبھی دوبارہ اپنی روح کو زندہ کر پائے گی۔ کیونکہ اس کی روح کی غذا سچائی، انصاف، انسانیت تھی جو کہ اس دور میں نایاب ہیں۔☆☆☆

رابعہ افضال خان

افسانہ

خود غرضی

''اللہ کے نام پر دے دو بابا اللہ کے نام پر دے دو بابا۔'' وہ بہتے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ایک مصروف شاہراہ کے سگنل پر کھڑی ریڈ سگنل پر رکی ہوئی گاڑیوں کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے آگے اپنی سونی ہتھیلی پھیلائے اپنی انا اپنی خودداری کو اپنے بچوں کی خاطر اپنے پیروں تلے روندتے ہوئے بھیک مانگ رہی تھی۔

''بابو جی! اللہ کے نام پر بھیک دے دو۔'' ننگے پیر جلدی جلدی گاڑیوں کے کھلے شیشے میں ہاتھ ڈالتی وہ بھیک مانگ رہی تھی۔ اس کی آواز پر گاڑی میں بیٹھے شخص نے ایک انتہائی بیزاری سی نگاہ اس کے اوپر ڈالی اور پھر احسان کرنے والے انداز میں دس کا نوٹ نکال کر اس کی سونی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ دعائیں دیتی آگے بڑھ گئی۔ اس طرح شام اس کے پاس اچھے خاصے پیسے جمع ہو گئے تھے۔ اس نے آج زندگی میں پہلی مرتبہ بھیک مانگی تھی تین دن سے بھوک و پیاس نے نڈھال کر ڈالا تھا۔ وہ اکیلی جان ہوتی تو کبھی بھیک نہ مانگتی بے شک بھوکی مر جاتی مگر اس کے گھٹنے سے لگے بیٹھے اس کے دو معصوم سے بچے وہ کب تک فاقہ کرتے۔ گڈو تو پھر بھی 7 سال کا تھا مگر ببلو تین سال کا بچہ وہ کہاں زمانے کے سرد گرم کو سمجھ سکتا تھا۔ پہلے تو وہ بھوک سے روتا رہا اور پھر اس کے ہاتھ میں ماں کا آنچل آ گیا جسے وہ منہ میں ڈالے والہانہ چبانے لگا تھا۔ وہ چند پل تو ساکت سی اپنے بھوک سے بلکتے بچے کو دیکھتی رہی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''سالار تم کیوں ہمیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔'' اپنے پیارے شوہر کو یاد کر کے وہ مزید بلکی تھی۔

آج سے سال بھر پہلے وہ کتنے خوش حال تھے۔ سالار اور زنیرہ کی شادی کے 10 مہینے بعد ہی گڈو ان کے گھر کی رونق بڑھانے چلا آیا اور پھر ببلو۔ بہت اچھی تھی ان کی زندگی۔ سالار گارمنٹس فیکٹری میں کٹنگ ماسٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ بہت اچھی گزر بسر ہو جایا کرتی تھی۔ اپنی بیوی اور بچوں کی ہر خواہش وہ ان کے بنا کہے پوری کرتا۔ بہت خوش تھے وہ لوگ پھر ایک دن روز کی طرح سالار گیا تو اپنے پیروں پر تھا مگر واپس چار لوگوں کے کندھے پر آیا تھا اس کی بائیک تیز رفتاری سے آتے ٹرک سے ٹکرائی تھی ٹرک کا ڈرائیور فرار ہو گیا تھا جب کہ سالار ایک گھنٹے سڑک پر تڑپتے رہنے کے بعد زندگی کی بازی ہار گیا۔ سڑک کے بیچوں درمیان خون سے لت پت پڑے سالار کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا مگر آگے بڑھ کر اسے اسپتال لے کر جانے والا کوئی نہ تھا۔ خون سے لت پت پڑے سالار کی آنکھوں میں مچلتی التجا صاف پڑھی جا سکتی تھی مگر ہر کوئی کترا رہا تھا اور بالآخر زندگی اور موت سے لڑتے لڑتے سالار احمد زندگی کی بازی ہار گیا اور اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی زنیرہ کے لیے دنیا تنگ پڑنے لگی۔ عدت کے دن پورے ہوتے ہی وہ گھر



چلانے کے بارے میں سوچنے لگی۔ جو کچھ تھوڑا بہت جمع کیا تھا وہ سالار کی تدفین اور کھانے پینے میں ختم ہو چکا تھا۔ کام ڈھونڈنے میں اسے کیسی کیسی گندی و غلیظ نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا صرف اس کا دل جانتا تھا بڑی مشکل سے اسے ایک بنگلے میں ماسی کا کام مل گیا تھا۔ وہ خوش ہوگئی بیگم صاحبہ تو بڑی نیک دل تھیں مگر ان کے شوہر ایک نمبر کے اوباش، شرابی شخص تھے وہ بہانے بہانے سے زنیرہ کو تنہائی میں بلاتے۔ آتے جاتے کبھی کندھا مس کرتے کبھی کسی بہانے سے اس کا ہاتھ تھام لیا کرتے۔ وہ بچوں کی خاطر دل مسوس کر رہ جاتی مگر ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔ بیگم ذکی گھر میں موجود نہیں تھیں۔ وہ بھی کام نمٹا کر جانے ہی والی تھی کہ جبھی ذکی صاحب آگئے۔ انہیں اچھی طرح سے علم تھا کہ ان کی بیگم اس وقت گھر میں موجود نہیں۔ انہوں نے زنیرہ کو اکیلے دیکھا تو کھل کر مسکرائے اور زنیرہ کے ڈر و خوف اور سراسیمگی نے ذکی صاحب کو مزید شے دی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر سہمی ہوئی زنیرہ کی چادر کو ایک جھٹکے سے اس کے وجود سے الگ کیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ مزید اپنی درندگی کا ثبوت دیتے زنیرہ نے پاس رکھا پیتل کا بڑا سا گلدان ان کے سر پر دے مارا اور اپنی چادر اٹھائی تیزی سے وہاں سے بھاگ نکلی۔ کئی دن تو وہ گھر سے باہر نہ نکلی ڈر و خوف نے ایسے اسے اپنے شکنجے میں جکڑا کہ تیز بخار نے اس کے دھان پان سے وجود کو اپنے لپیٹے میں لے لیا۔ گھر میں موجود جو ذرا بہت راشن تھا وہ بھی دو ہفتے میں ختم ہو چکا تھا اور پھر نوبت فاقے تک پہنچ گئی اس نے کئی جگہ کام تلاش کیا مگر یہ بڑے لوگ اور ان کی عیاشیاں کہاں کسی کی مجبوریوں کو خاطر میں لاتی ہیں ہر کسی کی گندگی میں لتھڑی نگاہیں اس کے وجود کا طواف کرنے لگتیں اور پھر تین سال کے ببلو کو بلکتا دیکھ کر وہ بنا کچھ سوچے سمجھے بھیک مانگنے نکل پڑی تھی۔

اس نے ہاتھ میں پکڑے پیسوں کو گنا تقریباً سات سو روپے کے قریب پیسے اس کے پاس تھے وہ ایک دم سے خوش ہوگئی۔ ''کل تھوڑا جلدی نکلوں گی تو اور زیادہ پیسے مل جائیں گے۔'' وہ سوچتے ہوئے سامنے سڑک پار نظر آتے بازار کی طرف بڑھ گئی۔ چند قدم ہی چلی تھی کہ ایک بائیک تیزی سے اس کے قریب سے گزری اور اس کے ہاتھ میں موجود پیسے بائیک پر بیٹھے لڑکے نے چھین لیے وہ پل بھر کو کچھ سمجھ ہی نہ سکی اور پھر زور زور سے آوازیں دیتی تیز رفتار سے دوڑتی بائیک کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگی۔ بیچ روڈ پر بھاگ رہی تھی بنا کچھ سوچے سمجھے اسے بس یاد تھا تو اتنا کہ اس کے بچے بھوکے ہیں اور اسے ان کے لیے کھانا لے کر جانا ہے اسے اور کچھ نہ سنائی دے رہا تھا نہ دکھائی دے رہا تھا۔ پیچھے سے آتی تیز رفتار کار نے اسے زوردار ٹکر ماری تھی کہ وہ کسی فٹبال کی مانند اچھلتی سڑک کے دوسری طرف گری تھی اور اگلے چند سیکنڈز میں ہی سڑک اس کے سر سے بھل بھل بہتے خون سے رنگین ہونے لگی تھی۔ بند ہوتی آنکھوں سے اس نے اپنے معصوم بچوں کو بڑی شدت سے یاد کیا تھا جو گھر میں اس کی واپسی کی راہ دیکھ رہے تھے۔ وہ معصوم تو جانتے تک نہ تھے کہ جو ماں ان کے لیے کھانے کا بندوبست کرنے گئی ہے وہ اب کبھی واپس نہ آئے گی۔ اس کی بند ہوتی آنکھوں سے دو موتی ٹپکے تھے اور ایک ہچکی کے ساتھ ہی اس کی روح پرواز کر گئی تھی۔ ہمارے معاشرے میں بڑھتی بے حسی و خودغرضی نے دو معصوم سے پھول جیسے بچوں کو بے سہارا و لاوارث بنا دیا۔ باپ کا سایہ تو پہلے ہی نہ تھا اور اب ماں کی گھنی چھاؤں سے بھی محروم کر دیا تھا اور مستقبل قریب میں نہ جانے وہ کن راہوں کے مسافر ہونے والے تھے۔ ایک معزز عزت دار شہری یا پھر چور غنڈے یا پھر کسی کچرے کے ڈھیر پر ملنے والے نشے کے عادی!!

......☆......

شہلا گل سحر صالح

افسانہ

دادا جی

شاہدہ بیگم کا شمار ان عورتوں میں ہوتا تھا جو زبان کو تلوار کی دھار پر رکھتی تھیں اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے کسی حد تک بھی جا سکتی تھیں۔ کفایت حسین سے جب بھی ان کا جھگڑا ہوتا یا اس کی کوئی خواہش رد کر دی جاتی، تو وہ بچوں کو



روئی کی طرح دھنک کے رکھ دیتی، وہ ایک انا پرست اور ہٹ دھرم عورت تھی۔ شوہر کی غیر موجودگی میں جب سسر بچوں کا دفاع کرتے تو وہ اُن کو بھی خاطر میں نہ لاتی اور دوبدو جواب دیتی، نتیجے میں ایک اور محاذ کھل جاتا۔ بچے اور محلے والے سب اس کی زبان سے پناہ مانگتے تھے۔

☆............☆............☆

آج صبح بھی مطلوبہ رقم نہ ملنے پر ناشتے پہ ہی اس کی کفایت حسین سے تُوتُو میں میں ہوگئی اور وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ کے بکتا جھکتا دکان پہ چلا گیا۔ بدقسمتی سے پانچ سالہ عفان کسی کام سے کچن گیا تو غلطی سے شیلف پر پڑی ٹرے زمین پر گر گئی اور برتن نیچے فرش پر گرے جس سے دو کپ ٹوٹ گئے۔

شاہدہ جو صبح سے جلی بھنی بیٹھی تھی آؤ دیکھا نہ تاؤ اور چھوٹے بیٹے پر ٹوٹ پڑی۔ عفان کے رونے کی آواز سن کر شفاعت حسین جو تلاوت کر رہے تھے قرآن پاک بند کر کے ہانپتے کانپتے باہر آئے اور چھوٹے بچے کو خود سے لپٹا لیا۔

''بہو! ہوش کے ناخن لو اس معصوم سے کیا دشمنی نکال رہی ہو''۔ انہوں نے اسے ڈپٹا۔ صبح کی کارروائی سے وہ بخوبی باخبر تھے۔

''چھوڑیں اسے یہ میرا بچہ ہے میں اسے ماروں یا نوچوں، کسی کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے''۔ اس نے چھوٹے کو اپنی طرف گھسیٹا مگر وہ دادا سے چپکا تھر تھر کانپ رہا تھا اور اندر ہی اندر سسک رہا تھا۔

''تنگ آگئی ہوں اس گھر سے۔ برا ہو میرے ماں باپ کا کہ فقیروں میں میری شادی کر دی ہے۔ ایک تو شوہر نکما اور کنگلا اور اوپر سے یہ ٹی بی کا مریض۔ میں تو خدمت کرنے والی نوکرانی ہوں اور اوپر سے یہ نامراد اولاد جو نقصان دینے کے در پے رہتی ہے۔ میں منحوس ہی رہ گئی تھی اس دوزخ کے لئے''۔ اب وہ خود کو کوس رہی تھی۔

''تیری تو میں آج ہڈی پسلی توڑ دوں گی''۔ اس نے عفان کو گھورا اور اس سے پہلے کہ اس کو ایک اور تھپڑ رسید کرتی شفاعت حسین نے جھٹکے سے اسے دور کیا تو شاہدہ کو پتنگے لگ گئے۔ اس نے واویلا مچا دیا۔

''صبح بیٹے نے کسر نہیں چھوڑی تھی کہ اب بڑے میاں بھی میدان میں کود پڑے ہیں۔ ارے یہ لمبی عمر لے کے آئے ہیں، ہمیں ٹی بی لگا کے ہی مریں گے۔ باپ بیٹے نے میری زندگی جہنم کی ہوئی ہے۔ باپ کے علاج سے فرصت ملے تو بیوی بچوں کو دیکھے''۔ اس جاہل عورت نے جہالت کی انتہا کر دی تھی۔ آس پاس کی دیواروں سے کتنے سر تماشا دیکھنے کے لئے اٹھے۔ کسی کی نگاہ میں تمسخر تو کسی کی نگاہ میں تاسف تھا۔

شفاعت حسین ضبط کی کڑی منزلوں سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے پوتے کو نرمی سے ایک سائیڈ پر کیا اور لمبے ڈگ بھرتے کمرے میں چلے گئے۔

باہر شاہدہ کی زبان ویسے ہی آگ اگل رہی تھی۔ انہوں نے بیگ میں ضرورت کا سامان رکھا اور بہو کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گئے اور اپنے گھر کی دہلیز عبور کر لی۔

☆............☆............☆

شفاعت حسین ریٹائرڈ فوجی تھے، ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنی جمع پونجی سے مین مارکیٹ میں کپڑے کی دکان کھول لی جو چل نکلی اور اس کے علاوہ انہیں پنشن بھی ملتی، ان کا ایک ہی بیٹا تھا کفایت حسین جسے انہوں نے بہت لاڈ سے پالا تھا۔ کفایت کی شادی سے پہلے ہی اس کی ماں فالج کا شکار ہو کر دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ کفایت ان کی ہزار کوشش کے باوجود میٹرک سے آگے نہ پڑھ سکا تو انہوں نے اسے اپنے ساتھ دکان پر بٹھا دیا اور اپنے جاننے والوں میں اس کی شادی کر دی۔ شادی کے بعد دنوں باپ بیٹے کو اندازہ ہوا کہ شاہدہ بیگم کا تعلق اس ٹائپ کی عورتوں سے تھا جو زندگی جنت نہیں جہنم بناتی ہیں۔ اوپر نیچے تین اولادیں، ام ایمن، کاشان اور عفان پیدا کر کے شاہدہ مزید اکڑ گئی۔ وہ جہالت کا چلتا پھرتا ثبوت تھی، خود غرضی اور ہٹ دھرمی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی، تینوں بچے دادا سے مانوس تھے، ان کی تربیت میں دادا کا ہاتھ تھا، شاہدہ بیگم لاکھ

انہیں روکتیں مگر وہ اس کو خاطر میں نہ لاتے۔ شفاعت حسین کی کھانسی کی وجہ سے وہ انہیں ٹی بی کا مریض کہتی۔ مگر آج تو اس عورت نے حد کر دی اور شفاعت حسین اپنا سامان لے کر نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے۔

اسکول سے واپسی پر ام ایمن بہت خوش تھی۔ اسے دادا جان سے ملنے کی جلدی تھی۔ اسکول کی بزم ادب میں اس نے دادا جان کے عنوان سے یہ نظم پڑھی تھی۔

''فلک پہ چمکتے تارے ہیں
چمن میں کھلے گل سارے ہیں
خوشبو، بارش، دھنک
یہ سارے رنگ ہمارے ہیں
مگر! سب سے زیادہ
ہمیں اپنے دادا جی ہی
پیارے ہیں''

چونکہ تیرہ سالہ ام ایمن کی یہ ذاتی تخلیق تھی اس لئے اسکول کی میڈم نے اسے دو سو روپے انعام دیا تھا، اور یہ اس کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ مگر دادا جان کو کمرے میں نہ پا کر وہ ٹھنک گئی۔ ماں کا سوجا چہرہ دیکھ کر ان سے بھی استفسار نہ کر سکی۔ البتہ موقع ملتے ہی چھوٹے نے صبح والا واقعہ گوش گزار کیا۔

''دادا جان کدھر گئے ہوں گے، ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی'' ۔ ام ایمن جو اپنے شفیق دادا سے بہت پیار کرتی تھی یکدم پریشان ہو گئی۔

''دادا جان کا نہ تو کوئی ایسا دوست ہے اور نہ کوئی رشتے دار پھر پتہ نہیں کدھر گئے ہوں گے''۔ گیارہ سالہ کاشان بھی پریشان ہو گیا۔

''یہ سب اس فسادی عورت کی وجہ سے ہوا ہے، نفرت ہے مجھے اس سے جو بدقسمتی سے ہماری ماں کہلاتی ہے''۔ ام ایمن نے نفرت سے مٹھیاں بھینچ کر ماں کے کمرے کی طرف دیکھا۔ تینوں بچے ماں سے ڈرتے ضرور تھے مگر دل سے اس کی عزت نہیں کرتے تھے۔

☆.........☆.........☆

شام کو کفایت حسین تھکا ہارا آیا تو تینوں بچوں نے مرچ مصالحہ لگا کر اسے سارا قصہ سنایا۔ وہ دندناتا ہوا کچن میں آیا جہاں شاہدہ بیگم روٹی بنا رہی تھی۔

''کہاں ہیں ابا جی؟'' وہ دھاڑے۔

''مجھے کیا پتہ کون سا بڑے میاں مجھے بتا کر گئے ہیں، ساری رات ٹھوکریں کھائیں گے تو صبح خود ہی منہ اٹھا کر واپس آئیں گے، فکر مت کرو''۔ شاہدہ بیگم نے پیڑہ بناتے ہوئے شان بے نیازی سے کہا تو کفایت حسین کو تو جیسے پتنگے لگ گئے۔

''بدبخت عورت تم تو میرے لئے عذاب ہو، تمہاری وجہ سے ہی تو میرا چین سکون ختم ہو گیا ہے۔ میں آج جو کچھ ہوں اپنے باپ کی وجہ سے ہوں۔ یہ گھر یہ کاروبار، تمہارے عیش یہ سب ان کی وجہ سے ہیں۔ وہ تو اب بھی اپنا گزارہ اپنی پنشن سے کرتے ہیں اور ساتھ بچوں کی خواہشات بھی پوری کرتے ہیں۔ اگر کل تک میرا باپ نہ ملا تو پھر میں تمہیں بھی اپنے سے جڑے ہر رشتے سے آزاد کر دوں گا اور ابھی دفع ہو جاؤ میری آنکھوں کے سامنے سے، میں تمہاری منحوس شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا''۔ کفایت حسین کا کف بہنے لگا۔ شدید غصے سے اس کی کنپٹی کی رگ پھڑک رہی تھی۔

شاہدہ بیگم کی بولتی بند تھی۔ وہ دم بخود اپنے شوہر کا یہ روپ دیکھ رہی تھی۔ تینوں بچے بھی باپ کے ہمنوا تھے۔ کفایت اور اس کی جب بھی لڑائی ہوتی سسر اس کی سائیڈ لیتے اور کفایت کو ڈانٹ کر چپ کروا دیتے، اسے اپنی غلطی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔

کفایت حسین نے کئی جگہ فون کیا پھر کاشان کو لے کر باہر نکل گیا۔ آس پاس کئی جگہوں پر جہاں شفاعت حسین کے ہونے کا امکان تھا تلاش کیا مگر بے سود۔ تھک ہار کے واپس آئے، دونوں بچے منتظر بیٹھے تھے مگر باپ کے تھکے ہارے چہرے کو دیکھ کر وہ کچھ بھی پوچھنے کی ہمت نہ کر سکے۔

شاہدہ بیگم تنہا اپنے کمرے میں بھوکی پیاسی بند رہیں

مگر نہ تو اس کے شوہر نے اُس کا یو چھا نہ بچوں نے۔ رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی اور پریشانی میں بھی حد درجہ اضافہ ہو رہا تھا، اسی اثنا میں بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ کفایت حسین نے جلدی سے جا کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک اجنبی کے ساتھ اپنے والد کو دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق لوٹ آئی مگر اپنے والد کے ماتھے پر بندھی پٹی اسے فکر میں دھکیل گئی۔ وہ بے اختیار ان کے گلے لگ گیا۔

''بابا! کیا ہوا آپ زخمی کیوں ہیں؟'' اس کی آواز میں نمی گھل گئی تھی۔ یہ واحد تو اس کا سائبان تھا ورنہ بیوی کے ہاتھوں تو ویسے بھی اس کی زندگی بدحال تھی۔

''بیٹا! اندر آنے دو پھر ساری بات آپ کو بتا دیتے ہیں''۔ ساتھ کھڑے اجنبی نے مسکراتے ہوئے کہا تو کفایت حسین شرمندہ ہو گیا۔ باپ کو دیکھ کر وہ اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ ساتھ کھڑے محسن کو یکسر نظر انداز کر گیا۔ وہ دونوں کو لے کر باپ کے کمرے میں آیا۔ تینوں بچے دادا کو دیکھ کر کھل اٹھے اور ان سے لپٹ گئے۔ بچوں کے ساتھ دادا جان کے آنسو بھی بہہ رہے تھے۔

ام ایمن نے دادا کو بستر پر بٹھا کے کمبل اوڑھا دیا اور پھر اجنبی کو سلام کر کے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ کفایت حسین بھی اب مکمل اس اجنبی کی طرف متوجہ ہوا جو بڑی دلچسپی سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

''آپ کے والد محترم دراصل کچھ ٹائم پہلے میری گاڑی سے ٹکرا گئے تھے، صبح سے بھوکے پیاسے ہونے کی وجہ سے انہیں زور کا چکر آ گیا تھا مگر شکر ہے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ میں نے قریبی ڈاکٹر سے بینڈیج کروا کے بڑی مشکل سے ان سے گھر کا پتہ پوچھا اور یہاں لے آیا۔ میں نہیں جانتا کہ اس عمر میں ان کے گھر سے جانے کی وجوہات کیا ہیں اور نہ آپ کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کروں گا مگر صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ میں ایک بزنس مین ہوں، میرے پاس دنیا کی ہر نعمت ہے مگر میں اولاد کی نعمت سے محروم ہوں، بہت عرصہ میں اس محرومی کا شکار رہا لیکن ایک دن میرا دوست مجھے ایک اولڈ ہوم لے گیا جہاں اولاد ماں باپ کو بڑھاپے میں سہارا دینے کے بجائے بے سہارا چھوڑ دیتی ہے۔ میں نے وہاں عمر کے آخری حصے کا سفر طے کرتے بزرگوں سے جو داستان غم سنی، میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، پھر میں نے ایسی کئی درگاہیں دیکھیں جہاں اولاد ہوتے ہوئے بھی والدین لاوارثوں کی طرح پڑے ہیں۔ دو ماں باپ مل کے سارے بچوں کو کھانا دے سکتے ہیں مگر سارے بچے مل کے ماں یا باپ کو دو وقت کا کھانا نہیں دے سکتے، آج اگر ہم قدرتی آفات کا شکار ہیں، یا ڈپریشن یا فرسٹریشن کی بیماریوں میں الجھے ہیں، بے برکتی کی زندگی گزار رہے ہیں تو سب اس لئے کہ ہم سنت رسول اور اپنے رب کے احکامات کو بھول چکے ہیں۔ اگر آج ہم اپنے والدین کا احترام کرنے کے بجائے ان کی عزت پامال کر رہے ہیں تو کیا معلوم آنے والے وقت میں ہماری اولاد ہمارا کیا حشر کرے گی۔ میں تو اب اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں بے اولاد ہوں، اولاد ہو کر بھی میرے نصیب میں دربدر کی ٹھوکریں لکھی ہیں تو پھر بے اولادی کا دکھ اس سے بڑا نہیں ہے''۔ وہ شخص سانس لینے رکا۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا، باہر کھڑی شاہدہ کی آنکھیں اشک ندامت سے بہہ رہی تھیں۔

''جہاں بزرگ ہستی نہ ہو اس گھر میں تو شیطان بسیرا کر لیتا ہے''۔ اس نے گہری سانس لے کر بات مکمل کی۔

اس اثناء میں ایمن چائے لے کر آئی اور ساتھ میں سوپ کا پیالہ بھی اور اپنے ہاتھ سے دادا کو جا کر سوپ پلانے لگی۔

اجنبی نے چائے پی کر اجازت لی اور کفایت حسین سمیت سارے بچے شفاعت حسین کے گرد بیٹھ گئے۔ ایمن انہیں اپنی کامیابی کے بارے میں بتانے لگی۔ پوتے اور بیٹا پاؤں دبانے لگے اور باہر کھڑی شاہدہ عزم کرنے میں مصروف تھی کہ آج کے بعد وہ سسر سے بدکلامی نہیں کرے گی اور نہ اپنی ہٹ دھرمی اور بدزبانی سے مزید خود کو نظروں سے گرائے گی، کہ اس گھر میں رہنے کے لئے سسر اس کا مضبوط سہارا تھا، جس کے زیر شفقت وہ حکومت کرتی نظر آتی تھی۔

☆..........☆..........☆

نائلہ طارق

سلسلے وار ناول

اے عشق ہمیں برباد نہ کر

''ایک ایک پیسے کے لیے ترساتی ہے، دیکھنا ایک دن تجھے ہی بیچ کر اکٹھی رقم ہتھیاؤں گا۔''
''کس کو بیچے گا؟ دو کوڑی کا بھی نہیں چھوڑا ہے تو نے، میرے بدلے کوئی ایک دمڑی بھی نہیں دے گا تجھے۔'' ایک جھٹکے سے کھڑی ہوتی وہ چلائی تھی جواباً مریل شخص پھر بھڑک کر اس کی جانب بڑھتا یکدم رکا تھا اور



مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا جو پول سے پشت لگائے مریل شخص کو کچھ نوٹ دکھا رہا تھا۔ سب کچھ بھول کر اس شخص نے جھپٹ کر وہ نوٹ تقریباً چھین لیے تھے۔

چادر سر پر ڈالتی وہ اپنے پھٹے ہونٹ سے رستا خون صاف کرتی شدید نفرت سے مریل شخص کو گھور رہی تھی جو روپے گنتا تیزی سے وہاں سے جا رہا تھا۔

"تم نے کیوں روپے دیئے اس بے غیرت کو؟" غصیلے انداز میں وہ اس سے سوال کر رہی تھی جو بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا اور ہنستا ہی چلا گیا تھا۔ دنگ نظروں سے وہ ساکت کھڑی اسے دیکھتی رہی تھی۔ عجیب سی ہنسی تھی اس کی ہنستے ہنستے وہ بے حال ہوتا ادھر ادھر جا رہا تھا۔ اسے ہی دیکھتی وہ سڑک کی جانب بڑھی تھی اور پھر تیز قدموں سے سڑک پار کرتی زنگ آلود گیٹ تک پہنچ گئی تھی۔ اندر جانے سے پہلے اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔

قسط نمبر 2



اسٹریٹ لائٹ کی تیز روشنی میں وہ زمین پر گری تہہ شدہ گرم چادر اٹھا رہا تھا۔

☆......☆

رات کا دوسرا پہر دھیرے دھیرے سرکتا جا رہا تھا۔ فرشی بستر پر تکیے پر سر رکھے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اسے معلوم تھا کہ دائمہ بھی جاگ رہی ہے اس کی بدلتی کروٹوں سے وہ انجان نہیں تھی۔

''دراج! جاگ رہی ہو؟'' دائمہ کی دھیمی آواز پر اس نے خاموشی سے کروٹ اس کی جانب بدل لی تھی۔

''زرکاش بھائی کی باتوں سے بہت ڈھارس ملی ہے لیکن ان کے گھر میں سب کو ان کا ہم دونوں سے قریب ہونا برداشت نہیں ہوگا۔ ہے ناں؟'' دائمہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''مجھ سے کیا پوچھ رہی ہیں۔ آپ کو ہی چند گھنٹوں میں ان پر اندھا اعتبار ہوگیا ہے۔ ان کے کہنے پر آپ بھی مجھے جاب چھوڑنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ کل اگر وہ اپنے گھر والوں کی باتوں میں آ کر ہم سے لاتعلق ہو گئے تو کیا کریں گے ہم؟''

''میرے لیے دوسری جاب طشتری میں لے کر کوئی دروازے پر نہیں آئے گا۔'' وہ بیزاری سے بولتی چلی گئی تھی۔

''دراج! تمہارے اندیشے بجا ہیں مگر بس پتا نہیں میرا دل کیوں گواہی دے رہا ہے کہ زرکاش بھائی ہمارے ساتھ مخلص رہیں گے۔ کوئی ان کو ہمارے خلاف کتنا ہی کیوں نہ بھڑکائے وہ ہم سے تعلق نہیں توڑیں گے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا ہے مجھے ہمارے خلاف بہت کچھ ان کے کانوں میں ڈالا گیا ہے مگر انہوں نے ہمارے خلاف کچھ غلط نہیں سوچا بلکہ وہ مجھ سے حقیقت پوچھ رہے تھے۔ بہت شرمندہ نظر آ رہے تھے۔ تمہارے سامنے انہوں نے معافی بھی مانگی ہم سے، وہ ہمیں اپنا سمجھتے ہیں تب ہی تو انہوں نے تمہیں فیکٹری جانے سے روکا ہے اگر تم پھر بھی فیکٹری گئیں تو کہیں وہ ہم سے بدظن نہ ہو جائیں۔ ہم ان کی بات کو اہمیت نہیں دیں گے تو وہ بھی ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ان کی مرضی کے خلاف نہ جائیں اور پھر میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تم فیکٹری نہ جاؤ۔ تم چلی جاتی ہو تو میرا دل دماغ تمہاری طرف ہی لگا رہتا ہے۔ اندیشے وسوسے پریشان کرتے ہیں۔ آگے کا اللہ مالک ہے۔ کچھ دن گزرنے دو اس کے بعد جو بھی حالات ہوئے، ہم دونوں مل کر کوئی راستہ نکال لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ کے زرکاش بھائی دس سال بعد واپس آئے ہیں، ان کو آزمانے کے لیے دس دن تو دیے جا سکتے ہیں۔'' وہ گہری سانس لے کر بولی تھی۔

''ہم کون ہوتے ہیں کسی کو آزمانے والے زرکاش بھائی بالکل تایا ابو کی طرح مہربان اور محبت کرنے والے ہیں۔ جب وہ یہاں سے گئے تھے تو تم بہت ناسمجھ تھیں مگر مجھے یاد ہے کہ وہ تب بھی ایسے ہی تھے۔ تائی امی اور اپنے باقی بہن بھائیوں سے بالکل مختلف۔'' دائمہ کے لہجے میں زرکاش کے لیے بہت اپنائیت تھی۔ دراج کو حیرت نہیں تھی۔ جانتی تھی کہ دائمہ کے دل میں جگہ بنانے کے لیے دو میٹھے بول ہی کافی ہیں۔

''میں تو پہلی نظر میں ان کو پہچان ہی نہیں سکی تھی۔ اچھی شکل صورت کے تو وہ پہلے بھی تھے مگر اب تو اور زیادہ اچھے اور خوب صورت دکھائی دیتے ہیں۔''

''کچھ زیادہ ہی تعریفیں نہیں ہو رہی ہیں؟'' نیم تاریکی میں دراج نے بغور اس کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

''بے وقوف، ساری دنیا کی بہنوں کو اپنے بھائی اچھے اور پیارے لگتے ہیں۔'' اس کے مشکوک لہجے پر دائمہ

نے خشمگین انداز میں گھر کا تھا۔

''مجھے کیا پتا، میرا تو کوئی بھائی نہیں ہے۔''

''دراج......!'' دائمہ نے ناراضی سے اسے ٹوکا تھا۔

رات دیر سے سونے کی وجہ سے وہ بیدار بھی اس وقت ہوئی جب دن چڑھ آیا تھا۔ دائمہ تو معمول کی طرح جلدی جاگ گئی تھی۔ واش بیسن کے ساتھ ہی کچن کی کھڑکی تھی۔ اسے برش کرتے دیکھ کر دائمہ کھڑکی کے قریب آگئی تھی۔

''دراج! جانتی ہو صبح کیا ہوا؟'' دائمہ کے سرگوشیانہ لہجے پر وہ چونکی تھی۔

''صبح زرکاش بھائی کہیں باہر جارہے تھے میں صحن کی جھاڑو لگارہی تھی تو سامنا ہوگیا۔ پہلے تو انہوں نے مجھ سے یہی پوچھا کہ دراج کو فیکٹری تو نہیں جانے دیا پھر انہوں نے دبے لفظوں میں بتایا کہ وہ کسی کے ہاتھ راشن کا سامان بھیجیں گے مگر فی الحال بس اتنا کہ کسی کی نظروں میں نہ آئے۔ ''کسی'' مطلب اوپر تائی امی وغیرہ۔ مجھے بہت شرمندگی محسوس ہوئی میں ان کو منع کرنا چاہتی تھی مگر وہ رکے نہیں۔ ایک گھنٹہ پہلے وہ دکان کا کوئی ملازم تھا۔ مہینے بھر کا راشن اٹھا لایا۔ ساتھ میں سبزی اور پھل بھی شکر ہے کہ اوپر والوں کی صبح، دوپہر میں ہوتی ہے۔ میں احتیاطاً صحن میں ہی رہی۔ جلدی جلدی میں نے سارا سامان کچن میں ٹھکانے لگایا ہے۔ زرکاش بھائی کے محتاط انداز نے مجھے تو اور فکر میں مبتلا کردیا ہے اگر تائی امی کو بھنک بھی لگ گئی تو کیا کیا باتیں بنیں گی۔'' پریشان لہجے میں تفصیل بتاتی وہ اس کے برش سے فارغ ہوجانے کا انتظار کرنے لگی تھی۔

''ہم نے ان سے بھیک نہیں مانگی، وہ جو کررہے ہیں اپنی مرضی سے کررہے ہیں۔'' چہرے پر پانی ڈالتی وہ سرد لہجے میں بولی تھی اور پھر دوپٹے سے ہاتھ خشک کرتی کچن میں ہی آگئی تھی۔

شاپرز میں موجود فروٹس کا جائزہ اس نے لیا تھا اور پھر چھری اٹھا کر فروٹس کاٹنے لگی تھی۔

''وہیں کھڑے رہ کر کھانا یہ پھل پلیٹ اٹھا کر صحن میں نہ نکل جانا۔'' دائمہ کی تاکید پر اس کے تاثرات بگڑ رہے تھے۔

''اس سے تو بہتر تھا کہ آپ ان کو یہ سب بھیجنے سے منع کردیتیں۔ چند روپے ہمارے لیے خرچ کرنے سے وہ کنگال نہیں ہوجائے گا۔ دس سال میں روپے بنانے کی مشین بن چکا ہے وہ، بہت کچھ سمیٹ کر لایا ہے۔ ایسے ہی نہیں سب بچھے جارہے اس کے قدموں میں، کوئی احسان نہیں کررہا وہ ہم پر۔ اپنے گھر والوں کے کالے کرتوتوں کا ازالہ ہے یہ سب اور کچھ نہیں۔'' اس کے تیز تلخ لہجے پر دائمہ حق دق نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆......☆

دو دن کس وحشت میں گزرے یہ وہی جانتا تھا۔ دل بار بار اسے دیکھنے کے لیے مچل رہا تھا۔ گھر میں سب نے ہی اس کی غائب دماغی اور خاموشی کو محسوس کیا تھا۔ وہ خود اپنی حالت پر حیران تھا اب تک وہ خود کو ایک مضبوط میچورڈ مرد سمجھتا رہا تھا مگر ایک چھوٹی سی لڑکی نے کس طرح اس کے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ رات میں اس کے لیے سونا کٹھن ہوگیا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی اس کا شرمایا لجایا معصوم سا چہرہ سامنے آجاتا، سکون جیسے رخصت ہی ہوگیا تھا۔ بے چینی حد سے سوا ہوئی تو اس نے راسب کے گھر فون بھی کیا کہ شاید اس کی آواز سن کر ہی دل کو کچھ قرار آجائے مگر فون ندا نے ریسیو کیا۔ ان سے خیر خیریت دریافت کرتے ہوئے وہ رجاب

کا نام بھی زبان پر لانے کی جرأت نہیں کر سکا تھا۔ تیسرے دن اس کا ضبط بالکل ختم ہو چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ کسی بھی طرح رجاب کو اپنے گھر لے آئے گا۔ اس کی دونوں بہنیں اپنے اپنے سسرال سے بچوں کے ہمراہ رہنے آئی ہوئی تھیں۔ ساتھ مل بیٹھنے کے بہانے وہ کم از کم اسے دیکھ تو سکے گا۔ ویسے بھی اگلا دن چھٹی کا تھا اور اسے یقین تھا کہ راسب کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ راسب سے وہ ہمیشہ بہت اٹیچڈ رہا تھا مگر ان کی رعب دار شخصیت سے وہ کافی مرعوب بھی رہتا تھا۔ اس لیے احتیاط ضروری تھی۔ اپنی بہن کے بچوں کے ہمراہ جب وہ رومیل اور رجاب کو ساتھ لے جانے کے ارادے سے پہنچا تو راسب نے واقعی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ حاذق کا تو دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا اس بات سے انجان کہ رجاب کتنی بے دلی سے راسب کے حکم پر جانے کے لیے تیار ہوئی ہے۔ کمرے میں وہ ندا کے سامنے تن فن کرتی پیر پٹختی رہی تھی مگر ندا بھی کیا کر سکتی تھیں سوائے اسے پیار سے سمجھانے کے اور پھر ایک ہی دن کی بات تھی۔

قیامت جیسے سخت اور دشوار دو دن گزارنے کے بعد حاذق کو لگ رہا تھا کہ وہ پوری طرح سے زندہ ہے، اس کی آنکھیں رجاب کو دیکھ دیکھ کر سیر نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ رجاب اس کے کتنے قریب فرنٹ سیٹ پر موجود تھی۔ اس کی قربت میں کیسا سرور اور نشہ تھا۔ اس کے ان چھوئے پھولوں جیسے پاکیزہ وجود کی خوشبو میں کیسا کیف آگیں احساس تھا، ڈرائیونگ کے دوران وہ مستقل بیک ویو مرر سے اس کا دیدار کر رہا تھا۔ یہ فطری سی بات تھی کہ رجاب بھی اس کی نگاہوں میں جھلکتے جذبوں سے انجان نہیں تھی۔ سمٹ کر بیٹھی وہ کچھ ہراساں سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر رنگ آ رہا تھا۔ ایک جا رہا تھا۔ ایسے میں وہ پوری کی پوری حاذق کے دل میں اترتی چلی گئی تھی۔

''رجاب......!'' اس کی مدھم پکار میں جو کچھ تھا وہ رجاب کو مزید ہراساں کر گیا تھا۔

''کوئی بات کرو، اتنی خاموش کیوں ہو؟ کیا میرے ساتھ جانا تمہیں اچھا نہیں لگ رہا......؟'' حاذق کا لہجہ محبت سے بھرپور تھا۔

''ایسا تو نہیں ہے۔'' نظر جھکائے وہ بمشکل بول سکی تھی۔

''پھر......کیا وجہ ہے خاموشی کی؟'' اس کے سوال پر وہ چپ رہی تھی۔

''جانتی ہو، کوئی تمہاری آواز سننے کے لیے ترس رہا ہے؟'' حاذق کا گہرا لہجہ اسے پریشان کر گیا تھا۔

''ویسے تم بڑی بے مروت کزن ہو۔ کبھی توفیق نہیں ہوئی تمہیں کہ فون پر سلام دعا ہی کر لیتیں۔ میری تو جب جب راسب بھائی سے بات ہوئی میں تم سمیت سب کے بارے میں ہی پوچھتا تھا۔'' حاذق کا شکایتی لہجہ اسے بہت عجیب لگا تھا۔

''میں فون پر کسی سے بات نہیں کرتی۔ ہمیشہ آغا جان یا بھابی فون ریسیو کرتی ہیں۔'' وہ مدھم لہجے میں بولی تھی۔

''وہ کیوں؟'' حاذق نے حیرت سے کہا تھا۔

''پتا نہیں......بس آغا جان کی اجازت نہیں ہے۔ وہ غصہ کرتے ہیں رانگ کالز بھی آ جاتی ہیں تو اس لیے......''

''مطلب......یہ رانگ کالز کے خدشے میرے اور تمہارے درمیان رہے۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا تھا۔

''گاڑی کی اسپیڈ بڑھ نہیں سکتی؟'' بالآخر سست روی سے اکتا کر رجاب کو بولنا پڑا تھا۔

''کیوں نہیں بڑھ سکتی بالکل بڑھ سکتی ہے۔ یہ تو اڑ بھی سکتی ہے اگر آپ بے ہوش نہ ہونے کا وعدہ کریں۔'' حاذق کے سنجیدہ لہجے پر رجاب نے حیرت سے اسے دیکھا تھا مگر اگلے لمحے ہی بے ساختہ مسکراتی وہ اسے سرشار

کر گئی تھی۔

"تمہاری مسکراہٹ بہت خوب صورت ہے شاید اسی لیے کم مسکراتی ہو۔" حاذق کی پرتپش نگاہوں نے اس کی مسکراہٹ گم کردی تھی۔ پتا نہیں کیوں رجاب کو یہ تعریف بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔

رومیل تو یاتی بچوں کے ساتھ مگن تھا جب کہ وہ زبردستی سب کے درمیان موجود ماحول کا حصہ بنا رہنے کی کوشش میں تھی۔ مگر حاذق کی موجودگی، اپنا طواف کرتی اس کی نگاہیں اور اس کا بار بار مخاطب کرنا رجاب کو گھبراہٹ میں مبتلا کررہا تھا۔ جانے کیا تھا اس کی نظروں میں کہ رجاب کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگتی رہی تھیں۔ وہ واقعی اس کی نظروں سے چھپنا یا دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ یہ سب جو بھی تھا اسے ڈسٹرب کررہا تھا۔ بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایسا کیسے ہوسکتا تھا کہ رجاب کا ہچکچانا اپنی جانب دیکھنے سے بھی احتراز کرنا حاذق کو نظر نہیں آتا۔ وہ مکمل دل و جان سے اس کی طرف سارا وقت متوجہ تھا۔ اس کی گھبراہٹ وہ اس کے چہرے سے ہی پڑھ سکتا تھا مگر اس کے باوجود وہ خود پر اختیار نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ کبھی تو رجاب سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملے۔ یقیناً اس کی اس خواہش میں بہت شدت تھی جب ہی تو رات گئے بالآخر اسے یہ سنہری موقع مل گیا تھا۔

محتاط قدموں کے ساتھ وہ لاؤنج میں آیا تھا جہاں صوفے پر کشن گود میں رکھے بیٹھی بڑی وہ محویت سے وائلڈ لائف پر بنی ڈاکومینٹری دیکھ رہی تھی۔ لاؤنج میں گھر کے دوسرے بچے بھی تھے مگر وہ ایک ایک کرکے لاؤنج میں ہی سو چکے تھے۔ بری طرح چونکتے ہوئے رجاب کو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ سانس روکے وہ اسے دیکھ رہی تھی جو قریب ہی براجمان ہوگیا تھا۔ بے اختیاری میں ہی وہ گود میں رکھا کشن اپنے اور اس کے درمیان رکھتی پیچھے سرک گئی تھی اور وہ جو اس کی کانچ جیسی سبز آنکھوں میں ڈوب رہا تھا کچھ چونک کر اس کی اس حرکت یا گریز کو نوٹ کرچکا تھا۔

"رجاب! تم نا سمجھ نہیں ہو۔ جان چکی ہو کہ میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں۔" اس کے فق چہرے کو دیکھتا وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

"تمہارا مجھ سے دور دور رہنا، مجھے نظر انداز کرنا، مجھے ہرٹ کررہا ہے۔"

"ایسا تو نہیں ہے۔" نظر چرائے وہ بمشکل بولی تھی جواباً حاذق بس اسے دیکھ رہا تھا۔ رجاب کو اپنا دل حلق میں آتا محسوس ہوا تھا۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔" یکدم ہی وہ صوفے سے اٹھی مگر اتنی ہی تیزی سے حاذق نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جس جھٹکے سے واپس بٹھایا اس کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی تھی۔

"میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔" حاذق کی گرفت سے کلائی نکالنے کی کوشش میں اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ سرخ ہوتے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔ حاذق کو اس لمحے وہ خوفزدہ ہرنی جیسی نظر آرہی تھی۔ وہ اپنا غصہ بھول گیا تھا۔ اس کی دبی دبی سسکیاں اور چہرے پر پھسلتے موتی دل کو مضطرب کرگئے تھے۔

"تمہارا ہاتھ پکڑا ہے اس لیے رو رہی ہو؟ میرا چھونا برا لگا ہے تمہیں؟" نرم لہجے میں وہ پوچھ رہا تھا مگر وہ ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتی سسکیاں روکنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

"جب تک مجھے تمہارے رونے کی وجہ پتا نہیں چلے گی۔ میں تمہارا ہاتھ نہیں چھوڑوں گا۔" حاذق کی دھمکی نے اس کے آنسو بڑھا دیئے تھے۔

''آپ غصے میں ہیں۔'' وہ کانپتی آواز میں بولی تھی۔
''تو......اس میں رونے والی کیا بات ہے؟'' وہ حیران ہوا تھا۔
''مجھے ڈر لگتا ہے۔ آغا جان غصہ کرتے ہیں تو بھی رونا آتا ہے۔'' وہ بولی تھی۔
''مجھے تھوڑا سا غصہ آیا تھا۔ میں یہاں تم سے بات کرنے آیا تھا اور تم نے بغیر جا رہی تھیں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ تم پھر مجھے ہرٹ کرو گی لیکن میں اپنے غصے کے لیے تم سے سوری کرتا ہوں، میں آئندہ کبھی غصہ کر کے تمہیں ڈرنے کا موقع نہیں دوں گا۔'' نرمی سے بولتے ہوئے حاذق نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔
''رجاب! جو لوگ ہمارے لیے اپنے دل میں اچھے جذبات رکھتے ہیں۔ ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیے ان کے ساتھ سرد مہری سے پیش نہیں آنا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ تم میری بات کا مطلب سمجھ رہی ہو گی۔'' حاذق نے گہرے سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔ دوسری جانب اس نے بھیگا چہرہ صاف کرتی جھکی نظروں سے سرخ مخملی باکس کو دیکھا تھا۔
''یہ تمہارا گفٹ ہے۔''
''مگر کیوں......؟'' وہ تذبذب میں مبتلا تھی۔
''میں سب کے لیے گفٹس لایا ہوں۔ ندا بھابی کو بھی تو تمہارے سامنے گفٹ دیا تھا۔'' حاذق نے حیرت سے اسے یاد دلایا تھا۔
''اتنا ڈری سہمی کیوں رہتی ہو تم......؟ یا پھر مجھ سے بات کرنا اچھا نہیں لگتا تمہیں؟''
اس کے سوال پر وہ سر جھکائے بس خاموش تھی۔ وہ اندر ہی اندر لاؤنج سے نکل جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔
''رجاب! کیا میں اچھا انسان نہیں لگتا تمہیں؟'' بغور حاذق نے اس کی جھکی ہوئی بھیگی پلکوں کو دیکھا تھا۔
''آپ......اچھے ہیں۔'' رجاب پھنسی پھنسی آواز میں بولی تھی جب کہ حاذق کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھی تھیں۔
''اور تم بہت زیادہ اچھی ہو۔ اس دنیا سے بھی زیادہ۔'' وارفتہ نگاہوں سے اسے حاذق نے دیکھا تھا اور پھر باکس کھول کر خوب صورت جھلملاتا بریسلیٹ انگلیوں میں اٹھایا تھا۔
''تمہیں جیولری پسند ہے؟'' اس کے سوال پر رجاب نے اثبات میں سر کو ہلایا تھا۔
''یہ بریسلٹ اچھا لگا تمہیں؟'' اس بار بھی نظر جھکائے اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
''اسے میں تمہارے ہاتھ میں پہنا دوں؟'' جواباً اس کے فوراً نفی میں سر ہلانے پر وہ بے ساختہ مسکرایا تھا اور بریسلٹ واپس باکس میں رکھ کر اس کے حوالے کر دیا تھا۔
''تم کیا ہمیشہ سے اتنی ہی بے وقوف ہو؟'' مسکراتی نظروں سے حاذق نے اس کے جھکے سر کو دیکھا تھا۔
''اب سر نہیں ہلے گا تمہارا۔''
ایک چپت اس کے سر پر لگاتا وہ صوفے سے اٹھ گیا تھا۔ ''میں جا رہا ہوں، اب تمہیں کہیں بھاگنے کی ضرورت نہیں آرام سے ٹی وی دیکھ سکتی ہو۔'' اسے تاکید کرتا وہ جاتے جاتے رکا تھا۔ ''اور ہاں صبح مجھے یہ بریسلٹ تمہارے ہاتھ میں نظر آنا چاہیے۔'' چور نظروں سے رجاب نے اس کی پشت کو دیکھا تھا جو وہاں سے جا رہا تھا۔ شدید ناگواری کے ساتھ وہ باکس کو دیکھتی رہی تھی۔ حاذق کے دوبارہ وہاں آ جانے کا اسے خدشہ تھا لہٰذا اسے کمرے میں اپنی نانی کے پاس چلے جانا ہی ٹھیک لگا تھا۔ حالانکہ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور

بھاگ چکی تھی۔

دوسرے دن اس کی یہی کوشش تھی کہ کسی جگہ تنہا نہ بیٹھے اور اس جگہ زیادہ دیر نہ رکے جہاں حاذق موجود ہو۔ اس نے شکر کی سانس لی تھی کہ راسب شام ہوتے ہی اسے اور رذحیل کو ساتھ لے جانے آ پہنچے تھے۔ اس کا اپنے گھر سے جانا حاذق کو ڈسٹرب ضرور کر رہا تھا مگر دل کو اس چیز کی بہت خوشی تھی کہ اس کا گفٹ کیا گیا بریسلٹ رجاب کے ہاتھ میں موجود تھا۔

☆......☆

وہ کس طرح وہاں تک آئی تھی۔ یہ وہی جانتی تھی ورنہ تو ایک قدم بھی چلنا محال تھا۔ پول سے ٹیک لگائے وہ بغور لڑکی کے چہرے پر پھیلے تکلیف دہ تاثرات کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ اپنے روپے پکڑو۔ میں نہیں جانتی تم نے اسے کتنے روپے دیے تھے مگر میرے پاس بس اتنے ہی ہیں۔'' تکلیف کی لہروں کو ضبط کرتی وہ پھولی سانسوں کے درمیان بولی تھی۔ دوسری جانب وہ کچھ کہتے کہتے رکا تھا اور پھر خاموشی سے وہ روپے لے لیے تھے۔ لڑکی واپس پلٹ کر جانے کے بس چند قدم ہی چلی تھی اور اگلے ہی پل ہلکی سی کراہ کے ساتھ گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئی تھی۔ دونوں ہاتھ پہلوؤں میں باندھے وہ اس بلا کی ٹھنڈ میں پسینہ پسینہ ہوگئی تھی۔ کل کی لاتوں اور ٹھوکروں نے کچھ اثر تو دکھانا ہی تھا۔

''اس حد تک بڑھنے ہی کیوں دیتی ہو اسے؟ کسی دن سر ہی پھاڑ دو اس کا تم پر ہاتھ اٹھانا بھول جائے گا۔'' دو قدم آگے بڑھتا وہ مشورہ دے گیا تھا۔

''کوئی اثر نہیں ہوگا اس پر۔ نشہ پورا کرنے کے لیے وہ کسی حد تک بھی جا سکتا ہے۔'' درد کو ضبط کرتی وہ تلخی سے بولی تھی۔

''مگر اس طرح تو کسی دن وہ تمہیں جان سے ہی مار ڈالے گا۔''

''اچھا ہے مار ڈالے، روز روز مرنے سے بہتر ہے ایک ہی بار خلاصی ہو جائے۔'' اپنے پیروں پر اٹھتی وہ بولی تھی۔

''تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے تھا۔''

''مجھے مشورے نہ دو۔ جا کر اپنا کام کرو۔'' لڑکی نے سڑک پر رکتی گاڑی کو دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا تھا۔ ''جانے اس گاڑی کے اندر کون کتنی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا ہو۔'' لڑکی کے طنزیہ تلخ لہجے پر وہ کافی ناگواری سے چند لمحوں تک اسے دیکھ رہا تھا جو تیزی سے سڑک کراس کرتی دور جا رہی تھی۔

☆......☆

ٹیکسی سے اترتے ہی اس نے سامنے عمارت کی جانب دیکھا تھا اور اسی طرف نظر جمائے پیچھے ہٹتا پول کے قریب ہوگیا تھا، گزرے دو دن میں وہ لڑکی اسے دکھائی نہیں دی تھی۔ کھڑکی میں بھی نہیں۔ گہری سانس لیتا وہ چونک کر اس درخت کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی گھنی شاخوں تلے تاریکی میں وہ موجود تھی۔

''آج تم 12 بجنے سے پہلے ہی آ گئے ہو۔'' درخت کے چوڑے تنے سے پشت لگائے وہ اس سے مخاطب تھی جو معمول کی طرح آج بھی زرق برق لباس میں لشکارے مار رہا تھا۔

''تم اب کیسی ہو؟'' اس کی بات نظر انداز کیے وہ بولا تھا۔

''مجھے چھوڑو، عادت ہو چکی ہے دو دن میں گر پڑ کر خود ہی ٹھیک ہو جاتی ہوں۔'' وہ استہزائیہ لہجے میں بولی

تھی۔
''تمہارے بھائی کو نشے کی لت کب سے لگی ہے؟''
''پتا نہیں لیکن جب تک خبر ہوئی بہت دیر ہو چکی تھی۔ نشے کے لیے اس نے جبر کر کے گھر کی جو چند چیزیں تھیں سب بیچ دیں اور جب کچھ نہ رہا مجھ سے ہاتھا پائی کر کے روپے چھیننے شروع کر دیے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بتا رہی تھی۔
''جب تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں تو کچھ روپے دے دیا کرو اسے۔'' وہ بولا تھا۔
''آسمان سے روپے برسیں تو اس کے حوالے کروں۔ میرے مرحوم باپ کی پنشن اور میری سلائیوں سے فلیٹ کا کرایہ نکلنے کے بعد بیمار ماں کی دواؤں کا بندوبست اور دو وقت کی روٹی کا انتظام بھی مشکل سے ہوتا ہے۔''
اس کے بتانے پر وہ کچھ نہیں بولا خاموشی سے سگریٹ سلگانے لگا تھا۔
''سنو......! کیا تمہارے ماں باپ ہیں؟'' لڑکی اس کے سامنے آتی پوچھ رہی تھی مگر وہ ان سنی کیے ارد گرد نظر دوڑا تا رہا تھا۔
''کیا تم اپنے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتے؟''
''کیوں بتاؤں کچھ تمہیں اپنے بارے میں؟'' وہ یکدم ناگواری سے بولا تھا۔
''اپنا نام ہی بتا دو۔ میں جاننا چاہتی ہوں۔'' لڑکی نے کہا تھا۔
''نام کیوں جاننا چاہتی ہو۔ شادی کرنی ہے کیا؟'' وہ اکھڑے انداز میں بولا تھا۔
''پہلے مجھے یہ تو سمجھ آئے، تمہاری بارات جائے گی یا آئے گی۔''
''اس نشئی کے ہاتھوں سے بچ جاتی ہو مگر میرے ہاتھوں دو منٹ میں موت کے گھاٹ اترو گی۔'' غصیلی نظروں سے اسے گھورتا وہ غرایا تھا جب کہ لڑکی ذرا بھی خوفزدہ ہوئے بغیر اسے دیکھتی رہی تھی۔
''کیا دیکھ رہی ہو؟'' وہ بھڑکا تھا۔
''تمہیں مجھے تمہارے کپڑے بہت اچھے لگتے ہیں۔''
''سیدھی طرح نکلو یہاں سے، اپنے گھر میں جا کر بیٹھو، ڈر نہیں لگتا تمہیں؟'' وہ بری طرح اسے جھڑک گیا تھا۔
''میری اب تک کی ساری زندگی اسی سڑک کو تکتے گزری ہے۔ مجھے یہاں کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی تھی اور پھر اسے دیکھا تھا۔
''میں نے جو چادر تمہیں دی تھی وہ کہاں ہے؟'' اس کے سوال پر وہ فوراً ہی اپنے ہینڈ بیگ پر جھکا تھا اور اگلے ہی لمحے بیگ سے چادر نکال کر لڑکی کی سمت اچھال دی تھی۔
''اب تم یہاں سے چلی جاؤ۔'' سخت بگڑے لہجے میں وہ اسے جانے کا اشارہ بھی کر رہا تھا۔
''میں نے یہ چادر واپس نہیں مانگی، میں تو صرف یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ تم اسے پہنتے کیوں نہیں۔'' لڑکی حیرت سے بولتی رکی تھی کیونکہ وہ ان سنی کیے رخ موڑتا دوسری طرف متوجہ تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے فضاء میں اڑاتے ہوئے وہ اس لمحے بری طرح چونکا تھا جب چادر کی گرمی اس نے اپنے شانوں کے گرد محسوس کی اسے پلٹ کر لڑکی کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا۔
''سردی لگنے سے تم بیمار بھی ہو سکتے ہو۔ اس چادر کو پہن کر بھی زیادہ بہتر لگ رہے ہو۔'' پیچھے ہٹتے ہوئے لڑکی نے کہا تھا اور پھر اس کے سامنے سے ہٹتی ایک پل کو رکی تھی۔ ''مجھے تم سے یہ کہنے کا کوئی حق تو نہیں ہے مگر

پھر بھی میں کہنا چاہتی ہوں کہ..... صرف خدا کے لیے اس خراب راستے سے واپس پلٹنے کی کوشش کرو۔" ہلکی آواز میں بول کر لڑکی رکی نہیں تھی جب کہ اپنے وجود کے گرد چادر کی گرمی محسوس کرتا وہ اسے دیکھ رہا تھا جو زنگ آلود گیٹ کے پیچھے غائب ہو رہی تھی۔

☆......☆

کچن سے پانی کا گلاس لے کر وہ تیزی سے دراج کی طرف آئی تھی۔

"تم کیوں اٹھ کر آ گئیں۔ میں پانی اندر ہی لا رہی تھی۔" پیار سے اسے ڈپٹتے ہوئے دائمہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر بٹھایا اور گلاس اسے تھما دیا تھا۔ تشویش زدہ نظروں سے اس کے زرد چہرے کو دیکھتی وہ سیڑھیوں کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔ نیچے اترتے زرکاش نے اشارے سے دائمہ سے دراج کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تھا دوسری جانب پانی کے گھونٹ لیتی دراج کی قوتِ شامہ تک جیسے ہی مخصوص کولون کی مہک پہنچی وہ فوراً ہی تخت سے اٹھ کر کسی بھی جانب دیکھے بغیر کمرے کے اندر چلی گئی تھی۔

کچھ دیر بعد جب دائمہ کمرے میں آئی تو وہ تخت پر آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹی ہوئی تھی۔

"زرکاش بھائی تمہاری طبیعت کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔" اس کے قریب بیٹھتی وہ بتا رہی تھی۔

"دراج! وہ اتنی فکر رکھتے ہیں ہماری تم کم از کم ان سے سلام دعا ہی کر لیا کرو۔ کیا سوچتے ہوں گے وہ۔" اس کے توجہ نہ دینے پر دائمہ نے مزید کہا تھا۔

"نظر آتا ہے کہ وہ کتنی فکر رکھتے ہیں ہماری۔ اپنے گھر والوں سے چھپ کر خیرات دیتے ہیں ہمیں۔"

"تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟"

"تو اور کیا سوچوں؟ ان کو اگر ہماری اتنی ہی فکر ہے تو کیوں سوال نہیں کرتے اپنے گھر والوں سے ان زیادتیوں کے لیے جو ان لوگوں نے ہمارے ساتھ کی ہیں۔" وہ بگڑے لہجے میں بولی تھی۔ "روز اوپر ہنسی، ٹھٹھے لگائے جاتے ہیں۔ محفلیں جمتی ہیں۔ کیوں ان کی جرأت نہیں ہوتی۔ جھوٹے منہ ہی آپ کو اور مجھے اپنے گھر بلانے کی؟ اس آدمی کا دوغلا پن دکھائی نہیں دیتا آپ کو؟"

"دراج! وہ بھی سب دیکھ رہے ہیں۔ اپنے گھر والوں کو بھی جانتے ہیں اگر وہ خاموش ہیں تو اس لیے کہ وہ گھر میں کوئی ہنگامہ، کوئی لڑائی جھگڑا نہیں چاہتے۔ وہ نہیں چاہتے کہ مزید کچھ ایسی بات ہو جو میرے اور تمہارے لیے تکلیف کا باعث بنے۔" دائمہ نے آج پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی جواباً وہ ناگواری سے دوسری طرف کروٹ بدل گئی تھی۔

"اچھا...... چھوڑو سب۔ یہ موبائل فون دیکھو۔" دائمہ کی آواز پر وہ فوراً ہی اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی اور اگلے ہی پل اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے دائمہ سے فون لے لیا تھا۔

"ابھی دے گئے ہیں زرکاش بھائی، کہہ رہے تھے کہ کوئی بھی مسئلہ ہو میں ان کو بلا جھجک کال کر لیا کروں اور تمہاری طبیعت کے بارے میں بھی ان کو ضرور بتاتی رہوں۔ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ فیکٹری میں دراج کی فرینڈز بھی بن گئی ہوں گی۔ وہ روز ان سے مل نہیں سکتی مگر اس فون کے ذریعے روز ان سے بات کر سکتی ہے۔"

دائمہ اسے بتا رہی تھی جو بہت توجہ سے فون سیٹ کا جائزہ لے رہی تھی۔ فون بہت مہنگا اور خوب صورت بناوٹ کا نظر آ رہا تھا۔ دائمہ کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ دراج کو فون بہت پسند آیا ہے۔

"اب دیکھو ان کو تمہاری کتنی پرواہ ہے۔ وہ تو اس چیز کے لیے ہی تم سے بہت خوش ہیں کہ ان کے ایک بار

کہنے پر ہی تم نے فیکٹری کی جاب چھوڑ دی...... اگر تم ان سے اچھے سے بات کرو گی تو ان کا یہ شک دور ہو جائے گا کہ ان کے گھر والوں کی طرح تم ان سے بھی بیزار ہو۔'' دائمہ کو اچھا موقع ملا تھا اپنی بات کہنے کا۔

''تمہارے لیے کچھ کھانے کے لیے لے آؤں۔ ٹیبلیٹ کھاؤ گی تو بخار کچھ کم ہوگا......''

''آپ جا کر اپنا کام کریں۔ مجھے ابھی کچھ نہیں کھانا۔'' سیل فون میں مگن وہ جھلائے انداز میں بولی تھی۔

دائمہ گہری سانس لے کر اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔

اس کی طرف سے دائمہ کی تشویش بے جا نہیں تھی۔ رات تک اس کا بخار زیادہ ہو گیا تھا۔ التجاؤں اور ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود وہ کچھ کھانے کے لیے راضی تھی نہ ہی دائمہ کے اصرار پر ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے راضی ہوئی تھی۔ تکیے میں منہ چھپائے وہ بس روئے جا رہی تھی۔ باہر سے ابھرتی پکار پر دائمہ اپنے آنسو خشک کرتی دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر زرکاش پریشان ہوا تھا مگر خاموشی سے اس کی تقلید میں کمرے میں آ گیا تھا۔

''صبح سے اس نے ایک نوالہ تک نہیں کھایا ہے۔ پتہ نہیں کیا کرنا چاہتی ہے یہ اپنے ساتھ۔ کوئی بات نہیں کر رہی بس روئے جا رہی ہے۔'' گلوگیر لہجے میں دائمہ اسے بتا رہی تھی۔

''یہ رو رہی ہے اور تم اس کا ساتھ دے رہی ہو۔ بہت ہی عقلمند ہو۔'' زرکاش نے خشمگین لہجے میں اسے گھورا تھا اور پھر تخت کے کنارے بیٹھ گیا تھا جہاں وہ چادر میں چہرہ چھپائے گھٹی گھٹی سسکیاں لے رہی تھی۔ زرکاش کی پکار پر بھی اس نے چادر نہیں ہٹائی تو وہ خود ہی اس کے چہرے سے چادر کھینچ گیا تھا۔

''دراج اٹھ کر بیٹھو اور مجھے بتاؤ کیا بات ہے جو رو رہی ہو۔ دیکھو تمہاری وجہ سے دائمہ بھی رو رہی ہے۔ اچھا لگتا ہے اس طرح پریشان کرنا۔'' زرکاش نرم لہجے میں بولا تھا مگر وہ چہرہ تکیے میں ہی چھپائے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکالنے کی کوشش میں تھی۔

''پیار سے بول رہا ہوں۔ اٹھ کر بیٹھو ورنہ میں ایک تھپڑ بھی لگا سکتا ہوں۔'' زرکاش کے کچھ سخت لہجے پر بالآخر وہ اٹھ بیٹھی تھی۔

''کوئی اتنا تیز بخار نہیں ہے۔ بدلتے موسم کا اثر ہے مگر کچھ کھاؤ گی نہیں دوا نہیں لو گی تو طبیعت تو خراب ہونی ہے۔'' اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بخار کی شدت کا اندازہ لگاتا وہ بولا تھا۔

''میں صبح سے کوشش کر رہی ہوں مگر یہ کچھ کھانے پینے کے لیے تیار بھی تو ہو۔'' دائمہ نے کہا تھا۔

''آپ پوچھیں اس سے کیا بات ہے ورنہ یہ اس طرح نہیں کرتی۔''

''پتہ نہیں تم کیسے کوشش کر رہی تھیں۔ ابھی دیکھنا میں کہوں گا تو یہ کھانا بھی کھائے گی۔ ٹیبلیٹ بھی لے گی اور مجھ سے بات بھی کرے گی۔'' مصنوعی ناراضی سے وہ دائمہ سے بولا تھا۔

''تم بالکل بھی اس کا ٹھیک طرح خیال نہیں رکھتیں۔ یہ صبح سے بھوکی ہے اور تم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہو۔ اب جاؤ اس کے لیے جلدی سے کچھ بنا کر لاؤ۔ ٹیبلیٹس میں اسے خود کھلاؤں گا۔ جاؤ کچن میں میں اسے خود کھلاؤں گا۔ ہم دونوں کو تمہارے سامنے کوئی بات نہیں کرنی۔'' زرکاش کی ہدایت پر وہ کچھ اطمینان کی سانس لے کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

''ہاں بھئی۔ اب بتاؤ کیا بات ہے؟ مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے نہیں چھپاؤ گی مگر پہلے رونا بند کرو۔'' زرکاش کے نرم لہجے پر وہ چند لمحوں تک اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرتی رہی تھی اور پھر سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا تھا

جو متفکر نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
''سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور سب کی طرح آپ بھی۔'' بھرائی آواز میں بولتے ہوئے اس کی آنکھوں سے مزید آنسو ٹپکے تھے۔
''ہرگز نہیں کوئی تم سے نفرت نہیں کرتا۔ اور تم میری اتنی پیاری چھوٹی سی گڑیا ہو ایسا سوچا بھی کیوں تم نے؟'' اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا وہ بولا تھا۔
''کیونکہ میں نے آپ کے گھر میں سب سے لڑائی کی تھی۔ اس لیے آپ بجیا سے بات کرتے ہیں مجھ سے نہیں۔''
''پہلی بات تو یہ کہ میرے یہاں آنے سے پہلے اس گھر میں جو کچھ ہو چکا ہے اس کا ذکر کرنا بیکار ہے۔ وہ سب کچھ بات بڑھانے سے بہتر ہے کہ اسے ختم کر دیا جائے دوسری بات یہ کہ یہ بالکل غلط ہے کہ میں تم سے بات نہیں کرتا۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں مگر میں ایک طویل عرصے بعد تمہارے سامنے آیا ہوں۔ تمہاری جھجک کو محسوس کر سکتا ہوں اس لیے زبردستی تمہیں مخاطب کر کے تمہیں پریشان نہیں کرتا۔ تم اس گھر میں سب سے چھوٹی ہو۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سب تمہیں ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھتے مگر...... شاید یہ شرمندگی بھی مجھے تمہاری طرف بڑھنے سے روکتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرا دل تمہاری طرف سے صاف نہیں۔ مجھے اپنی دونوں بہنوں اور دائمہ سے زیادہ تمہاری پرواہ ہے۔ مجھے تم چاروں سے ایک جیسی محبت ہے۔'' اس کے نرم لہجے پر دراج نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔
''مگر مجھے آپ سے وہ محبت نہیں چاہیے جو آپ کو شنزا باجی، تنزا آپی اور بجیا سے ہے۔'' اس کے مدھم لہجے میں کچھ تھا جس نے زرکاش کو دنگ کر دیا تھا۔
''میں اتنی چھوٹی بھی نہیں جتنا آپ مجھے سمجھتے ہیں۔ دو سال سے میں آپ کے یہاں واپس آنے کی دعائیں دن رات کرتی رہی ہوں۔ اپنے خوابوں میں ہر رات آپ کا ہی چہرہ دیکھتی رہی ہوں۔ آپ سے باتیں کرتی رہی ہوں۔'' ساکت نظروں سے وہ اسے دیکھ رہا تھا جو تکیے کے نیچے سے کچھ نکال رہی تھی۔
''آپ کی اس تصویر سے میں دن میں کئی بار باتیں کرتی ہوں۔ ہر وہ بات جو میں کسی اور سے نہیں کر سکتی۔'' زرکاش کی ہی تصویر دکھاتی وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ بولی تھی۔
''دراج...... یہ...... یہ سب کیا ہے؟'' زرکاش کو اپنی ہی آواز اجنبی لگی تھی۔ اس کا دماغ مکمل طور پر ماؤف ہو چکا تھا۔
''یہ وہ محبت ہے جو آپ کو مجھ سے نہیں ہے۔'' سسکتے لہجے میں بول کر دراج نے تصویر واپس تکیے کے نیچے سرکائی تھی۔ ''میں اپنی حیثیت جانتی ہوں، میں زمین ہوں آپ آسمان ہیں مگر آپ کو میرا یقین کرنا ہوگا۔ مجھے آپ کی تقسیم شدہ روایتی محبت نہیں چاہیے۔'' سر جھکائے وہ قطعی لہجے میں بولی تھی۔ زرکاش بالکل گنگ تھا۔ وہ یقیناً کچھ کہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ دائمہ کی آمد پر بھی اس کی غائب دماغی برقرار رہی تھی مگر دائمہ کے سامنے ایسے اپنے ہواس مجتمع کرنے ہی تھے۔ دراج کی جانب دیکھے بغیر زرکاش نے اسے وہ کھانا کھانے کی تاکید کی تھی جو دائمہ لے کر آئی تھی۔ دراج نے خاموشی سے کھانا کھانا شروع کر دیا تھا۔
''ٹھیک ہے یہ ٹیبلٹس تم اسے کھلا دو، صبح تک اگر بخار نہ اترے تو میرے پوچھنے سے پہلے مجھے فون کر دینا، رات میں بھی اگر ضرورت ہو تو لازمی مجھے فون کرنا۔'' ٹیبلٹس چیک کرنے کے بعد دائمہ کے حوالے کرتے ہوئے اس نے تاکید کی تھی اور کسی بھی جانب دیکھے بغیر کمرے سے نکل آیا تھا۔

''اس نے آپ کو بتایا کوئی بات تھی کیا؟'' اس کے پیچھے باہر آتی وائمہ نے پوچھا تھا۔ زرکاش کو سمجھ نہیں آیا کہ اسے کیا کہہ کر مطمئن کرے مگر کچھ تو کہنا ہی تھا۔

''پریشان مت ہو، بچی کو یاد کر کے وہ بہت زیادہ حساس ہوتی جا رہی ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ اس کا خیال رکھا کرو۔ اس کی دلجوئی کرتی رہا کرو۔'' زرکاش کے سنجیدہ لہجے پر وائمہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

☆......☆

گیلے بالوں میں برش پھیر کر وہ دوپٹہ لاپروائی سے شانے پر ڈالتی کمرے سے نکلی تھی مگر اگلے ہی پل اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ دوسری جانب دلچسپی سے اس کے تاثرات دیکھتا حاذق صوفے سے اٹھ کر بے اختیار ہی اس کی جانب بڑھا تھا۔ رجاب نے ایک نظر رومیل کو دیکھا تھا جو ویڈیو گیم کھیلنے میں مگن تھا۔ قریب آتے حاذق کی گہری نظروں پر سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اس نے دوپٹہ شانوں پر درست کیا تھا اور بمشکل ہی اسے سلام کر سکی تھی۔

''پندرہ منٹ ہو چکے ہیں مجھے یہاں آئے ہوئے۔ کتنی بے خبر ہو تم۔'' لو دیتی نگاہوں سے وہ اس کی جھکی لرزتی پلکوں کو دیکھتا ہوا بولا تھا۔

''آپ بیٹھیے۔ آغا جان اور بھابی ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں نزل کا چیک اپ کروانے۔ بس آنے والے ہیں۔'' اسے بتاتے ہوئے رجاب کا حلق خشک ہو چکا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تب تک کیا ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟''

''جی، ابھی لاتی ہوں۔'' اسے تو فرار کا موقع چاہیے تھا مگر اس وقت اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے تھے جب اس نے حاذق کو بھی اپنے ساتھ آتے دیکھا تھا۔

''رجاب! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' کچن میں آتے ہی حاذق نے اسے شانوں سے تھام کر اپنے سامنے کیا تھا جس کی سانس تھم گئی تھی۔ اس کی وحشت سے پوری کھلی سبز آنکھوں نے ایک پل کے لیے حاذق کی دھڑکن بھی روک دی تھی۔

''مجھے بے سکون کر کے تم کس طرح انجان رہ سکتی ہو؟ میں تمہارے لیے ایک ایسی تڑپ دل میں محسوس کرتا ہوں جو زندگی میں کبھی میں نے محسوس نہیں کی۔ میں جانتا ہوں تم بہت معصوم ہو۔ اوس کے قطروں کی طرح پاک ہو، میرے جذبوں کی شدت تمہیں ہراساں کرتی ہے مگر میں بے بس ہوں۔'' اس کا مدھم پرتپش لہجہ رجاب کو لرزا گیا تھا، اپنے شانوں پر مضبوط گرفت اسے پہاڑ کا بوجھ لگ رہی تھی۔

''آپ...... مجھ سے ایسی باتیں مت کیا کریں۔ آغا جان کو معلوم ہو گیا تو...... وہ مجھے جان......'' اس کی خوف سے لرزتی آواز بند ہو گئی تھی کہ کانپتے ہونٹوں پر حاذق کا ہاتھ آ ٹھہرا تھا۔

''جب تک میں موجود ہوں تمہیں کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمہیں ہمیشہ خوش اور مسکراتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری آنکھوں میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنی محبت دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے بس تمہارا ساتھ چاہیے۔ دو گی میرا ساتھ؟'' اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامے وہ پرحدت لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ اس کی پرامید نگاہیں التجا کر رہی تھیں۔

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' وہ کانپتے لہجے میں سوال کرتی روح کھینچ لے گئی تھی سبز آنکھوں پر تیرتا چمکتے پانیوں کا

سحر حاذق کو گنگ کر گیا تھا۔ اس کے ملبوس سے پھوٹتی پاکیزگی کی خوشبو بھیگے بالوں کی ٹھنڈی مسحور کن مہک، پر کیف قربت جسارتیں کرنے پر مجبور کر رہا تھا مگر وہ اس کی معصومیت اور نازک دل کو اپنی محبت کی شدتوں سے کوئی گہرا دھچکہ نہیں پہنچانا چاہتا تھا مگر اپنے جذبوں کا احساس ضرور اس کے دل میں جگانا چاہتا تھا۔ دھیرے سے اس نے لب رجاب کی پیشانی پر رکھ دیئے تھے۔ رجاب کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ تب ہی بجتی کال بیل نے حاذق کو چونکایا تھا جب کہ وہ سرعت سے دوڑ ہوتی کچن سے نکل بھاگی تھی۔

☆......☆

پول کے قریب آ کر اس نے اپنا بیگ نیچے رکھا تھا۔ نظریں اس پر ہی تھیں جو درخت کے نیچے نیم تاریکی میں موجود تھی۔

''میری غیر موجودگی میں بھی تم اس جگہ آجاتی ہو یہاں اگر کسی نے تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیا تو بلاوجہ کی مصیبت میرے گلے پڑ جائے گی۔'' وہ شدید ناگواری سے بول رہا تھا۔ ''تمہاری وجہ سے اب مجھے کوئی اور جگہ اپنے لیے تلاش کرنی پڑے گی۔''

''میں آگے تمہاری غیر موجودگی میں یہاں نہیں آؤں گی۔'' لڑکی کی ابھرتی آواز پر وہ کچھ چونکا تھا۔

''میری موجودگی میں بھی یہاں آنے کی ضرورت نہیں میں اب مزید تمہیں یہاں برداشت نہیں کروں گا۔'' بری طرح وہ اسے جھڑک گیا تھا اور پھر بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر پول سے ٹیک لگالی تھی۔ پانی کے گھونٹ لیتا وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''ہوا کیا ہے؟ رونے کے لیے یہی جگہ ملی ہے تمہیں؟ یہاں روشنی میں آؤ وہاں کسی کیڑے نے کاٹ لیا تو میں کوئی مدد نہیں کروں گا۔'' اس کے ناگوار لہجے پر چند لمحوں بعد وہ اس کے سامنے تھی۔ پول کی تیز روشنی میں اس کے چہرے پر نیل کے اور انگلیوں کے سرخ نشان چھپے واضح نظر آ رہے تھے۔

''آج اس نے پیسوں کے لیے میری گردن دبانے کی بھی کوشش کی۔ نشے کی طلب میں وہ مجھے جان سے مارنا چاہتا تھا۔'' دھندلائی آنکھوں سے وہ بتا رہی تھی۔

''تو کیا کروں میں؟ مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو؟ مرہم لگاؤں تمہارے زخموں پر یا سر ٹکا کر رونے کے لیے اپنا کندھا تمہیں پیش کروں؟ بتاؤ کیا کروں؟'' اس کے یکدم بلند بھڑکتے لہجے نے لڑکی کو دنگ کیا تھا۔

''جاؤ جا کر مر جاؤ اس نشئی کے ہاتھوں مجھے کیوں پریشان کرتی ہو، تمہارے دکھ درد سننے کے لیے میں یہاں نہیں آتا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے اور دوبارہ یہاں مت آنا۔'' وہ اشتعال میں دھاڑتا چلا گیا تھا۔ دوسری جانب لڑکی کی نظر سڑک پر رکتی گاڑی تک گئی تھی۔ اگلے ہی پل گاڑی کی سمت بھاگتے ہوئے اس نے پتھر اٹھایا تھا اور تاک کر گاڑی کے کھلتے دروازے پر دے مارا تھا۔ جانے اسے کیا ہوا تھا پول کے پاس ساکت کھڑا وہ حق دق نظروں سے لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو پاگلوں کی طرح چیختی ایک کے بعد ایک پتھر گاڑی پر مار رہی تھی۔ گاڑی کا دروازہ پہلے ہی کھلتے کھلتے واپس بند ہو گیا تھا۔ پتھروں کی بارش اور لڑکی کی چیخ و پکار پر چند لمحوں میں ہی گاڑی فراٹے بھرتی سڑک پر بھاگتی چلی گئی تھی۔

''عیاشو تمہیں تو جانا ہی ہے جہنم میں، اپنے ساتھ کسی دوسرے کو کیوں گھسیٹتے ہو شیطان کے چیلوں......'' سڑک پر کھڑی وہ غائب ہوتی اس گاڑی کو ہی دیکھتی حلق کے بل چیخ رہی تھی۔ ہر سمت چھائے گہرے سکوت میں وہ گہری گہری سانس لیتی اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی جو انتہائی خطرناک تیوروں سے اسے

گھور رہا تھا اور پھر اس نے جھک کر اپنا بیگ اٹھا لیا تھا۔ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ وہ سرعت سے اس کے پیچھے گئی تھی جو جارحانہ انداز میں وہاں سے جا رہا تھا۔

''تم جانتے ہو، میں نے کچھ غلط نہیں کہا۔''

''جان چھوڑو میری۔'' وہ رکے بغیر حلق کے بل اس پر دھاڑا تھا۔

''ہاں، میں جانتی ہوں تمہاری جان پر صرف ان کا حق ہے جو قیمتی کپڑوں میں اپنے دیمک زدہ جسم چھپائے رکھتے ہیں جو لمبی لمبی گاڑیوں میں تم جیسوں کے ساتھ گناہ کے راستے ناپتے ہیں۔'' اس کے کاٹ دار لہجے پر وہ رکا تھا۔

''اپنی بکواس بند کرو، دوبارہ مجھے اپنا چہرہ مت دکھانا ورنہ.....'' شدید اشتعال کو ضبط کرتا وہ بھینچے لہجے میں بولا تھا اور پھر سرخ بھڑکتے چہرے کے ساتھ تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا۔

''ورنہ کیا کرو گے؟ تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ تم دیکھنا تمہارا کیا حشر ہوتا ہے جن سے اپنی قیمت وصول کرتے ہو یہی جانور تمہاری قبر میں گھس کر تمہیں نوچ کھائیں گے۔ وہ اپنے گناہوں کی آگ میں تمہیں بھی اپنے ساتھ جلا کر کوئلے کا ڈھیر بنا دیں گے۔ خدا نے تمہیں جہنم کی آگ میں جلنے کے لیے نہیں بنایا تھا۔'' حلق کے بل چیختی وہ اسے سنا رہی تھی جو دور سڑک پر گہری دھند میں گم ہوتا چلا گیا تھا۔

☆......☆

چھت کو تکتی وہ یقیناً گہری سوچ میں گم تھی۔ تین دن گزر چکے تھے۔ اس کی طبیعت بہتر ہوتی جا رہی تھی مگر بخار کی نقاہت اب بھی اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔ گزرے تین دن میں زرکاش سے اس کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس کی طبیعت کے بارے میں وہ باہر سے ہی دائمہ سے پوچھتا رہا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ زرکاش اس کا سامنا کیوں نہیں کرنا چاہتا۔ چھت سے نظر ہٹاتی وہ تخت سے اٹھی تھی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی کمرے سے نکلی تھی۔ باہر صحن میں پھیلی گہری خاموشی میں دائمہ اسے واش بیسن کے پاس نظر آئی تھی۔ چپ چاپ وہ تخت کے کنارے بیٹھ گئی تھی۔ دائمہ نے اسے بتایا تھا کہ اوپر سب لوگ کسی تقریب میں شرکت کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ شاید اس لیے بھی سناٹا کچھ زیادہ ہی گہرا تھا۔

''دراج! اگر تمہیں باہر رہنا ہے تو پھر بیٹھو مت، لیٹ جاؤ۔'' قریب آتی دائمہ بولی تھی۔

''نہیں میں کچھ دیر یہاں بیٹھوں گی۔'' چہرے سے ٹکراتیں الجھی لٹیں بیزاری سے کان کے پیچھے کرتی وہ بولی تھی اور پھر دائمہ کو دیکھا تھا۔

''آپ نماز پڑھنے جا رہی ہیں؟''

''ہاں ابھی ذرا زرکاش بھائی چلے جائیں تو گیٹ لاک کر کے جاتی ہوں۔'' دائمہ کے سرسری لہجے نے اسے چونکایا تھا۔

''وہ نہیں گئے سب کے ساتھ؟''

''وہ کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ دیر سے آئے باقی سب پہلے چلے گئے وہ اب جا رہے ہیں۔''

''آپ جا کر نماز پڑھیں۔ میں ان کے جانے کے بعد گیٹ بند کر دوں گی۔'' دائمہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بول اٹھی تھی۔

''ٹھیک ہے مگر گیٹ ٹھیک طرح لاک کرنا ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں ہے گھر میں۔'' دائمہ اسے تاکید کرتی

کمرے میں چلی گئی تھی۔ چند لمحوں تک وہ تخت پر بیٹھی رہی تھی اور پھر اٹھ کر اس نے پیچھے سے کمرے میں جھانکا تھا۔ دائمہ نماز کی ادائیگی میں مصروف ہو چکی تھی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ تیز قدموں کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف چلی گئی تھی۔

عجلت میں کمرے سے باہر آتا وہ بری طرح ٹھٹھکا تھا۔ سامنے ہی وہ ویران آنکھوں سے ایک ٹک اسے ہی دیکھتی موجود تھی۔ زرکاش کے قدم زمین نے جیسے جکڑ لیے تھے۔ زرد ستے ہوئے لباس میں دراج کا چہرہ بھی بے انتہا زرد نظر آرہا تھا۔ سوجی آنکھوں میں سرخی نمایاں تھی۔ بمشکل اس سے نظر ملانے کی کوشش کرتا بالآخر وہ اس کی جانب بڑھا تھا۔ اسے سامنا تو کرنا ہی تھا۔ گزرے تین دن میں دراج کی ناقابلِ یقین باتوں نے اسے کافی ڈسٹرب کر رکھا تھا۔

''تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟'' لہجے کو نارمل رکھنا دوبھر ہو رہا تھا۔

''آپ نے یقین نہیں کیا میرا؟'' ڈبڈبائی نظروں سے اسے دیکھتی وہ لرزتے لہجے میں بولی تھی۔ ''آپ کے نزدیک میری زندگی کے 20 سال کی کوئی اہمیت نہیں کوئی وقعت نہیں ہے۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

''دراج! یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ تم نہیں جانتیں تم کیا کہہ رہی ہو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کیا غلط کر رہی ہو۔'' زرکاش حد درجہ پریشان ہوتا بولا تھا۔

''کیا غلط کیا ہے میں نے؟ اگر مجھے آپ سے محبت ہے اگر مجھے آپ کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا اگر آپ میرے دل کے ہر کونے میں موجود ہیں تو اس میں کیا غلطی ہے میری؟ کیا گناہ ہے میرا؟'' ساکت نظروں سے زرکاش اس کے چہرے پر پھیلی اذیت کو دیکھ رہا تھا۔ ''مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے آپ کا نام تک نہیں، آپ کی زندگی میں کوئی مقام بھی نہیں۔ میں آپ سے کچھ نہیں مانگتی مگر صرف میرا یقین کر لیں۔ میرے جذبوں کی سچائی پر شک مت کریں۔ بس ایک بار کہہ دیں آپ کو میری محبت پر یقین ہے۔ بس ایک بار۔'' ہاتھ جوڑتی وہ اپنی محبت کا یقین بھیک میں مانگ رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں نے اس کی تڑپ نے زرکاش کا دل مٹھی میں جکڑا تھا۔ سرعت سے وہ اس کے جڑے ہاتھ کھول چکا تھا۔

''مجھے میری نظروں میں شرمندہ مت کرو دراج۔ یہ تم...... اپنے ساتھ کیا کر رہی ہو۔ جس تصویر کو تم دیکھتی رہی ہو وہ بہت سال پرانی ہے۔ جذبات میں آ کر تم اپنے ساتھ غلط مت کرو۔ تم بہت کم عمر ہو، ابھی بہت لمبی زندگی پڑی ہے تمہارے سامنے۔ تمہارے جذبے اس انسان کے لیے ہونے چاہئیں جو تمہارے قابل ہو۔ میں وہ نہیں ہوں اس طرح جلد بازی میں اپنے ساتھ یہ زیادتی مت کرو۔'' شدید مضطرب انداز میں زرکاش نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ ہی میرے سب کچھ ہیں۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ زرکاش...... میرے دل پر ہی نہیں میری روح پر بھی آپ کا اختیار ہو چکا ہے۔ میرے دل میں، میری زندگی میں آپ کا جو مقام ہے وہ مقام میں آخری سانس تک کسی اور کو نہیں دے سکتی۔'' زار و قطار روتی وہ اس کا گریبان مٹھیوں میں جکڑ گئی تھی۔

''آپ اس طرح مجھ سے دامن نہ بچائیں۔ میں آپ کے لیے اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا سکتی ہوں۔ آپ ایک بار کہہ کر تو دیکھیں۔ میں آپ کی خوشی کے لیے اپنی شہ رگ بھی کاٹ دوں گی۔ میں آپ کو چاہتی ہوں۔

اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر میرا سب کچھ آپ کے لیے ہے۔ بس ایک بار کہہ دیں آپ کو مجھ پر یقین ہے۔ بس ایک بار میری محبت پر ایمان لائیں۔ بس ایک بار۔'' اس کا گریبان چھوڑتی وہ اس کے قدموں میں بیٹھتی چلی گئی تھی۔
ساکت کھڑے زرکاش کو جیسے ہوش آیا تھا۔ سرعت سے اسے شانوں سے تھام کر اٹھاتا وہ اس کے بلکتے، بکھرتے وجود کو سینے سے لگا چکا تھا۔

''آپ کیوں میرا یقین نہیں کرتے؟ میں مر جاؤں گی۔ اپنے آپ کو اذیت پہنچا کر اس دنیا سے چلی جاؤں گی۔ آپ نے جھوٹ کہا تھا۔ آپ کو میری پرواہ نہیں۔ آپ کو میرے جذبوں پر یقین نہیں تو گھونٹ دیں میرا گلا اپنے ہاتھوں سے۔'' پھوٹ پھوٹ کر روتی وہ نڈھال ہو رہی تھی۔

''ہے مجھے یقین، ہے مجھے تمہاری محبت پر یقین، مجھے آج اندھا اعتبار ہو چکا ہے تمہارے جذبوں پر۔ میں سچ کہتا ہوں۔ خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ تمہارے ایک ایک لفظ پر مجھے یقین ہو گیا ہے۔'' اس کے سر سے چہرہ ٹکائے وہ آنکھیں بھینچے اس طرح بول رہا تھا جیسے یہ سب کہتے ہوئے اسے بہت تکلیف پہنچی ہو۔ چند لمحے خاموشی سے دراج کی سسکیوں کے درمیان گزر گئے تھے۔ گہری سانس لے کر زرکاش نے دھیرے سے اسے خود سے الگ کیا تھا اور اس کے آنسو اپنی پوروں میں سمیٹ لیے تھے۔ اس کی آنکھوں میں اب ویرانی نہیں تھی۔ اپنے لیے وہ اس کی آنکھوں میں چاہت اور محبت کا سمندر موجزن دیکھ رہا تھا۔

''بہت ضدی اور ظالم ہو تم...... جانتی ہو کتنے کڑے امتحان سے گزارا ہے تم نے مجھے۔'' اس کے گہرے سنجیدہ لہجے پر دراج بس خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

''اب مجھ سے کوئی شکایت تو نہیں؟'' زرکاش کے سوال پر اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''تو پھر اب دوبارہ روتی ہوئی میرے سامنے مت آنا۔ کتنی بری لگتی ہو تم آنسو بہاتے ہوئے بے وقوف۔'' اس کے خشمگین لہجے میں گھر کنے پر ہلکی سی مسکراہٹ دراج کے لبوں پر ابھری تھی۔

''رکو، میں پانی لے کر آتا ہوں تمہارے لیے۔ حالت خراب کر لی ہے اپنی تم نے رو رو کر۔'' ناراضی سے اسے دیکھتا وہ اس کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ چند لمحوں بعد جب وہ واپس آیا تو دراج اسے وہاں کہیں دکھائی نہیں دی۔ یقیناً وہ جا چکی تھی جو پانی وہ دراج کے لیے لایا تھا۔ اس کو اب خود ہی گھونٹ گھونٹ پیتا وہ فکر انگیز سوچوں میں ڈوبنے لگا تھا۔

☆......☆

وحشت سے اس کا دل حلق میں آ رہا تھا۔ سانس روکے وہ کمرے سے ابھرتی آوازوں کو سن رہی تھی۔

''آپ ایک بار پھر سوچ لیں۔ مجھے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔ رجاب نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا ہے۔ وہ کچھ سننے سمجھنے کی حالت میں نہیں ہے۔'' ندا کا لہجہ بہت التجائی تھا۔

''بے وقوف ہے وہ ابھی ناسمجھ ہے اسے نہیں معلوم اس کے لیے کیا بہتر ہے کیا نہیں۔'' راسب کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا۔

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ وہ ابھی ناسمجھ ہے۔ اسے کچھ وقت دیں ذہنی طور پر وہ ان حالات کو قبول نہیں کر پائے گی۔ تایا جان سے کہیں رجاب ان کی امانت رہے گی لیکن ابھی رجاب کے لیے کوئی فیصلہ نہ کریں۔ یہ قبل از وقت ہے۔ کم از کم اسے اپنی پڑھائی تو مکمل کرنے دیں ابھی وہ بہت کم عمر ہے۔ یہ سب کچھ سال بعد بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''ندا! مجھے یہ سب مت بتاؤ۔ مجھے پتا ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ حاذق تایا جان کی آخری اولاد ہے وہ جلد از جلد اس کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ جان چھڑکتے ہیں وہ رجاب پر۔ انہوں نے اتنی محبت اور امیدوں سے رجاب کو مانگا ہے کہ انکار کے بارے میں سوچنا بھی میرے لیے گناہ ہے۔ پھر بھی میں نے رجاب کے لیے اس کی خوشی کے لیے تایا جان کو صرف نکاح پر راضی رہنے کی شرط رکھی ہے۔ کیونکہ میں رجاب کے خواب کو ٹوٹنے نہیں دوں گا۔ وہ اپنی میڈیکل کی پڑھائی مکمل کرے گی۔ ڈاکٹر بنے گی اس کے بعد میں اسے حاذق کے ساتھ رخصت کروں گا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر رجاب کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے۔ میرے سامنے اس کا مستقبل ہے۔ حاذق گھر کا فرد ہے۔ دیکھا بھالا ہے۔ مجھے اطمینان ہے اس کی طرف سے۔ اٹلی میں ہر طرح سے اس کے قدم جمے ہوئے ہیں۔ تایا جان کی مرضی میں خود حاذق کی رضا بھی شامل ہے۔ رجاب کو سب سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھیں گے۔ مجھے اور کیا چاہیے۔''

''بے شک آپ اپنی بہن کے لیے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کر رہے ہیں مگر اس کی زندگی کے اتنے اہم فیصلے میں خود اس کی رضامندی کا شامل ہونا بھی لازمی ہے۔ حاذق کا انتخاب آپ نے کرتے ہوئے ایک بار تو سوچا ہوتا کہ اس کی اور رجاب کی عمر میں 12 سال کا فرق ہے۔ حاذق میں بہت ساری اچھائیاں ہیں مگر وہ پانچ سال ملک سے باہر گزار کر آیا ہے۔ اتنا عرصہ کافی ہوتا ہے انسان کو بدلنے کے لیے۔'' ندا دبے لہجے میں بول گئی تھیں۔

''میں حاذق کو تم سے زیادہ بہتر جانتا ہوں۔ وہ یہاں کیسا ہے اور باہر کیسے زندگی گزارتا رہا ہے مجھے سب خبر ہے۔ وہ ہمیشہ سے سب کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آتا ہے۔ کبھی میری کسی ڈانٹ ڈپٹ پر اس نے اف تک نہیں کیا ہے۔ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کا فرمانبردار ہے۔ سب کا خیال رکھنے والا ہے۔ اپنی بہن کے لیے مجھے اس سے زیادہ بہتر انسان کہیں نہیں مل سکتا۔ میں حاذق کے لیے انکار کرنے کا کوئی جواز نہیں رکھتا۔ جہاں تک عمر کی بات ہے تیس بتیس سال کی عمر مرد کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی مگر پھر بھی رجاب کی طرف سے تمہیں فکر ہے تو اسے کافی وقت مل رہا ہے۔ تایا جان کے گھر میں سب رجاب کے لیے کتنے سنجیدہ ہیں اس چیز سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ سب اس کی پڑھائی مکمل ہونے تک صبر کریں گے۔ کم سے کم بھی اگر حساب لگایا جائے تو پانچ سے چھ سال رجاب کی پڑھائی کے لیے درکار ہیں۔ میں صاف بتا چکا ہوں حاذق کو بھی اور وہ راضی ہے صرف نکاح پر۔ اب تم کہتی ہو کہ میں نکاح بھی ابھی نہ کروں۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی۔''

''میں نکاح کے لیے اس لیے منع کر رہی ہوں کہ مجھے معلوم ہے پھر رخصتی کا مطالبہ کرنے کا بہانہ مل جائے گا۔ ابھی سب انتظار کرنے کی حامی بھر رہے ہیں مگر بات ایک دو سال کی نہیں ہے کوئی کب تک اپنے ارمانوں کو باندھ کر رکھ سکتا ہے۔ وہ اپنا حق مانگ لیں گے اور آپ انکار نہیں کر سکیں گے۔'' ندا کی مدھم آواز پر باہر کی رجاب کا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔

''ندا! وہ لوگ میرا خون ہیں اور مجھے ان پر اعتبار ہے۔ بالفرض اگر تمہارا یہ خدشہ آگے جا کر سچ ثابت ہوا تو میں یقیناً کوئی ایسا راستہ نکال لوں گا جس میں کسی کی حق تلفی نہ ہو اور ''کسی'' میں سب سے پہلے رجاب ہے میرے لیے۔ تم اسے نرمی سے سمجھاؤ۔ سختی سے سمجھاؤ مگر کسی بھی طرح یہ نوبت مت آنے دینا کہ مجھے اس کو سمجھانا پڑے ورنہ مجھے اس الزام کی بھی پرواہ نہیں ہوگی کہ میں اپنی بہن پر جبر کر رہا ہوں۔ اسے بتاؤ میں جو کر رہا ہوں میں اس کا دشمن نہیں ہوں۔ اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہتا ہوں میں اسے۔'' راسب اور کیا بول رہے

تھے اسے کچھ سنائی نہیں دیا تھا۔ اپنی سسکیاں روکتی وہ کمرے میں بھاگ آئی تھی۔ تکیے میں منہ چھپا کر اس نے ضبط کا دامن چھوڑ دیا تھا۔ کوئی اس کے دل میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔ حاذق کے لیے اس کے دل میں کچھ نہیں تھا۔ نہ محبت، نہ نفرت بس وحشت ہی وحشت تھی۔ وہ اس کا چہرہ بھی دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس کی بے باک نظروں نے اس کے لمس نے رجاب کو جس خوف میں مبتلا کیا تھا وہ خوف اس کے پورے وجود کو اپنے حصار میں لے چکا تھا۔

☆......☆

آج پورے تین دن گزرنے کے بعد وہ زنگ آلود گیٹ سے باہر نکلی تھی۔ چادر میں آدھا چہرہ چھپائے وہ کچھ دیر تک پر سکوت طویل چوڑی سڑک پر چھائی دھند کو دیکھتی رہی تھی۔ ایسی ہی دھند تو اس کی زندگی میں بھی چھائی ہوئی تھی۔ اس دھند کے پار کیا ہوگا۔ یہ اسے بھی معلوم ہی نہ ہو سکا تھا۔

دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی وہ پول کے قریب پہنچ گئی تھی جہاں اس کے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا۔ بوجھل دل سے اس نے پول سے ٹیک لگائی تھی اور کسی غیر مرئی چیز کو دیکھتی کہیں اور ہی گم ہونے لگی تھی۔

''میں کیا جاننا چاہتی ہوں؟ کیوں جاننا چاہتی ہوں اسے؟ میرا اس سے تعلق ہی کیا ہے؟ وہ اگر تاریک راستوں کا شیدائی ہے تو میں کیوں اسے روکنا چاہتی ہوں؟ اور وہ کیوں رکنے لگا میرے کہنے پر؟'' خود سے سوال کرتے کرتے اس کی روح بھی بوجھل ہونے لگی تھی۔ گہری سانس لے کر اس نے اپنے اطراف میں نظریں دوڑائیں اور اگلے ہی پل بری طرح چونک اٹھی تھی۔ گھنے درخت کی تاریکی کے دوسرے پار کچی باؤنڈری پر اسے کوئی نظر آیا تھا۔ اب تک وہ اپنے اردگرد جو اس کی خوشبو کو محسوس کرتی رہی تھی۔ یہ اس کا وہم نہیں تھا حقیقتاً وہ وہاں موجود تھا۔

دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی وہ باؤنڈری کی طرف چلی گئی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ گھنے درخت کی وجہ سے بہت معمولی حد تک یہاں پہنچ رہی تھی مگر کھلے آسمان پر دودھیا روشنی بکھیرتا چاند ہر منظر کو اجاگر کر رہا تھا۔ چوڑی باؤنڈری پر ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھے وہ چیت لیٹا آسمان کو تک رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ چاند کی خنک روشنی میں اس کا جائزہ لیتی رہی تھی۔

''آج تم کسی کے ساتھ نہیں گئے؟'' اس کے سوال پر وہ متوجہ نہیں ہوا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟''

''میں نے تم سے کہا تھا کہ دوبارہ مجھے اپنا چہرہ مت دکھانا۔'' آسمان پر ہی نظر جمائے وہ بولا تھا۔

''مگر یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں دوبارہ تمہارا چہرہ نہ دیکھوں۔'' مدھم آواز پر وہ بس ایک پل کے لیے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو کچھ فاصلے پر گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔

''میں یہاں سکون سے کچھ دیر سونا چاہتا ہوں۔'' بند آنکھوں کے ساتھ وہ بولا تھا۔

''کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں؟'' وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی تھی جواباً وہ دوسری طرف کروٹ بدل گیا تھا۔ خاموشی سے وہ اس کی پشت کو دیکھتی رہی تھی۔ ہوا کے سرد جھونکے آہستہ آہستہ بڑھتے جا رہے تھے۔ گہری خاموشی میں ہلتے پتوں کی سرسراہٹوں کو سنتی وہ اب اس کے بالوں کو دیکھ رہی تھی۔ جن میں ہوا کے جھونکوں سے ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کی مخصوص بھینی بھینی خوشبو چاروں طرف فضا میں رچی بسی تھی۔

(جاری ہے)

فرحین اظفر

ناولٹ

کردار کا کانچ

رئیس ماموں کے گھر نئے گھر کی خوشی میں دعوت تھی، تقریباً تمام خاندان مدعو تھا۔ عمارہ بھی اپنے دونوں بچوں اور میاں سمیت پہنچی تھی اور پچھلے آدھے گھنٹے سے امی کے پاس بیٹھی خاندان کی دوسری



خواتین کو اپنے زیورات اور ملبوسات کی نمائش کرتے دیکھ رہی تھی۔

امپورٹڈ بیگز، جیولری اور سینڈلز کا ڈھیر لگا ہوا تھا، ہر ایک اپنے کپڑوں اور دوسری چیزوں کی قیمتیں دوسروں سے بڑھ کر بتانے اس کو اصلی اور امپورٹڈ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا، کچھ لڑکیاں ایسی بھی تھیں جن کے ہینڈ بیگز اور ایئر رنگز وغیرہ اس ''نامور مارکیٹ'' میں تھوڑے سے کم معیاری ثابت ہو چکے تھے، اب وہ کھسیانی ہو کر دوسروں کا ریکارڈ لگانے میں مصروف تھیں، لیکن عمارہ کا دھیان اس ساری گفتگو سے پرے اپنی چھوٹی بہن فارہ کی طرف لگا ہوا تھا، جیسے یہاں آنے کے بعد اس نے ایک بار بھی کہیں نہیں دیکھا تھا۔

وہ امی کے پاس ہی بیٹھی تھی اور وہ مسلسل اس کے عبایا پہن کر آنے پر ناگواری کا اظہار کر رہی تھیں، وہ اس کے کپڑوں، میک اپ اور دوسری تیاری سے بھی بہت غیر مطمئن تھیں۔

''بالکل گنوار لگ رہی تھیں تم یہ لمبے کالے چغے



میں سب سے سلام دعا کرتے ہوئے"۔ اس کے نزدیک آتے ہی انہوں نے پہلا حملہ اس کے سلام کا جواب دینے سے بھی پہلے کیا تھا۔ عمارہ گہری سانس لے کر وہیں بیٹھ گئی تھی، وہ امی سے کبھی بھی نہ زبان چلاتی تھی نہ ان کی کسی بات کا تنک کر جواب دیتی تھی۔

"ارے تم لان کا سوٹ پہن کر آ گئیں عمو! کیا ہو گیا ہے تمہیں"۔ بہت خوبصورت آسمانی رنگ کے دوپٹے کی تہیں کھولتے دیکھ کر ان کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لیں۔

"برانڈڈ ہے امی! یہ سوٹ پانچ ہزار کا ہے، کوئی معمولی نہیں۔ دیکھیں کتنی عمدہ لان ہے، کوئی پوچھے تو فوراً قیمت اور برانڈ نیم بتا دیجئے گا، خود ہی چپ ہو جائے گا"۔ اپنی عادت کے برخلاف اس نے دل پر پتھر رکھ کر اس طرح کی بات کی تھی ورنہ وہ کبھی چیزوں کی قیمتیں بتا کر دوسروں پر رعب ڈالنے کو اچھا تصور نہیں کرتی تھی۔

"ہے تو لان ہی ناں"۔ اب کے ان کی آواز دبی دبی سی تھی۔

"تو اتنی شدید گرمی میں مجھ سے تو نہیں پہنے جاتے یہ چمکیلے بھڑکیلے کپڑے، اور ہم دعوت میں آئے ہیں کسی کی شادی میں نہیں"۔ اس نے اپنی آواز کو حتی المقدور نیچا ہی رکھا، آس پاس کسی کے بھی برا مان جانے کا قوی امکان تھا۔

آسمانی رنگ کے سوٹ پر گلے آستین اور دامن میں آسمانی اور سلور امتزاج کی خوبصورت بیل لگی ہوئی تھی، سوٹ میں سادگی بھی تھی اور آرائش بھی، اس نے خود ہی امی کے کہنے سے پہلے اسکارف لپیٹ کر دوپٹے کو سر پر ڈال لیا۔

کانوں میں چمکتے سلور ٹاپس، ہلکے میک اپ کے ساتھ نمایاں ہوئے تو امی کو ذرا تسلی سی مل گئی، محفل میں دوسروں جیسی تو نہیں البتہ بے ڈھنگی نہیں لگ رہی تھی اب وہ۔

امی کی بڑبڑاہٹ میں واضح کمی آ گئی، عمارہ دل ہی دل میں مسکرا دی۔ وہ اپنی ماں کی نفسیات سے بخوبی واقف تھی، وہ چاہتی تھیں عمارہ اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں بیاہی ہے تو وہ کھل کر اس بات کو سب کے سامنے جتائے، موقع بے موقع بھاری زیور لادے، ہر جگہ ہر بار نئے جوڑے زیب تن کرے، جبکہ یہ سب حرکتیں عمارہ کو بہت ہلکی اور اوچھی لگتی تھیں، پھر بھی وہ اپنی ماں کی تسلی کے لئے اس طرح کی باتیں کر جاتی جیسے اس وقت اس نے اپنے لان کے سوٹ کی قیمت اور برانڈ کو جتا کر ان کی تسلی کروا دی تھی۔

"امی! فارہ کہاں ہے، کب سے آئی ہوئی ہوں، نظر ہی نہیں آئی"۔ اپنی سوچوں سے نکل کر اس نے امی سے پوچھا جو ابھی بھی تنقیدی نگاہوں سے اس کی کلائی میں پڑے نازک سے بریسلٹ اور اکلوتی انگوٹھی کو دیکھ رہی تھیں۔

"اوپر گئی ہے ضوبیا کے ساتھ گھر دیکھنے"۔

"لیکن اب تو بہت دیر ہو گئی ہے، ابھی تک گھر نہیں دیکھا"۔ اسے الجھن ہوئی۔

"لگ گئی ہو گی باتوں واتوں میں، اس کو تو چپ کراؤ"۔ انہوں نے اس کے بیٹے کو الجھ کر دیکھا، وہ اب مستقل ریں ریں کر رہا تھا۔

"اسے بھوک لگی ہے مجھے فیڈ کروانا ہے"۔ اس نے متلاشی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا، ہر کمرے اور لاؤنج میں کوئی نہ کوئی مرد موجود تھا (اتنے لوگوں کو بلانا تھا تو باہر ٹینٹ ہی لگوا لیتے، گھر کی تقریب گھر کے اندر کرنی کیا ضروری تھی)

"اوپر چلی جاتی ہوں میں بھی، یہاں تو ہر جگہ رش لگا ہوا ہے"۔

"یہ ٹنٹا بھی تمہارا ہی پالا ہوا ہے، مدر فیڈ پر رکھنے کا، کہا بھی تھا کہ فیڈر لگا دو، اب دیکھو کتنی مشکل ہو گی"۔

"ارے یہ تو اس کا حق ہے امی! اتنے ننھے بچے کی اور ڈیمانڈ ہی کیا ہے، وہ بھی اس سے چھین لوں

اور اس کا کوئی نعم البدل بھی تو نہیں"۔ اس نے اپنے گورے چٹے صحت مند بیٹے کو گود میں اٹھایا اور سب سے ملتی ملاتی اوپر کی طرف آ گئی، بڑی بھابی امی کے پاس ہی بیٹھی تھی۔

گھر کا نقشہ اس نے دیکھا ہوا تو تھا نہیں، اس لئے خود ہی اندازے سے سیڑھیاں عبور کر کے ایک قدم ہی بڑھایا تھا اور فارہ کو آواز دینے کا سوچ ہی رہی تھی جب ایک کمرے سے اسے فارہ کی ہنسی کی آواز سنائی دے گئی۔

وہ جلدی سے آگے بڑھی لیکن کمرے کا دروازہ کھلا ہونے کے بجائے بھیڑا ہوا تھا۔ بس ایک معمولی سی جھری رہ گئی تھی لیکن اس کے ٹھٹکنے کی وجہ وہ دروازہ نہیں بلکہ مردانہ آواز بھی جو فارہ کی ہنسی میں شریک تھی۔

چند لمحوں کے لئے وہ تذبذب کا شکار ہو گئی کہ اندر جائے، فارہ کو آواز دے یا خاموشی سے پلٹ جائے، جبھی اندر سے فارہ کی پھر آواز آئی، وہ جو کوئی بھی تھا لگتا تھا فارہ اس سے کافی بے تکلف تھی، جبھی بہت لاڈ سے ٹھنک کر اسے کسی حرکت سے روک رہی تھی۔

عمارہ کے پسینے چھوٹ گئے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، جبھی اس کی گود میں چڑھا بلال ایک بار پھر سے رونے لگا۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی، عمارہ تیزی سے پلٹی اور سیڑھیوں تک پہنچی۔

"عمو آپی! تم... کب آئیں"۔ اس نے اپنی پیچھے فارہ کی آواز سنی، اس نے پلٹ کر دیکھا، ہوائیاں اڑتے چہرے کے ساتھ فارہ کمرے کے دروازے پر ہی کھڑی تھی۔ عمارہ کے اندر غصے کی شدید لہر اٹھی۔

"ابھی جب تم بہت مصروف تھیں"۔ چبھتے ہوئے لہجے میں بول کر وہ اس کا چہرہ دیکھے بنا سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

☆..........☆..........☆

عاقب کتنی دیر سے اس کی بے توجہی نوٹ کر رہا تھا، وہ کام تو کر رہی تھی لیکن دماغی طور پر حاضر نہیں تھی، ایک دو بار عاقب نے ٹوکا بھی لیکن اس کی کیفیت میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں آئی۔

"کیا بات ہے، کیوں اپ سیٹ ہو؟" بچوں کو سلا کر جب وہ خود کمرے میں آئی تو عاقب نے پھر پوچھا۔

"نہیں، کچھ خاص نہیں، امی فارہ کے رشتے کے لئے کہہ رہی تھیں"۔ اس نے عاقب کو ٹالنے کے لئے بات بنا دی، ورنہ حقیقت کچھ اور تھی۔

فارہ کو کسی انجان لڑکے کے ساتھ کمرے میں، سب کی نظروں سے چھپ کر راز و نیاز کرتے دیکھ کر صحیح معنوں میں اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ پتہ نہیں امی کو یہ سب معلوم تھا یا نہیں۔

اگر وہ جانتی تھیں کہ فارہ اوپر کمرے میں اپنی کزن کے ساتھ نہیں بلکہ کسی لڑکے کے ساتھ ہے تو کیا یہ بات ٹھیک تھی؟ بالکل نہیں اور اگر امی بھی اس کی طرح انجان تھیں تو، یہ بات تو اور بھی زیادہ خطرناک تھی۔

ان کے علم میں لائے بغیر فارہ اتنی دیدہ دلیری سے اگر اتنے ہجوم میں سب کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتی تھی تو پھر اکیلے میں...

اس سے آگے اس کی سانس بند ہونے لگی تھی۔

عاقب کے رشتے کا ایک بھائی باہر سے آنے والا تھا، اسے عمارہ کے طور طریقے بہت پسند تھے اور اسی نے عمارہ سے کہا تھا کہ وہ ان کے لئے بھی اپنے جیسی ہی لڑکی ڈھونڈے۔ عمارہ کے دل میں فوراً فارہ کا ہی خیال آیا تھا، اور وہ عاقب سے ذکر بھی کر بیٹھی تھی، مگر مسئلہ یہ تھا کہ فارہ اور عمارہ کی شخصیت میں زمین آسمان کا فرق تھا، اب وہ اپنی جلد بازی پر پچھتا رہی تھی، اگر عاقب نے اپنے کزن سے فارہ کا ذکر کر دیا تو فارہ سے ملنے کے بعد انہیں جو مایوسی ہوتی وہ تو الگ ہی تھی، خود عمارہ ان کے سامنے کتنی شرمندہ ہو جاتی۔

"عاقب! شہریار کب آ رہا ہے پاکستان؟" بے

دھیانی میں سب باتیں سوچتے ہوئے اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا، عاقب نے چونک کر اسے دیکھا۔

''ابھی تو تھوڑے دن باقی ہیں، پر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''نہیں بس ایسے ہی...'' اس نے ایک بار پھر ٹال دیا۔

جو کھچڑی اس کے دل و دماغ میں چل رہی تھی، وہ اس کا ایک دانہ بھی عاقب کے منہ میں ڈالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

☆............☆............☆

امی اس کے گھر آئی ہوئی تھیں، ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا، امی کو اس کا رہنے سہنے کا طریقہ کچھ خاص پسند نہیں تھا، وہ ماڈرن تھیں، اپ ٹو ڈیٹ رہتی تھیں اور عمارہ کو بھی ایسا ہی دیکھنا چاہتی تھیں۔ ماڈرن اور اپ ٹو ڈیٹ تو عمارہ بھی تھی، لیکن ایک حد تک، فیشن وہ بھی کرتی تھی لیکن فل سلیوز اور اسکارف کے ساتھ، یہی بات امی کو ناپسند تھی۔ شادی سے پہلے اس نے اپنے سلکی بالوں کو ہمیشہ جدید انداز کا ہیئر کٹ رکھا تھا، اس کی پیاری سی شکل چھوٹے چھوٹے بالوں میں معصوم لگتی لیکن شادی کے بعد اور خاص طور پر اسکارف لے لینے کے بعد سے بال کٹوانے کی ضرورت نہیں رہی، عاقب کو بھی لمبے بال پسند تھے اور اسے عاقب کی پسند کو اپنانا پسند تھا، امی کے گھر میں ہر کام کے لئے مشینیں تھیں، یہاں تک کہ آٹا گوندھنے اور روٹی پکانے تک کے لئے جبکہ یہاں آ کر عمارہ چٹنی بھی سل پر پیستی اور کبابوں کا مصالحہ بھی۔

امی کو یہ سب حرکتیں آؤٹ ڈیٹڈ لگتی تھیں، اور اسے اپنی ماں معصوم لگتی تھی۔

اس دن بھی وہ عاقب کی جرابوں کو ترتیب سے ملا کر گرہیں لگا رہی تھی جب امی کے اوپر بجلی گری۔

''ارے یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

''کیا کر رہی ہوں، سوکس ہیں عاقب کے، جوڑیاں بنا کر رکھ رہی ہوں تاکہ آفس جاتے وقت مشکل نہ ہو''۔

''اف اللہ عمارہ! کوئی کام ایسا بھی ہے ماسیوں والا جو تم نے نہ کیا ہو''۔ وہ دھیرے سے ہنس دی۔

''یہ ماسیوں والے کام کیا ہوتے ہیں اور کیا وہ عورتیں نہیں ہوتیں، انسان نہیں ہوتیں اور پھر یہ ماسیاں تو ہم نے خود ہی کاموں سے جان چھڑانے کے لئے رکھ لی ہیں، ورنہ یہی ماسیاں ہمارے گھر کے کام نمٹا کر اپنے گھروں کے کام بھی تو کرتی ہیں، پھر تو...''

''ارے بس کرو ملانی بی بی! میں تم سے بحث کرنے نہیں آئی، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، تمہاری بچی اسکول سے آ کر تمہیں مصروف کر دے گی پھر...''

''تو کریں ناں جو بات کرنے آئی ہیں اور آج میں آپ کو لنچ سے پہلے کہیں نہیں جانے دوں گی، آرام سے بیٹھیں آپ''۔

''رہنے دو لنچ ونچ، میں اکیلی یہاں پڑی رہوں گی، تم کچن میں چولہے کے آگے''۔

''نہیں میں رحیمہ سے کہہ دوں گی وہ کھانا تیار کر دے گی، اب میں اتنی بھی گھریلو نہیں جتنا آپ مجھے سمجھتی ہیں، آپ وہ بات کریں جو کرنے آئی تھیں''۔

''ہاں، میں تم سے کہنے آئی تھی کہ فارہ کے رشتے کے لئے کوشش کرو''۔ اس سے جواب میں فوری طور پر کچھ کہا نہیں گیا، وہ گود میں دھری جرابوں کو سمیٹ کر وارڈ روب کی طرف چلی گئی۔

''لو تم تو ایسے چپ کر گئیں جیسے میں نے تم سے منہ بند کرنے کا کہہ دیا''۔

''امی! آپ خود پہلے اس سے پوچھ لیں شاید وہ کسی میں انٹرسٹڈ ہو''۔ اس نے وارڈ روب میں سر گھسا کر کہا، وہ یہ بات کرتے ہوئے امی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''ہیں... اس نے تم سے کہا ہے کچھ؟''

''نہیں''۔

''تو پھر... ادھر آکر بیٹھو، سامنے بیٹھ کر سکون سے بات کرو ناں، وہاں گھسی کیا کر رہی ہو''۔

اب ان سے سامنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

''میں نے رئیس ماموں کے گھر اسے کسی لڑکے سے باتیں کرتے دیکھا تھا''۔

''وہ عادل ہوگا''۔ وہ لاپروائی سے ماموں زاد کا نام لے کر بولیں۔

''وہ عادل نہیں تھا میں نے اسے دیکھا تھا اور فارہ اس سے بہت بے تکلف لگ رہی تھی''۔ اس نے اصل بات بتانے سے گریز کیا۔

''اچھا چلو میں پوچھوں گی، اور وہ تمہارا ایک دیور بھی تو آنے والا ہے پاکستان، شادی کے لئے ہی تو آ رہا ہے ناں وہ''۔

''جی مگر اسے میری طرح کی عورتیں پسند ہیں اور فارہ بہت بولڈ اور ماڈ ہے''۔ اس نے گہری سانس لے کر دہ بات کی، جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ امی ضرور برا مانیں گی۔

''ارے رہنے دو یہ سب فضول کی باتیں ہیں، شادی کے بعد سارے مرد بیویوں کے اشاروں پر چلتے ہیں، یہ تو تم ہی تھیں کاٹھ کی الو جو عاقب کی ہر بات آنکھیں بند کر کے مان لیتی ہو''۔ اس نے بے بسی سے اپنی ماں کو دیکھا، وہ انہیں کس طرح سمجھاتی۔

''وہ بھی میری ہر بات مانتے ہیں اب، اور ایسا اس طرح ممکن ہوا کہ میں نے شادی کے شروع دنوں میں ان کی ہر بات کو اولیت دی''۔

''اونہہ! جبھی پردے کی بوبو بن گئی ہو''۔

''اوں ہوں... جبھی ان کی کمائی سے بنے گھر کی مالکن بن گئی ہوں''۔ اس کا انداز اتنا بے ساختہ اور معصومیت بھرا تھا کہ امی کو پیار آ گیا۔

''ارے میری بچی، تو تو ہے ہی بہت محبت کرنے کے لائق''۔ انہوں نے اس کا ماتھا چوم لیا، عمارہ اندر تک نہال ہوگئی۔

''اچھا بس اب میں چلوں گی، تمہارے دیور کا خیال آ گیا تھا، تم اس سے بات کر کے دیکھنا''۔

''آپ بھی فارہ سے اس لڑکے کے بارے میں ضرور پوچھیے گا، اور سلمان بھائی کو میرا اسلام کہیے گا''۔

اس نے بھی امی سے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

☆.........☆.........☆

عاقب کا کزن شہریار پاکستان آیا تو خاندان بھر میں اس کی دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، عمارہ کے میکے اور سسرال والوں کی آپس میں کوئی رشتے داری نہیں تھی، پھر بھی امی نے دو بار فون کر کے عمارہ سے شہریار کی دعوت کے بارے میں کہا۔

''میں چاہ رہی تھی وہ ایک بار فارہ کو بھی دیکھ لیتا''۔

''کیا کرے گا دیکھ کر امی! جب فارہ جیسی اس کی ڈیمانڈ ہی نہیں''۔

''افوہ... ایک بار دکھانے میں کیا حرج ہے، اور بھی تو تمہارے خاندان بھر میں اس کی دعوتیں ہو رہی ہیں، ایک ہماری طرف سے بھی سہی، کیا پتہ وہ فارہ کو پسند کر ہی لے''۔ اس نے ماں کے آگے ہمیشہ ہی خاموشی اختیار کی تھی۔

''ٹھیک ہے، پر پہلے یہ بتائیں رئیس ماموں کے گھر جو لڑکا اس کے ساتھ تھا وہ کون تھا؟''

''لو تم تو اتنے یقین سے کہہ رہی ہو، فارہ تو کہنے لگی آپ کو وہم ہوا ہے''۔ عمارہ چپ کی چپ رہ گئی، جب تک اس کی فارہ سے آمنے سامنے بات نہ ہوتی تب تک یہ بحث بیکار تھی۔

''اچھا سنو! میں نے سنا ہے امریکہ میں شہریار کا ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے بہت بڑا''۔

''ہاں جو مین مارکیٹ میں ہے وہ بہت بڑا ہے''۔ وہ لاپروائی سے بولی، مگر امی تو اچھل ہی پڑیں۔

''ہیں... تو کیا ایک سے زیادہ ہیں''۔

''ہاں تین ہیں، ایک اسٹور جہاں سے سارا اسٹیم بینج ہوتا ہے، وہ بہت بڑا ہے، باقی چھوٹے ہیں''۔

''تو کیا شہریار ان سب کا اکیلا مالک ہے''۔ اس نے گہری سانس لے کر فون کا ریسیور اپنے گرم ہو جانے والے کان سے ہٹایا پھر دوبارہ لگایا۔

''جی... اب وہ اکیلا ہی مالک ہے، ایک بھائی اور ایک بہن تھی، ان دونوں کو اُن کا حصہ دے کر الگ کر دیا ہے ریسینٹلی''۔

''ہائے میں مر جاؤں، اتنے پیسے والا لڑکا اور تم یوں آرام سے اسے لڑکیاں پسند کروا رہی ہو، میں پوچھتی ہوں تمہیں اپنی اکلوتی چھوٹی بہن کا کوئی خیال نہیں''۔

''امی!'' اس نے جیسے دہائی سی دی۔

''بس میں کچھ نہیں جانتی، تم اس ہفتے اسے لے کر گھر آ رہی ہو ڈنر پر، سلمان بھی گھر پر ہوگا، میں فارہ سے بھی کہہ دوں گی''۔

''ٹھیک ہے''۔ وہ ہار سی مان گئی۔

''اسے پاکستانی کھانے پسند ہیں، خاص طور پر بیف پلاؤ''۔

وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ ہفتے سے پہلے اسے ایک چکر گھر کا لگا کر فارہ سے ڈائریکٹ بات کرنی چاہیے۔

☆..........☆..........☆

''تم مجھ سے کیا صرف یہ پوچھنے آئی ہو آپی؟''

''ہاں''۔ وہ اس وقت فارہ کے بیڈ روم میں بیٹھی تھی جو شادی سے پہلے اس کا اپنا تھا۔

اس کی شادی کے بعد امی کے گھر میں ایک گیسٹ روم کا اضافہ کر کے فارہ کو اس کا کمرہ دے دیا گیا تھا، اب اگر وہ مشکل سے سال میں ایک آدھ بار کبھی ماں کے گھر رکنے آتی تو مہمانوں کی طرح گیسٹ روم میں رہتی، یہ بات اسے ہمیشہ تکلیف دیتی، ایک غیریت کا سا احساس دلاتی لیکن وہ اپنے یہ جذبات کسی سے بھی شیئر نہیں کر سکتی تھی، یہاں تک کہ عاقب سے بھی نہیں۔

''میں امی کو اس بارے میں بتا تو چکی ہوں، میں نے کہا تھا ان سے بھی''۔ فارہ بے وجہ جھنجھلا رہی تھی، شاید اس کی گہری نظروں سے۔

''کیا کہا تھا؟''

''یہی کہ تمہیں وہم ہوا ہے''۔

''تم نے جھوٹ کہا تھا''۔

''افوہ... آپی! کیوں تم ایک ذرا سی بات کو اتنا بڑا ایشو بنا رہی ہو''۔ فارہ کی آواز بلند ہوگئی، وہ خود ہی اپنے جھوٹ کا اعتراف کر گئی تھی، وہ رخ موڑ کر کھڑی ہوگئی۔

''یہ...'' عمارہ بھی ایکدم چلائی، پھر فوراً ہی تھمی لیکن سخت آواز میں بولی۔

''یہ ذرا سی بات نہیں ہے، کسی اور کے گھر میں، دعوت والے دن، پورے خاندان کی موجودگی میں تم ایک غیر مرد کے ساتھ کمرے میں بند تھیں اور...''

''کمرہ بند نہیں تھا''۔ فارہ کو بھی موقع کی نزاکت کا احساس ہوا۔

''اسے بند ہی کہتے ہیں اور... ادھر دیکھو میری طرف''۔ وہ جارحانہ انداز میں آگے بڑھی اور فارہ کو کندھوں سے تھام کر اپنی طرف موڑا۔

''کیا کر رہا تھا وہ تمہارے ساتھ جو تم اسے روک رہی تھیں، بولو...''

''افوہ آپی! ایسا کچھ بھی نہیں ہے جس کی تمہیں اتنی ٹینشن ہے، دوست تھا وہ میرا، we are just friends اور بس''۔ اس نے عمارہ کے ہاتھ جھٹک دیے۔

''رئیس ماموں کے گھر تمہارا دوست''۔ عمارہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔

''ہاں میرا دوست بلکہ میرا اور عادل کا، ان فیکٹ عادل نے ہی میری دوستی اس سے کروائی تھی''۔

''کیا...؟'' عمارہ کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔

''او... میرے خدا، کیا عادل کو پتہ تھا کہ تم اس وقت وہاں اس لڑکے کے ساتھ تھیں؟''

''نو ناٹ ایٹ آل، اور یو ڈونٹ وری، میرا اب کوئی تعلق نہیں ہے اس سے، ہمارا بریک اپ ہو گیا ہے''۔

''کیوں؟'' وہ چونک پڑی۔

''بس''۔ اس نے کندھے اچکائے۔

''میرے کیلیبر کا نہیں تھا''۔ عمارہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر باہر نکل آئی۔

''بڑی جلدی خیال آ گیا''۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ بڑبڑائی تھی۔

☆..........☆..........☆

''امی! آئی ایم سوری، ویری سوری لیکن میں شہریار سے فارہ کے بارے میں بات نہیں کر سکتی''۔

''لیکن کیوں، ایسا کیا ہو گیا آخر، تم گھر آئی تھیں فارہ سے بات کرنے پھر...''

''ہاں وہ سب سورٹ آؤٹ ہو گیا مگر...''

''مگر کیا عمارہ؟ مجھے تو تمہاری بالکل سمجھ نہیں آتی، لوگ اپنے بہن بھائیوں کے لئے ایک سے بڑھ کر ایک ویل آف، ویل سیٹلڈ پارٹنر ڈھونڈ نکالتے ہیں، تم سے اپنی بہن کے لئے اپنے دیور سے بات نہیں کی جا رہی، شاباش ہے بیٹا، اسی دن کے لئے تم سے امید لگائی تھی ناں''۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہتی رہیں، عمارہ سنتی رہی۔

اب وہ بھلا ان سے کیا کہتی کہ فارہ نے ان سے جھوٹ کہا تھا، اسے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی، اس دن واقعی فارہ وہاں موجود تھی اور اس کے اس لڑکے سے جو بھی تعلقات تھے، وہ سب عادل کے علم میں بھی ہیں۔

''اف میرے خدا...!'' اس نے اپنے اعصاب شل ہوتے محسوس کیے۔

کیا یہ سب اتنا ہی سیدھا اور آسان تھا، جتنا امی اور فارہ نے سمجھ لیا تھا۔ اگر خدانخواستہ شہریار کو منگنی کے بعد یا شادی کے بعد فارہ کی یہ بات پتہ چل جاتی تو... اس کے بعد وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

شہریار، فارہ کے بارے میں کیا سوچتا، خود اس کے اپنے بارے میں کیا سوچتا، ہو سکتا تھا وہ عاقب سے اس بات کا شکوہ کرتا کہ عمارہ نے سب جانتے بوجھتے اپنی بدکردار بہن اس کے سر تھوپ دی، کیا اس کا اپنا گھر محفوظ رہ پاتا۔

''نہیں، نتائج دیر سے ہی سہی لیکن برے ہی نکلیں گے اور سامنے بھی ضرور آئیں گے، میں کبھی شہریار سے فارہ کی بات نہیں کر سکتی''۔ امی کی جھاڑ سن کر فون رکھتے وقت اس کی آنکھوں میں بے بسی کی نمی تھی۔

☆..........☆..........☆

اس کے سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ گئے، جب ایک دن ناشتے کی ٹیبل پر شہریار نے اسے بتایا کہ اس کی امی نے بطور خاص اسے ڈنر پر مدعو کیا ہے۔

''جی...'' نرم ملائم بریڈ کا پیس اس کے حلق میں پھنس گیا۔

''میں تو حیران رہ گیا کہ انہیں میرا نمبر کہاں سے ملا، پھر خیال آیا کہ آپ ہی نے دیا ہو گا''۔ شہریار بہت ریلیکس موڈ میں مسکراتا ہوا بات کر رہا تھا، جبکہ عمارہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''ویسے اگر اس ڈنر کے لئے بھابی خود بھی مجھ سے کہہ دیتیں تو میں انکار تھوڑا ہی کرتا''۔ وہ اب عاقب سے مخاطب تھا۔

عمارہ کچھ بے دم سی ہو گئی، اسے اندازہ نہیں تھا کہ امی اتنی تیز نکلیں گی، اس کے علم میں لائے بغیر ڈائریکٹ شہریار کو ہی انوائٹ کر لیں گے۔ اب ظاہر ہے وہ خود تو اپنے گھر جانے سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔

''اوکے بھابی! میں اب چلتا ہوں، ایک دوست کی طرف جانا ہے شام تک آ جاؤں گا پھر ڈنر آپ کے گھر''۔ وہ کہتا ہوا نکل گیا اور عمارہ کے لئے نئی فکروں کے دروازے کھول گیا۔

☆.........☆.........☆

شام میں عمارہ بے حد بجھے بجھے انداز میں تیار ہوئی، امی نے زسیا بھی اسے مطلع کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا، دعوت تو تھی ہی صرف شہریار کی، دل تو چاہ رہا تھا کہ انکار کردے لیکن یہ بھی ممکن نہ تھا۔

اسے امی پر غصہ سا آنے لگا، لیکن گھر پہنچ کر یہ غصہ بے انتہا حیرت کے ایک تیز ترین جھٹکے میں بدل گیا۔

فارہ بالکل اسی کے انداز میں سر پر اسکارف لپیٹے بے حد پروقار انداز میں ان لوگوں کی منتظر تھی اور یہ بات خاص طور پر عاقب نے بھی نوٹ کی کہ آج فارہ نے بطور خاص اسکارف اور فل سلیوز کے سوٹ کا اہتمام کیا تھا، ورنہ عام طور پر وہ کبھی لوز تو کبھی اسکن ٹائٹ ٹاپ کے ساتھ رنگ برنگی جینز یا ٹائٹس ہی پہنا کرتی تھی، اس کے شولڈر کٹ چھوٹے چھوٹے بال مکمل طور پر چھپ گئے تھے۔ یوں سر پر اسکارف لپیٹنے سے اس کی موہنی صورت کچھ اور نمایاں ہو گئی تھی، چہرے پر معصومیت کا تاثر کچھ اور ابھر آیا تھا۔

عمارہ کے چہرے پر ایک محسوس کی جانے والی سنجیدگی تھی، عام طور پر وہ گھر آ کر سر سے اسکارف اتار دیا کرتی تھی، مگر آج شہریار سے زیادہ اپنے غصے کی وجہ سے یونہی بیٹھی رہی اور کن انکھیوں سے فارہ کو دیکھتی رہی۔

فارہ کا بے داغ شفاف چہرہ بار بار پسینے سے بھیگ جاتا، وہ ایک دم پہلو بدلتی ٹشو سے چہرہ صاف کرتی، دو بار اٹھ کر اس نے بہانے سے کمرے میں جا کے اسکارف کھول کے پھر لپیٹا۔

عمارہ خوب جانتی تھی کہ وہ کیا حرکتیں کرتی پھر رہی ہے، اسے فارہ پر ترس بھی آیا اور ہنسی بھی۔

فارہ شکل وصورت اور تعلیم میں کسی سے کم نہیں تھی۔ اس کے لئے رشتوں کی کوئی کمی نہیں تھی، شہریار کے سامنے اتنی محنت اور جھوٹا بہروپ بھرنے کی مشقت وہ صرف شہریار کی مضبوط مالی حیثیت دیکھ کر کر رہی تھی، اس بات کو سراسر نظر انداز کر کے کہ اس طرح جھوٹ بول کر اپنی شخصیت پر عمارہ کی مشابہت کا جھوٹا خول چڑھا کر وہ کتنے دن شہریار کو اپنا بنا کر رکھ سکتی تھی، شاید چند مہینے بھی نہیں۔

لیکن شہریار کے وجود سے اٹھنے والی ڈالروں کی مہک نے اس کی عقل پر پردہ ڈال دیا تھا، شاید اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے لئے مال و دولت کو فتنہ قرار دیا گیا ہے۔

وہ فارہ کے ساتھ ساتھ خود کو بھی شہریار کی نظروں میں نہیں گرا سکتی تھی جبھی اس نے فی الفور رات امی کے یہاں رکنے کا قصد کر لیا۔

امی اور فارہ کے فی الفور منہ بن گئے، وہ جانتی تھیں کہ وہ آج رات گھر رکنے کی بات کیوں کر رہی تھی جبکہ دوسرے دن اس کی بیٹی کو اسکول بھی جانا تھا۔

☆.........☆.........☆

''یہ سب کیا ڈرامہ ہے فارہ؟'' عمارہ سے صبح کا انتظار کرنا مشکل تھا، جبھی وہ رات میں ہی فارہ کے کمرے میں پہنچ گئی۔

''کون سا ڈرامہ؟'' فارہ اے سی کے آگے بالوں کو اونچے جوڑے کی شکل میں پکڑے بیٹھی ''فوں فوں'' کر رہی تھی، عمارہ کی تپی تپی آواز پر بے نیازی سے پوچھنے لگی۔

''یہ...'' اس نے ہاتھ میں پکڑے اسکارف کو اس کے بیڈ پر پٹخ دیا۔

''یہ... اس کی بات کر رہی ہوں میں''۔

''اوہ... یہ اسکارف''۔ فارہ کا انداز بے حد طنزیہ تھا۔

''یہ ڈرامہ تو نہیں ہے، تم تو بڑے احترام اور عقیدت سے ہر جگہ اسی ڈرامے میں گھس کر جاتی ہو، جیسے یہ کوئی حفاظتی حصار ہے جو تمہارے اوپر پڑنے والی نظروں کے آگے اَن بریک ایبل شیلڈ بن جائے گا''۔

وہ سیدھی طرح بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی، عمارہ کو اور بھی برا لگا، ایک تو اس کا انداز اور پھر اس کی بات۔

''یہ اگر حفاظتی حصار نہیں ہے، تو یہ کوئی سلیمانی ٹوپی بھی نہیں ہے، جس کو پہن کر شخصیت کے سب جھول اور جھوٹ چھپا لیے جائیں''۔ اس کا انداز بہت تلخ تھا۔

''میرے تو چھپ گئے ناں''۔ فارہ مکاری سے ہنسی۔

''ہاں مگر صرف شادی تک کے لیے، وہ بھی اگر ہوسکی تو...''

''شٹ اپ آپی! کیوں نہیں ہوگی میری شادی، ہوگی اور ضرور ہوگی، ہاں یہ الگ بات ہے کہ تم جل بھن کر خاک ہو جاؤ گی''۔

''میں... میں کیوں جلوں گی بھلا؟'' اسے حیرت ہوئی۔

''کیونکہ شہریار کا اسٹیٹس عاقب بھائی سے بہت ہائی ہے اور کن جھوٹوں اور جھول کی بات کر رہی ہو تم، ماڈرن ہونا کوئی خرابی نہیں بلکہ خوبی ہے اور تم جیسے کامپلیکس کے مارے لوگوں میں جب یہ خوبی پیدا نہیں ہوتی، تو وہ ان مصنوعی بکلوں کے سہارے اپنی کمتری کی بھڑاس نکالتے رہتے ہیں، دوسروں کو اپنے تئیں نیچا دکھا کر... ان کے لونگ اسٹینڈرڈ کو بولڈ اور ماڈ کہہ کر''۔ فارہ نے اسے گنگ کر دیا، اس کے دل و دماغ میں عمارہ کے خلاف اتنا زہر تھا، وہ عمارہ کے طور طریقوں کو اتنا ناپسند کرتی ہوگی یہ عمارہ کے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔

''اچھا تو اگر یہ میرے جیسے احساس کمتری کے مارے ہوئے لوگوں کا اسٹائل ہے، تو تم کو یہ اسٹائل اپنانے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی، ابھی ابھی تم نے کہا ناں کہ ماڈرن ہونا خامی نہیں خوبی ہے، تو پھر شہریار کو اپنی خوبی سے امپریس کرنا تھا نہ کہ ان نقلی ہتھکنڈوں سے''۔ وہ کبھی فارہ سے اتنی لمبی بحث نہ کرتی، مگر فارہ نے براہ راست اس کی شخصیت کو نشانہ بنایا تھا، اس لیے جواب دینا ضروری تھا۔

''صبر سے کام لو تم اور دیکھتی جاؤ، میں بہت جلد شہریار کو اپنی خوبی سے ہی متاثر بھی کروں گی اور قائل بھی''۔ فارہ بات مکمل ہوتے ہی بیڈ پر لیٹ گئی، یہ عمارہ کے لیے اشارہ تھا کہ اب وہ تشریف لے جاسکتی ہے۔

''اللہ کرے تمہیں پچھتانا نہ پڑے''۔ باہر نکلتے وقت اس نے اپنی بہن کو دعا ہی دی تھی۔

☆..........☆..........☆

فارہ کی تلخ کلامی نے اسے اس درجہ دلبرداشتہ کیا کہ وہ دوسری صبح فجر کے وقت بنا کسی کو بتائے اپنے گھر واپس آ گئی، گاڑی اس کے پاس تھی، ڈرائیونگ اسے عاقب نے اسی کی سہولت کے لیے سکھائی تھی، جب وہ اس سے ڈرائیونگ سیکھنے کے لیے کہتا تھا تب وہ ہمیشہ انکار کر دیتی تھی، آج اسے اپنا ڈرائیونگ سیکھ لینا بھی ایک نعمت، ایک معجزہ سا لگ رہا تھا۔

گھر کے دروازے پر پہنچ کر اس نے گاڑی روکی تو احساس ہوا کہ وہ کب سے بے آواز رو رہی تھی۔

اسے فارہ نے نہیں رلایا تھا، وہ اس کی وجہ سے نہیں رو رہی تھی۔ اسے مستقبل میں ہونے والی اپنی رسوائی کے ڈر سے رونا آ رہا تھا، شہریار اور عاقب کی نظروں میں اپنے جھوٹے اور چھوٹا پڑ جانے کا خیال اتنا ہولناک اور زورآور تھا کہ اس کے حواس پورے طور پر مغلوب ہو چکے تھے۔

''مجھے عاقب کے سامنے پوری بات کھول کر بیان کر دینی چاہیے، وہ جو بھی مشورہ دیں''۔ کافی دیر دل کا بوجھ ہلکا کر لینے کے بعد اس نے بالآخر فیصلہ کر لیا۔

☆..........☆..........☆

عاقب کے سامنے اپنی بہن کی کردار کشی کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا، اس نے رئیس ماموں کے گھر والی بات دانستہ چھپالی، ہاں مگر یہ واضح کر دیا کہ فارہ شہریار سے شادی کرنا چاہتی ہے اس کے لیے اس نے شہریار کو متاثر کرنے کے لیے کچھ جھوٹ بولے ہیں، جو کہ وہ نہیں چاہتی کہ بعد میں کسی انکشاف کی طرح شہریار پر

بھلیں اور وہ فارہ یا عمارہ میں سے کسی کو ذرا اچھے۔

عاقب ایک بہت معاملہ فہم شخص اور بہت تعاون کرنے والا شوہر تھا۔ پوری بات خاموشی سے سننے کے بعد اس نے نا صرف عمارہ کو تسلی دی بلکہ شہریار کو کچھ بھی بتانے سے منع کر دیا۔

''اگر وہ وقتی طور پر شہریار کو پسند کرنے کی وجہ سے اپنا حلیہ بدل سکتی ہے تو ہو سکتا ہے کہ مستقل بھی بدل ڈالے''۔ عمارہ بے بسی سے سر جھکا کر رہ گئی۔

''وہ میری بہن ہے، میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں، وہ کبھی اپنے آپ کو ان جیسا نہیں کر سکتی''۔ عمارہ نے یہ باتیں محض دل میں ہی سوچیں، کہہ نہ سکی۔

☆............☆............☆

شہریار نے فارہ کو پسند کر لیا اور اس کی اور گھر والوں کی باہمی رضامندی سے دونوں کی منگنی کر دی گئی، گو کہ منگنی کا فنکشن بہت سادہ تھا نہ بہت پر تکلف، بس چند مہمانوں کی موجودگی میں شہریار اور اس کی بہن نے فارہ کو انگوٹھی پہنا دی تھی لیکن اس چھوٹی سی تقریب کے لئے امی اور سلمان نے اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا تھا، جس میں ان کا ٹھیک ٹھاک خرچہ ہو گیا تھا۔

وہ امی سے اسی بارے میں بات کرنے آئی تھی کہ جب اتنے ذرا سے اور قریبی لوگوں کو بلوایا تھا تو کھانے میں اس قدر ورائٹی رکھنے کی کیا ضرورت تھی لیکن اسی وقت امی کے ساتھ کھڑی ایک لڑکی نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ وہ بہت مسکرا مسکرا کر بہت بناوٹی انداز میں بے حد دھیمی آواز میں باتیں کر رہی تھی۔

ابھی وہ قریب جا کر اس سے تعارف بھی حاصل نہیں کر پائی تھی کہ امی خود ہی بول پڑیں۔

''لو بھئی عمارہ! اپنی ہونے والی بھابی سے ملو''۔ انہوں نے حقیقت میں عمارہ کے سر پر بم پھوڑا تھا، عمارہ بجائے اس لڑکی سے ملنے کے اپنی ماں کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

☆............☆............☆

صبح سے کئی بار فون کی بیل بج چکی تھی لیکن عمارہ نے فون اٹینڈ نہ کرنے کی قسم کھا لی تھی۔ وہ امی اور سلمان سے سخت ناراض تھی، اور یہ ناراضی حق بجانب بھی تھی۔ اتنا بڑا فیصلہ امی اور سلمان نے بالا ہی بالا کر لیا اور اس سے مشورہ تو دور، اسے بتانے تک کی زحمت نہ کی، رہ رہ کر اس کا دل بھر آتا، آنکھیں ڈبڈبانے لگتیں، تقریب میں بھی امی سے یہ بات کرنے کے بعد اس کا دل نہیں لگا تھا، وہ بے دلی سے ایک جانب بیٹھی رہی، سب لوگوں نے اس کی بے توجہی نوٹ کر لی تھی، یہاں تک کہ وہ سلمان کے ہونے والے سسرالیوں سے بھی ملنے نہیں گئی، وہاں سے اسی رات واپسی کا قصد کر کے جب گھر آنے لگی تو امی سے کہا۔

''جیسے خاموشی سے منگنی کر دی ویسے ہی شادی بھی کر دیجئے گا''۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن امی کی نظریں جھک سی گئیں، اس کے گلے میں پھندا سا پڑ گیا، اور برابر میں کھڑا ہوا عاقب بھی اس کی چبھتی ہوئی بات پر ایک دم چونک گیا، وہ تیزی سے پلٹ گئی تھی۔

تب سے اب تک امی بے شمار بار فون کر چکی تھیں، مگر وہ اس بار اپنی خاموشی سے انہیں جتانا چاہتی تھی کہ وہ بھی اسی گھر کا فرد تھی، ان کی اپنی اولاد تھی اور ان کی اس حرکت سے اس کے دل کو کتنی ٹھیس لگی تھی۔

فون بج بج کر بند ہو گیا، اس نے آنکھوں میں آئی نمی صاف کی اور کام میں لگ گئی۔

رات میں عاقب کے آفس سے آنے کے بعد اس کے پاس امی کا فون آ گیا، عاقب نے کہا تو اسے بات کرنی ہی پڑی۔

''تم خوامخواہ میں ہی ناراض ہوئی جا رہی ہو، ارے بھئی ابھی تو صرف رشتہ دیا ہے، انہوں نے ہاں تھوڑا ہی کی ہے جو تم اتنی غصے میں آ گئیں اور رشتہ بھی ایسے ہی اچانک ایک دن جانا پڑا، کیونکہ لڑکی کی دادی بہت بیمار تھیں، تمہیں بلاتے تو ٹائم لگ جاتا اور بس''۔

وہ خاموشی سے ان کی وضاحتیں سنتی رہی۔

"تم فکر مت کرو، بہت دھوم دھام سے منگنی کا فنکشن رکھیں گے، کسی شاندار فائیو اسٹار ہوٹل میں، بہت پیسے والے لوگ ہیں، بہت اونچے لوگوں سے تعلقات ہیں ان کے، ہمارا ابھی تھوڑا اسٹیٹس..."

عمارہ نے گہری سانس بھری، ابھی وہ کہہ رہی تھیں کہ لڑکی والوں نے ہاں نہیں کی اور ابھی فوراً ہی منگنی کی باتیں، پتہ نہیں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ، وہ خود ہی اپنی باتوں کی نفی کر رہی تھیں۔

اس نے بددلی سے فون بند کر دیا۔

☆............☆............☆

شہریار اور فارہ کی تقریباً روز ہی فون پر بات چیت ہونے لگی، اس نے غیر مناسب جان کر فارہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اتنی جلدی اتنی بے تکلفی اچھی نہیں، مگر اس پر اثر تو کیا ہونا تھا الٹا اس نے عمارہ کا مذاق ہی اڑایا۔

اسی دوران فارہ کی برتھ ڈے آ گئی، اس نے شہریار سے اصرار کیا کہ وہ یہ سالگرہ شہریار کے ساتھ کہیں باہر سیلیبریٹ کرنا چاہتی ہے۔

شہریار بالکل نہیں چاہتا تھا لیکن پھر فارہ کی خوشی کے لئے اور یہ سوچ کر مان گیا کہ اس کے واپس امریکہ جانے میں چند دن ہی باقی تھے، عمارہ کو بھی فارہ کی یہ فرمائش کچھ عجیب سی لگی لیکن چونکہ وہ فارہ کے مزاج سے واقف تھی اس لئے اس نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی، لیکن ہمیشہ کی طرح اس نے عاقب سے بات ضرور کی۔

"شہریار کا مزاج ایسا نہیں ہے اور فارہ نے زبردستی ہی پروگرام رکھ لیا"۔

"تم کیوں پریشان ہو رہی ہو، انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ ہوتی ہے"۔

"ہم... ہم... م... اللہ کرے ایسا ہی ہو"۔ اس نے دل سے دعا کی تھی مگر شاید دعا کی قبولیت کا وقت نہیں تھا۔

شہریار رات کے کھانے کے بعد واپس آیا تو کافی خاموش تھا، عمارہ نے نوٹ تو کیا لیکن وہ اس سے کوئی بات کرنے یا پوچھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

☆............☆............☆

شہریار واپس چلا گیا، عمارہ کا خیال تھا کہ فارہ اسے ایئرپورٹ سی آف کرنے آئے گی مگر ایسا نہیں ہوا، وہ حیرت میں گھر گئی۔

واپسی پر عاقب اسے منع کرنے کے باوجود امی کے گھر لے آئے، گھر پر اس وقت فارہ اور امی ہی تھیں، امی ان کے لئے چائے بنانے لگیں تو وہ فارہ کے کمرے میں چلی آئی۔

"تم شہریار کو سی آف کرنے نہیں آئیں"۔ فارہ اپنے رویئے سے اسے کچھ بجھی بجھی سی لگی۔

"شہریار کو پسند نہیں، شادی سے پہلے یوں باہر گھومنا پھرنا اور ملاقاتیں کرنا"۔

"میں نے تو تمہیں پہلے ہی بتایا تھا لیکن اسے ایئرپورٹ سی آف کرنے آنے میں تو کوئی برائی نہیں تھی"۔

فارہ نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر اٹھ گئی۔

"مجھے لگتا ہے شہریار اور فارہ کی آپس میں کوئی بات ہوئی ہے"۔ واپسی میں اس نے عاقب سے اپنے خدشے کا ذکر کیا۔

☆............☆............☆

اس کا اندازہ ٹھیک تھا، آپس میں بات ہوئی تھی لیکن وہ بات اتنی معمولی نہیں تھی۔ امی نے اسے بہت ایمرجنسی میں گھر بلایا تھا۔

وہ گھر پہنچی تو فارہ کی سوجی ہوئی آنکھیں اور سرخ چہرہ کوئی اور ہی کہانی سنا رہے تھے۔

"شہریار نے منگنی کی انگوٹھی واپس کر دی ہے اور یہ رشتہ ختم کر دیا ہے"۔ امی کے انداز میں غصے کے بجائے ایک دبی دبی شرمندگی تھی لیکن عمارہ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"کیا... لیکن کیوں... اور اتنی اچانک کیسے؟"

امی نے جواب دینے کے بجائے فارہ کو دیکھا، وہ

تیزی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

''ہوا کیا ہے؟''

''کوئی لڑکا ہے شہریار کا دوست، وہ ملا تھا اس دن، جب یہ دونوں باہر گئے تھے، اس نے شہریار سے کہا کہ فارہ سے اس کی دوستی تھی جو اس نے تم سے منگنی کرنے کے بعد ختم کر دی''۔ امی کی آواز بھرا گئی اور عمارہ کا منہ کھل گیا۔

''فارہ کے سامنے، فارہ نے اس کے منہ پر تھپڑ کیوں نہیں دے مارا''۔

''فارہ کے سامنے نہیں، بعد میں شہریار سے باقاعدہ ملاقات کر کے، شہریار نے فارہ کو بہت باتیں سنائی ہیں، اسے جھوٹی اور دھوکے باز تک کہا ہے، اس لڑکے نے فارہ کی تصویریں بھیجی ہیں اسے''۔

''اوہ میرے خدا!'' اسے اپنی فکر پڑ گئی، نہ جانے اب شہریار اسے کیا کچھ کہتا۔

''اور...'' امی کچھ جھجک کر رک گئیں۔

''اور کیا؟''

''تم نے ٹھیک کہا تھا کہ فارہ رئیس کے گھر کسی لڑکے کے ساتھ تھی، یہ وہی لڑکا تھا، فارہ نے اب جا کے یہ بات مجھے بتائی ہے، میرا دل کر رہا ہے اس کا گلا دبا دوں''۔ امی دانت پیس رہی تھیں۔

''اب اتنا ری ایکشن دکھانے کا کیا، میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ فارہ کو چاہئے اپنی حفاظت کرے، لڑکیوں کی عزت اتنی بے قیمت نہیں ہوتی کہ اسے یوں دوسروں کے آگے رولا جائے امی!'' امی خاموش تھیں، اب کہنے کو کیا بچا تھا، لیکن عمارہ کی ٹینشن تو اصل میں اب شروع ہوئی تھی، نہ جانے اس سارے واقعے میں جسے حادثہ کہنا زیادہ مناسب تھا، عمارہ کو شہریار کس خانے میں رکھنے والا تھا، اسے عاقب کی نظروں میں اپنی عزت کی فکر پڑ گئی تھی۔

☆.........☆.........☆

''شہریار کا فون آیا تھا آفس میں''۔ عاقب ایک روز رات میں اچانک بول اٹھا۔

''پھر؟'' عمارہ کا سانس رک گیا۔

''بہت معذرت کر رہا تھا، اسپیشلی تم سے کہ وہ فارہ سے شادی نہیں کر سکتا، کہہ رہا تھا اس کے فارہ سے بہت کلیشز ہیں، انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہو سکتی''۔

''اور...'' وہ سرسراتی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

''بس اور کیا؟'' عمارہ نے بے اختیار ایک سکون کا سانس لیا۔

شہریار یقیناً ایک پختہ سوچ اور باشعور ذہنیت کا مالک تھا جبھی تمام قصے کا ذمہ دار عمارہ کو ٹھہرانے اور اس پر الزام دھرنے کے بجائے اس نے اس سے سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا، الٹا معافی الگ مانگ لی۔

''میں تو بہت ڈر گئی تھی کہ اب پتہ نہیں وہ فارہ کی وجہ سے میرے بارے میں کیا سوچے گا''۔

''کچھ غلط نہیں سوچ سکتا وہ، تمہیں کئی سالوں سے جانتا ہے میرے حوالے سے، فارہ سے تو ابھی جان پہچان ہوئی تھی اس کی''۔

''لیکن میں بھی تو فارہ کی بہن تھی ناں''۔

''اس سے پہلے تم اس کے نزدیک میری بیوی ہو اور وہ تمہیں میری بیوی کی حیثیت سے جانتا ہے اور میری بیوی کے بارے میں کوئی غلط امپریشن بنائے، ایسا میں ہونے نہیں دے سکتا، فارہ کے لئے پرپوزل دیتے وقت ہی میں نے تمہاری نیوٹرل پوزیشن اس کے سامنے کلیئر کر دی تھی''۔

عمارہ کے سر سے کوئی بوجھ سا اتر گیا، اس نے اپنے کردار کی حفاظت کی تھی، اللہ نے اس کی عزت رکھ لی تھی، فارہ نے اپنی عزت کی پرواہ نہیں کی اسی لئے اسے یہ شرمندگی جھیلنی پڑ رہی تھی۔

''ایک بار کردار کے کانچ میں لغزش کا بال آ جائے، تو عمر بھر کی ریاضت بھی اسے دور نہیں کر سکتی''۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور عاقب کو دیکھ کر مسکرا دی۔

☆.........☆.........☆

سیدہ فرزانہ حبیب فرزین

افسانہ

صحرا میں چھاؤں

جیسے ہی اریبہ نے گھر میں قدم رکھا اسے اپنی بہن کی آہ و بکا میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی جس نے اریبہ کا موڈ ہمیشہ کی طرح خراب کر دیا۔

''اف یہ آپی بھی ناں!'' سوائے اپنے سسرالی



عزیزوں کی برائیوں کے ان کو کوئی کام نہیں۔اب سارا دن ان کی جھوٹی سچی فریاد سنتے اور انہیں تسلی دیتے گزرے گا۔پھراماں بی کا حکم آئے گا کہ ان کی لاڈلی کے لیے اس کی پسند کا اچھا سا ڈنر تیار کیا جائے اور ان کے دونوں شرارتی بچے......'' ابھی اریبہ یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ اسے اپنے کمرے کے اندر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی اریبہ کا دل دہل کر رہ گیا اس نے جلدی سے کمرے کا رخ کیا حسب توقع وہ دونوں شرارتی اس کی رائیٹنگ ٹیبل پر چڑھے کاغذوں کو پھاڑ کر جہاز بنا رہے تھے۔اس نے رات ہی اتنی محنت سے ایک غزل لکھی تھی۔ جو اسے ''ماہنامہ ردا'' میں پوسٹ کرنی تھی اور اب وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوئے کسی دکھی دل کی طرح اپنی کم مائیگی کا ماتم کر رہی تھی ابھی اریبہ اس غم سے ہی نہیں سنبھل پائی تھی کہ اسے اپنی فیورٹ پرفیوم جو اس کی دوست نورین نے اس کی برتھ ڈے پر دیا تھا۔اس کے کانچ ادھر ادھر بکھرے نظر آئے۔جس نے اریبہ کے دل کو بھی زخمی کر دیا۔اس نے دونوں کو غصے سے گھورا جو بظاہر اب سہمے ہونے کی ایکٹنگ کر رہے تھے۔

''حوریہ اور راحیل! تم دونوں میری کسی چیز کو



سلامت بھی رہنے دو گے۔ تمہارے ناما، بابا نے یہ ساری چیزیں دلائی ہیں ناں۔ جو اتنے دھڑلے سے میرے کمرے میں دندناتے پھرتے ہو اور تو اور میری چیزوں کا ستیاناس بھی کر دیا۔ تمہاری اماں کو تو اور بس میں سسرالی عزیزوں کی برائی اور غیبت کے علاوہ اور کوئی غم نہیں کہ اولادوں کی صحیح تربیت کرلے۔'' اریبہ کا بس نہیں کہ اولدوں کی صحیح تربیت کرلے۔'' اریبہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دونوں کو کچا چبا جائے۔ آواز سن کر شائلہ بھی وہیں آ گئی۔ اور ہمیشہ کی طرح اپنے بچوں کو لپٹا کر وہ واویلا مچایا کہ اریبہ کو لینے کے دینے پڑ گئے۔

''ارے اماں! دیکھ رہی ہیں ناں۔ اب یہ ہے میری اور میرے بچوں کی اوقات شادی کے بعد تو میں جیسے پرائی ہو گئی۔ وہاں میری ساس ''بڑی بی'' اور نندوں نے جینا حرام کیا ہوا ہے۔ دو گھڑی یہاں آرام کے لیے آ جاؤ تو ان محترمہ سے دیکھا نہیں جاتا کیا ہوا اگر ایک پرفیوم کی شیشی توڑ دی ارے بچے تو شرارت کرتے ہی ہیں۔ جا رہی ہوں اماں اب نہیں آؤں گی۔'' شائلہ نے اپنے ان دیکھے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''ارے آپی! پلیز! مجھے آپ کے آنے پر اعتراض نہیں مگر کم از کم اپنے سسرال والوں کی غیبت کرنا تو چھوڑ دیں اور اس کو اپنا گھر سمجھیں اور ان کو کچھ تمیز سکھائیں۔'' بس اس کا یہ کہنا تھا کہ اس نے اپنی شامت کو آواز دے دی۔

''ارے سن رہی ہیں ناں اماں! اب یہ کل کی لڑکی مجھے سمجھائے گی کہ بچوں کی تربیت کیسی کرنی ہے ارے بی بی! ابھی آزاد ہو ناں۔ جب شادی ہوگی سسرالی چپقلش سے واسطہ پڑے گا۔ تب تم سے پوچھوں گی ہونہہ۔'' یہ کہہ کر آپی بچوں کو لے کر باہر چلی گئیں۔ اریبہ کو لگا کہ انہیں سمجھانا عبث ہے اماں نے بھی حسب توقع اسے ہی خاموش ہونے کے لیے کہا۔

ایک تو ویسے ہی کالج سے آکر تھکاوٹ تھی اوپر سے یہ نئی مصیبت اس نے اپنی شاعری کے پیپر اور پرفیوم کی ٹوٹی شیشی کو حسرت بھری نگاہ سے اور پھر کرچیاں اٹھانے لگی۔

☆......☆

اریبہ اور شائلہ انور صاحب کی زادیاں تھیں۔ مزاج اور عادت میں دونوں ایک دوسرے کے برعکس، شائلہ جذباتی، گرم مزاج اور جلد باز تھی۔ جب کہ اریبہ نرم خو، معاملہ فہم اور تھوڑی تھرلنگ طبیعت کی مالک تھی۔ شائلہ نے انٹر کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا مگر اریبہ نے آگے تعلیم جاری رکھی اور اب وہ بی کام کے فائنل میں تھی۔ انور صاحب نے اپنے آفس کولیگ کے توسط سے آئے ہوئے رشتے پر چھان بین کے بعد شائلہ کی شادی کروی تھی۔ بظاہر اس کے سسرال والے اچھے تھے۔ اس کا شوہر طارق بھی کافی سلجھا ہوا لڑکا تھا مگر شادی کے تین سال بعد ایک بیٹے کی ماں بننے کے بعد بھی وہ اس گھر میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی تھی۔ اریبہ نے اپنی بہن کی شادی شدہ زندگی کو دیکھتے ہوئے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ اپنے سسرال کو اپنا گھر سمجھے گی اور اپنی ساس اور نندوں کو ماں اور بہن کا درجہ دے گی۔

☆......☆

''ہائے اریبہ! کیسی ہو تم؟ اور پیپرز کی تیاری کیسے چل رہی ہے؟'' اریبہ آج ایک ہفتے بعد ایڈمٹ کارڈ کے سلسلے میں کالج آئی تھی۔ جہاں اس کی ملاقات اپنی بہترین دوست نورین سے ہوئی۔

''ہاں یار! بس تیاری اچھی ہی ہے اور تم سناؤ؟ آگے کیا ارادہ ہے۔'' اریبہ نے اس کے ہمراہ کاؤنٹر کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

''آگے کیا ارادہ ہونا ہے؟ بس پیا دیس سدھارنے کی تیاری۔ تم بتاؤ؟'' نورین نے اس سے استفسار کیا۔

''مجھے تو یار آگے جاب کر کے ابو کا ہاتھ بٹانا ہے۔ باقی جو قسمت کو منظور۔'' اریبہ نے اپنا ارادہ بتایا۔

''اور شادی کے بعد سسرال کے لیے جو عزائم تھے اس پر تم ابھی تک برقرار ہو؟'' نورین نے اس سے پوچھا۔

''ہاں۔ بس دعا کرو آگے اللہ مجھے میرے ارادے میں کامیاب کرے۔ میں اس ساس بہو سے متعلق فرسودہ روایت کو توڑ کر ایک اچھی مثالی بہو کا کردار ادا کرنا چاہتی ہوں۔'' اریبہ نے ایک عزم سے کہا۔

''ہوں اللہ تمہیں، تمہارے نیک ارادے میں کامیاب کرے''۔ ''آمین'' اور ہر لڑکی کو پرسکون زندگی عطا کرے۔'' ''ثم آمین'' یہ کہہ کر اریبہ اور نورین نے ایک دوسرے کو رخصت کہا۔

☆......☆

آج اریبہ کا آخری پیپر تھا ارادہ تھا کہ گھر جا کر آرام کرے گی۔ مگر گھر پہنچ کر اسے خلاف توقع چہل پہل نظر آئی۔ شمائلہ بھی بچوں سمیت آئی ہوئی تھی۔ مگر آج اس کے چہرے پر بیزاری کی جگہ خوشی کی رمق تھی اس نے اریبہ کو دیکھ کر فوراً گلے لگایا اور اسے بڑے مصروف سے انداز میں تیار ہونے کے لیے کہا۔

''جاؤ جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔ پھپھو اپنے بیٹے سکندر کے ساتھ آئی ہیں۔''

''کیا سکندر بھائی؟ وہ کب کینیڈا سے واپس آئے؟'' اریبہ نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا اسے اپنے یہ سوبر اور سنجیدہ مزاج، ذہین و فطین سے کزن بہت پسند تھے۔ جب تک وہ یہاں تھے اکثر اریبہ کی اسٹڈی میں مدد کر دیا کرتے تھے۔ پھر وہ ہائر اسٹڈیز کے لیے کینیڈا چلے گئے اور اب پورے 5 سال بعد وطن واپسی ہوئی تھی۔ اریبہ نے جلدی جلدی شاور لیا اور آسمانی و سفید لان کا برانڈڈ سوٹ زیب تن کر کے گیلے بالوں کو کلپ لگا کر کھلا چھوڑ دیا۔ کانوں میں سفید موتیے کے آویزے اور ہاتھ میں بریسلٹ پہن کر ایک طائرانہ نظر خود پر ڈالی اور پھپھو سے ملنے ڈرائنگ روم کا رخ کیا۔

''السلام علیکم پھپھو!'' اس نے پھپھو کو جھک کر سلام کیا ساتھ ہی بیٹھے سکندر پر بھی سلامتی بھیجی۔ مگر اس میں تھوڑی جھجک کی آمیزش شامل تھی۔ سکندر ان پانچ سالوں میں اور بھی زیادہ ہینڈسم اور سنجیدہ ہو گیا تھا۔ سکندر نے بھی اس پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور مسکرا کر جواب دیا۔ پھپھو نے اسے اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ خوشگوار ماحول میں چائے پی گئی۔ اس دوران سکندر اس سے اس کی اسٹڈی اور دیگر مشاغل کے بارے میں چھوٹے موٹے سوالات کرتا رہا۔ جس سے اریبہ کی جھجک کم ہوئی۔ اریبہ کے والد کے آنے پر کھانا کھایا گیا۔ کھانے کے بعد اریبہ قہوہ بنانے لگی تو اس کے پیچھے ہی شمائلہ چلی آئی۔

''کیا بات ہے آپی! آج بڑی خوش نظر آ رہی ہو؟ خلاف توقع آج کوئی نند اور ساس نامہ بھی نہیں سنایا گیا۔'' اریبہ نے قہوہ کپوں میں انڈیلتے ہوئے اسے چھیڑا۔

''فکر نہیں کرو بنو! تمہارا ابھی جلد ایک عدد نند اور ساس سے واسطہ پڑنا ہے۔ ساس کی تو خیر ہے مگر نند وہ بھی شوہر سے بڑی، غیر شادی شدہ اور نک چڑی جو ہل کر پانی بھی پینا پسند نہیں کرتی۔'' شمائلہ نے نخوت سے کہا۔ اریبہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟''

''ارے میری بھولی بہن اندر پھپھو اور ابا کے درمیان تمہارے اور سکندر کے شادی کے معاملات طے کیے جا رہے ہیں۔'' شمائلہ نے اسے بتایا تو وقتی طور پر اریبہ بھی پریشان ہو گئی۔ بے شک سکندر جیسا مردانہ وجاہت و ذہانت رکھنے والا شخص کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتا تھا اریبہ کو اپنی خوش قسمتی پر رشک آیا۔

مگر دوسری طرف اس کی بہن نرگس آپا کی تنک مزاجی اور چرب زبانی جو پورے خاندان میں مشہور تھی۔ جس کی وجہ سے ان کی اب تک شادی بھی نہیں ہو پائی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ کچھ اندیشوں اور وسوسوں کا شکار تھی مگر اس نے پھر اپنے اللہ کی رضا اور والدین کے فیصلے پر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے نیک ارادوں اور عزائم سے سب کا دل جیت لے گی۔ اور پھر سکندر جیسے آئیڈیل انسان کا جیون ساتھی بننا اس کی خوش قسمتی تھی۔

☆......☆

اس طرح کچھ وسوسوں اور خدشوں میں گھری والدین کے گھر کی کھٹی میٹھی یادوں اور مستقبل کے سہانے خوابوں کو آنکھوں میں بسائے وہ پیا دیس سدھار گئی۔ وہ اس کی سگی پھپھو کا گھر تھا۔ وہ بارہا یہاں آچکی تھی مگر آج اس نئے رشتے اور حوالے سے وہ یہاں موجود تھی اس کو تمام ماحول انوکھا اور خوب صورت لگ رہا تھا۔ کمرے میں گلاب اور موتیے کی ملی جلی بھینی خوشبو نے ماحول کو خواب ناک بنا دیا تھا۔ وہ سرخ شرارے میں گولڈن جیولری اور آرائش سے آراستہ انوکھے لے پر دھڑکتے دل کے ساتھ سکندر کا انتظار کر رہی تھی۔ جو اب اس کے دل کا سکندر بن کر سب سے اونچے ایوان پر براجمان تھا۔

''السلام وعلیکم!'' سکندر اسی مخصوص دھیمی چال چلتے اس کے پاس آیا اور حسب معمول گھمبیر لہجے میں سلامتی بھیجی۔

''وعلیکم السلام۔'' اریبہ نے بار حیا سے جھکی پلکوں کے ساتھ جواب دیا۔

''کیسی ہو تم؟ ارے یار! یہ وہی تمہاری پھپھو کا گھر ہے۔ تم اتنا گھبرا کیوں رہی ہو؟ بالکل ریلیکس ہو کر بیٹھو۔'' سکندر نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں مگر کچھ بے تکلفی سے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ پھر اس نے اریبہ کے حنائی ہاتھ میں دو آسی کنگن اور ایک ڈائمنڈ رنگ اس مان اور یقین کے ساتھ پہنائی کہ وہ اس گھر کو اب اپنا سمجھے گی۔ سکندر دل و جان سے اس کا تھا۔ وہ اسے شروع سے ہی پسند تھی۔ بس اسے بدلے میں اس کی والدہ کی عزت اور اس کی بہن کو پہلے کی طرح اس گھر کا اہم فرد کا درجہ دینا تھا۔ اریبہ نے سکندر کی اپنائیت میں ہی اس بات کو گرہ سے باندھ لیا۔ اب اس کا ارادہ مزید مستحکم ہو گیا تھا۔ اس نے سکندر کے ساتھ ساتھ گھر کے مکینوں کا بھی دل جیتنے کا عہد کر لیا تھا۔ ویسے بھی اس کو اس بات کی ڈھارس تھی کہ یہ اس کی اپنی پھپھو کا گھر ہے۔ ان کا اپنا خون ہے لہذا اسے یہاں ایڈجسٹ ہونے میں کچھ مسئلہ نہیں ہوگا۔ شادی کے ابتدائی دن دعوتوں اور ہنی مون ٹرپ میں گزرا۔ مگر اصل مرحلہ تب آیا جب اریبہ نے عملی زندگی میں قدم رکھا۔

☆......☆

آج سکندر کے آفس کا پہلا دن تھا۔ اس نے سکندر کی تیاری میں مدد کروائی۔ سکندر نے اس کے سگھڑاپے کی دل سے تعریف کی جس سے لائبہ نے خوشگوار موڈ میں کچن کا رخ کیا اس نے بہت دل لگا کر آملیٹ اور پراٹھا بنایا اور پھر پھپھو اور آپا کو ناشتے کے لیے آواز دی۔

''اے بی! ہمارے گھر کا یہ دستور نہیں ہے کہ بیوی شوہر کے ساتھ کمرے سے باہر نکلے۔ کل سے سکندر کے کپڑے وغیرہ تیار کر کے رکھ دینا اور سات بجے تمہیں کچن میں ہونا ہے۔'' اریبہ نے حیرت سے پھپھو کی طرف دیکھا۔ یہ وہی پھپھو تھیں جو اس کے واری صدقے جاتی تھیں اور آج اتنی اجنبی مکمل طور پر ساس کے روپ میں بات کر رہی تھیں۔ اس نے امید بھری نظروں سے سکندر کی طرف دیکھا مگر وہ ناشتے میں مصروف ہو چکا تھا۔ اریبہ کا سکندر کی اس لاتعلقی پر دل افسردہ ہوا مگر اس نے اپنے خیالات کو جھٹک کر صرف اتنا ہی کہا۔

''جی پھپھو! آئندہ خیال رکھوں گی۔'' بیسٹ ڈیبیٹر اصول کی پکی دوسروں کو اپنے دلائل سے منوا لینے والی آج زندگی کے اس نئے امتحان میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ جب کہ اس نے سکندر کے کپڑے، جوتے وغیرہ رات میں ہی تیار کر کے رکھ دیئے تھے اور سوا سات بجے کچن میں تھی صرف پندرہ منٹ کی تاخیر پر ابتدائی دن میں ہی اتنا سخت اور تحقیر آمیز لہجہ اور پھر سکندر کا لاتعلق انداز، یہ وہی سکندر تھا جو خلوت کے لمحات میں اس کے دوست کی طرح تھا۔ پھپھو سے زیادہ سکندر کے اس اجنبی انداز پر اس کی آنکھیں بھر آئیں، وہ اپنے دل مضطر کو ابھی اس رویے سے سنبھال بھی نہیں پائی تھی کہ آپا کی طنزیہ آواز سنائی دی۔

''ارے اریبہ، یہ پراٹھے کنارے سے اتنے موٹے اور جلے ہوئے ہیں، کیا ممانی نے تمہیں تعلیم کے علاوہ کچھ نہیں سکھایا۔'' اریبہ جواباً خاموش رہی اور پھر وہی جلے ہوئے پورے دو پراٹھے آپا نے آملیٹ کے ساتھ مزے سے کھائے اور گرم بھاپ اڑاتی چائے کا کپ اٹھا کر اپنے کمرے کا رخ کیا۔ اس نے تمام برتن سمیٹ کر کچن میں رکھے اور اپنے آنسوؤں کو دل میں گراتی برتن دھونے لگی۔

''اریبہ! پانی کم گرایا کرو۔''

''جی پھپھو۔'' اریبہ نے جلدی جلدی برتن دھو کر اپنے کمرے کا رخ کیا سکندر کی اجنبیت کے باوجود وہ اسے خدا حافظ کہنا چاہتی تھی۔ اس نے سکندر پر آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کیا۔

''او کے مائی سوئیٹ وائف! I miss you v.much. بس آپا کی باتوں کا برا نہیں ماننا۔ وہ زبان کی تھوڑی تیز ہیں اور کوئی بات نہیں، کام کا کیا ہے امی کے گائیڈ لنس میں سیکھ جاؤ گی۔'' یہ کہہ کر وہ گال تھپتھپاتے آفس کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ جس کی کوکنگ پورے خاندان میں مشہور تھی اس کے بابا کا ناشتہ اس کے ہاتھ کے پراٹھے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا۔ آج اپنے شوہر اور نند کے نزدیک نااہل اور پھوہڑ قرار دے دی گئی تھی۔

''ارے اریبہ!، ابھی تو پہلا مرحلہ ہے ابھی تو تمہیں بہت سے کٹھن مرحلے طے کرنے ہوں گے بس ابھی سے تم ہمت ہار گئیں۔'' اس کے دل نے سرزنش کی۔

''نہیں، نہیں میں ہمت نہیں ہاروں گی۔ انشاء اللہ ایک دن اس گھر کے ساتھ ساتھ پھپھو اور آپا کے دل میں بھی میری قدر ہو گی اور مجھے اچھا لگا کہ سکندر امی اور آپا کے احترام میں خاموش رہے مگر وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں ان کی محبت ہی میرا حوصلہ ہے۔''

ایک نئے جذبے اور لگن کے ساتھ اس نے کمرے کی تفصیلی صفائی کی اور پھر رات کا سالن اپنے جہیز کے مائیکرو ویو اوون میں گرم کر کے گرما گرم روٹیاں ڈالیں۔

''ارے اریبہ! یہ کیا؟ تمہیں نہیں معلوم ہمارے یہاں پھلکے بنتے ہیں اب یہ سخت بدمزہ روٹیاں کون کھائے گا؟ خیر آئندہ خیال رکھنا۔ بھائی صاحب بھی تو پہلے میرے ہاتھ کے پھلکے شوق سے کھاتے تھے مگر ہماری بھابی جی نے بے چارے کو یہ سخت پاپڑ جیسی روٹی کھانے پر مجبور کر دیا مگر بی بی! سکندر کو ایسی روٹیاں بالکل پسند نہیں۔ یہاں کے جو طور طریقے ہیں وہ اپناؤ۔'' اس کی کوئی بات سنے بغیر دونوں ماں بیٹی کھانے میں مصروف ہو گئیں۔ ساتھ ساتھ خاندانی معاملات پر تبصرے جاری تھے۔ اریبہ نے سارے کام نمٹائے اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ یہ کمرہ یہ ہی اس کی جائے پناہ تھا، جہاں اسے اپنے حق ملکیت کا احساس ہوتا تھا وقت گزرتا گیا۔ سکندر جو خلوت کے لمحات میں اس کا محبوب شوہر ہوتا تھا، دن کے اجالے میں اپنی ماں اور بہن کے سامنے اجنبیت کا روپ اختیار کر لیتا۔ اریبہ نے آج تک اپنے گھر والوں

سے حرف شکایت نہیں کی تھی۔ شائلہ نے بھی اس سے کئی بار اس کی ازدواجی زندگی کے حالات جاننے کی کوشش کی مگر اس نے ہمیشہ اسے مسکرا کر مطمئن کر دیا۔

☆......☆

آج کل وہ تخلیق کے مراحل سے گزر رہی تھی، جون کی تپتی دوپہر میں چولہے کے پاس کھڑے ہونا اس کے لیے محال تھا آج بھی اس نے بڑی مشکل سے جلدی جلدی کھانا بنا کر کمرے کا رخ کیا، صبح سے الٹیاں کر کے اس کی طبیعت بے حال تھی مگر آپا نے سر درد کا بہانہ بنا کر خود کو کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ آج پہلی بار اسے اپنی ہمت پست ہوتی محسوس ہوئی شام تک اس کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو اس نے شام کی چائے بنانے کے لیے کچن کا رخ کیا۔ لاؤنج میں ہی پھپھو کسی جاننے والے کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ اریبہ نے انہیں جلدی سے سلام کیا۔

''ارے اریبہ! آج تو تم خوب سوئیں ارے ایسی حالت سے ہم بھی گزرے ہیں مگر ایسا بھی کیا کہ کمرے میں بند ہو کر رہ جاؤ آئے گئے کا خیال کر لیا کرو۔ جاؤ اب جلدی سے چائے بنا کر کباب بھی تل لینا اور ہاں چائے کو ٹھیک سے دم دے لینا، جو شاندہ نہ بنا کر لے آنا اور نرگس کو آواز دو، میری بچی صبح سے کمرے میں بیمار پڑی ہے مگر کسی کو کیا فکر، ہونہہ۔'' یہ کہہ کر پھپھو اپنا پاندان کھول کر پڑوسن سے باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ اریبہ کا کسی دوسرے کے سامنے اس ہتک آمیز رویے پر دل بھر آیا۔ بہر حال وقت کا کام گزرنا ہے وہ کچھ دکھ اور سکھ کے سکے زندگی کے تھال میں ڈال کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ وہ دن اس کی زندگی کا خوب صورت ترین دن تھا۔ جب اللہ نے اسے ممتا کے عہدے پر فائز کر دیا۔ عدیل اور ابرش دو پھول اس کے دل کے ویران آنگن کو مہکانے اس کی زندگی میں شامل ہو گئے تھے اس موقع پر سکندر نے اسے گولڈ کا لاکٹ پہنایا تھا پھپھو بھی خلاف معمول بہت خوش تھیں۔ اب اریبہ کا زیادہ تر وقت گھریلو امور کے ساتھ بچوں کی پرورش اور تربیت میں گزرتا، اس نے بچوں کو کبھی بھی اپنی دادی اور پھپھو کے خلاف نہیں بھڑکایا تھا۔

☆......☆

آج کل گھر میں نرگس آپا کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ وسیم نامی کوئی شخص جس کی پہلی بیوی انتقال کر چکی تھی، اب اس کی نند سے دوسری شادی کا خواہاں تھا، اس پختہ عمر میں آپا کے لیے یہ رشتہ غنیمت تھا چھان بین اور ضروری کارروائی کے بعد ہاں کر دی گئی، لہٰذا آج کل آپا کا سلوک اس کے ساتھ کچھ بہتر تھا۔ اریبہ نے اس کی شادی کے تمام کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ شادی سادگی سے ہوئی مگر اریبہ نے جہیز کی تمام چیزیں اعلیٰ قسم کی اور آپا کی خواہش پر دی تھیں آپا کی رخصتی کے بعد اس کی زندگی کے شب و روز میں تھوڑا سکون اور آزادی میسر آئی تھی۔ زیادہ تر اس کی ساس اپنی بیٹی کے اکسانے پر اس کو روکتی ٹوکتی تھیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے رویے میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ اس کے کاموں پر اسے سراہتی تو نہیں تھیں مگر ان کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی اریبہ کی سلیقہ مندی اور خوبیوں کی دل سے معترف ہیں۔ سکندر بھی اس کا بہت خیال رکھتا تھا مگر اب اس کا دل ہر قسم کے جذبات و احساسات سے عاری ہو چکا تھا۔ اس نے پوری ہستی اپنی گھر گرہستی کو بنانے سنوارنے میں گزار دی تھی۔ آج اس کا بیٹا کامیاب انجینئر اور بیٹی کامرس میں نمایاں نمبروں سے کامیاب ہوئی تھی۔ اس کے بچوں نے ہمیشہ اس کا ساتھ دیا ان کی محبت ہی اس کے دل کے صحرا میں ٹھنڈی میٹھی پھوار بن کر گرتی تھی جو اسے مزید آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی تھی۔

☆......☆

آج اس کی بیٹی کی رسم منگنی تھی۔ وہ صبح سے گھن چکر

بنی ہوئی تھی۔ اپنی ساس اور شوہر کے کپڑے پریس کیے پھر اپنی ساس کے سر کا مساج کر رہی تھی۔ جس سے وہ تھوڑی دیر میں ہی غنودگی میں چلی گئی تھیں۔ اس کے بعد اس نے بیٹے کے کمرے کا رخ کیا۔ سارا بکھرا وا سمیٹا۔ اتنی دیر میں اس کا بیٹا شاور لے کر نکل چکا تھا۔

''اوہ! ماما آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ اب میں اپنے کمرے کی صفائی خود کر سکتا ہوں۔ پلیز آپ ہلکان مت ہوا کریں آپ نے پوری زندگی ہمارے لیے وقف کر دی مگر آپ کا بھی اپنی زندگی پر پورا حق ہے خود پر بھی توجہ دیا کریں۔''

''بالکل صحیح کہا عدیل نے۔'' سکندر کی آواز پر دونوں نے چونک کر دیکھا۔ وہ عدیل کو شام کے کھانے کے انتظامات کے بارے میں کچھ ہدایات دینے آئے تھے۔ پھر اس کی بات سن کر یہ تعریفی جملہ کہا۔

''عدیل! تمہاری ماں واقعی ایک مکمل وفا کی پیکر اور صبر وقناعت کے خمیر سے بنی ہے جس نے اپنی ذات کو مٹا کر ہم سب کی زندگی سنوار دی۔'' یہ جملے سکندر کے تھے اریبہ نے بے یقینی سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ زندگی کے 22 سال اس نے تپتے صحرا میں ننگے پیر سفر کرتے گزارہ تھے مگر آج اس کے ہم سفر کے یہ چند جملے اس بائیس سال کی کربناک اذیت اور مایوسی کے کہر میں لپٹے لمحات کا ازالہ تھا۔ شام میں پارلر سے اس کی بیٹی تیار ہو کر آئی اس نے بھی اپنی ماں کو لپٹا کر پیار کیا۔ آج اریبہ بہت خوش تھی، کافی عرصے بعد وہ دل سے تیار ہوئی تھی۔ سکندر کی فرمائش پر اس نے بلیک ساڑھی سلور بارڈر کے ساتھ زیب تن کی تمام مہمانوں کے آنے کے بعد منگنی کی رسم ادا کی گی اس کی ساس نے بھی آج خلاف توقع اسے سراہا۔

''میں واقعی خوش نصیب ہوں جس کو اریبہ جیسی سگھڑ، صابر اور مخلص بہو بیٹی کے روپ میں ملی۔ یہ میری سگی بھتیجی ہے پوری چاہت اور دل سے اس کو اپنے بیٹے کی دلہن بنا کر لائی تھی مگر اپنی بیٹی کے ورغلانے پر اور لوگوں کی باتوں میں آکر میں نے اس سے زیادتی کی۔ مجھے لوگوں کی الٹی سیدھی باتوں نے خوف وخدشات میں مبتلا کر دیا تھا کہ سکندر جو میرا بڑھاپے کا واحد سہارا ہے، اب اریبہ میرے بیٹے کو چھین لے گی۔ وہ پہلے کی طرح میرا اور اپنی بہن کا خیال نہیں رکھے گا۔ اسی خوف نے مجھے اپنی سگی بھتیجی سے دور کر دیا اور میں جانے انجانے میں اس معصوم کا دل دکھاتی رہی مگر آفرین ہے اس بچی پر کہ کبھی پلٹ کر اس نے جواب نہ دیا، چپ چاپ ہماری زیادتیوں کو سہتی رہی۔ اریبہ میری بچی! ہو سکے تو اپنی پھپھو کو معاف کر دینا۔'' یہ کہہ کر وہ اریبہ کو گلے لگا کر رونے لگیں۔ اریبہ تو ابھی تک خواب کی کیفیت میں تھی۔

''ارے نہیں پھپھو! یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ آپ میری بڑی ہیں ہاں آپ کے رویے سے دل ضرور دکھتا تھا مگر میرے دل میں کبھی بھی بدگمانی نہیں آئی۔ میں نے اس رشتے کی بنیاد پورے خلوص سے رکھی تھی اس گھر کی ایک ایک اینٹ میں میری محبت اور وفا کے موتی شامل ہیں۔ بس مجھ پر اعتبار کریں، میں کبھی بھی آپ کے ساتھ کسی زیادہ یا سکندر سے دور کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' آج اس کی آنکھیں نم تھیں بالآخر آج اس کی محبت اور وفا رنگ لے آئی تھی۔ زندگی کے گزرے ماہ وشب واپس تو نہیں آسکتے مگر اسے یقین تھا کہ آنے والا کل صرف اس کا ہے۔ اللہ پاک نے اس کی وفا کی لاج رکھی جس کا صلہ آج ساس کی تعریف اور شوہر کے اظہار محبت سے ملا جس نے اسے زندگی کے تپتے صحرا سے ایکدم چھاؤں میں کر دیا۔

......☆......

افسانہ

کرنی کا پھل

زندگی میں پہلی بار اتنا لمبا سفر کیا، لودھراں سے کراچی اور بالآخر کراچی پہنچ ہی گئے جہاں پر میری بہن حناء کا سسرال اور ماموں کا گھر ہے، 29 جولائی عید کا دن بہت پیارا دن تھا، جب ہم ٹرین میں سوار ہوئے۔ ابھی کراچی گئے مجھے کچھ ہی دن ہوئے کہ مجھے کراچی کے ہوسپٹل نے یاد کیا، اب ایسا تو ہونے سے رہا کہ میں کراچی جاؤں اور اسپتال کی شکل دیکھے بغیر ہی لوٹ آؤں، ناممکن۔ دراصل مجھے کراچی کا پانی راس ہی نہیں۔ بس اسی لئے جب بھی جاؤں بیمار ہو کر ہی واپس آتی ہوں۔

ایک دن اسپتال رہنے کے بعد ہم سب شام کو سندھ کے لئے روانہ ہوئے کیونکہ ہمارا ارادہ شہباز قلندر کے مزار پر جانے کا تھا۔ پھر تقریباً رات کے ایک بجے ہم سب شہباز قلندر کے مزار پر پہنچے۔ صبح کو دوبارہ شہباز قلندر کے مزار پر حاضری دی۔ کبھی کبھی ہماری زندگی میں ایسا ضرور ہوتا ہے جو ہمیں اندر تک بدل کر رکھ دیتا ہے، وہ دن بھی کچھ ایسا ہی تھا ہم لوگ دربار سے باہر آئے، امی ابو باتوں میں لگ گئے تھے تبھی میری نظر اپنے سے صرف دو قدم کے فاصلے پر پڑی جہاں پر ایک گندمی رنگت کے حامل مرد نے ایک کمزور سی بوڑھی عورت کو زمین پر بٹھاتے ہوئے اسے جو کچھ کہا وہ مجھے پتھر کر دینے کے لئے کافی تھا۔

"اے بوڑھی! آج رش زیادہ ہے کم از کم 5 سو ضرور کما کر لانا ورنہ روٹی نہیں ملے گی"۔ وہ گالیاں دیتا مڑ گیا اور میں نے اس بوڑھی سی عورت کو دیکھا جس کے چہرے پر ماہ و سال جھریوں کی شکل میں رقم تھے۔

"اماں یہ آدمی کون تھا آپ کو گالیاں کیوں دے رہا تھا؟"

میرے پوچھنے پر اس نے کچھ یوں اپنی داستان غم سنائی۔

"بیٹا یہ زندگی ایک فصل کی طرح ہے جس میں جو کچھ بوؤ گے وہی کاٹو گے۔ مجھے بھی میرے کیے کا صلہ مل رہا ہے، تمہیں سن کر شدید حیرت ہو گی کہ جو مجھے ابھی بٹھا کر گیا ہے وہ میرا بیٹا ہے، میرا اپنا خون جسے میں نے ایک ایک قدم چلنا سکھایا، وہ آج مجھے بھیک مانگنے کے لئے چھوڑ گیا ہے۔ میرا نام فوزیہ ہے میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی، میرے دو بھائی تھے، میں شکل و صورت میں اپنے باپ پر گئی تھی جو کہ بہت خوبصورت تھا، اماں بس قبول صورت تھی۔ ابا مزدوری کرتا تھا بھائی ایک دکان پر کام کرتے تھے ہم پانچ لوگ بہت اچھی اور خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ ابا اور بھائی میری ہر ضرورت کا خیال رکھتے، بے جا لاڈ پیار نے مجھے ڈھیٹ اور خودسر بنا دیا تھا۔ اماں کو شوگر جیسی بیماری تھی، وہ اکیلی سارا دن گھر کا کام کرتی رہتیں اور میں یا تو بیٹھی مزے سے ٹی وی دیکھتی رہتی یا پھر ہمسایوں میں اپنی دوستوں کے گھر چلی جاتی۔

مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب اماں صبح سے بیمار تھی، ان کی شوگر لو ہو رہی تھی اور انہوں نے نہایت پیار سے مجھے کہا تھا۔

"فوزیہ بیٹا! میری گڑیا آج سالن تو بنا دو میری طبیعت خراب ہو رہی ہے" اور میں تقریباً چیخ کر بولی تھی۔

"تو میں کیا کروں مجھے کچھ پتہ نہیں ہے تم خود کرو"۔ میں کہہ کر اپنے کمرے میں گھس گئی تھی یہ دیکھے بغیر کہ اماں کا

چہرہ لٹھے کی طرح صدمے سے سفید پڑ گیا تھا۔ پھر انہوں نے کیسے سالن بنایا میں نہیں جانتی، ہاں شام کو جب انہوں نے یہ ہی بات ابا کو بھی تو وہ مجھ سے بولے تھے۔

”دیکھو فوزیہ بیٹا!! اپنی ماں کا ہاتھ بٹایا کرو، ان کا کہا مانا کرو، اس میں کوئی بری بات نہیں ہے“۔ اور میں ہونہہ کہہ کر اٹھ گئی۔

بری صحبت نے مجھے بگاڑ دیا تھا میں رات رات بھر سب سے چوری اپنے فون پر لڑکوں سے باتیں کرتی رہتی تھی، کسی بھی چیز کی پرواہ کیے بغیر اور ایک دن اماں ہمسائی کے گھر گئی ہوئی تھیں اور میں فون پر ایک لڑکے سے باتوں میں مصروف تھی اور تبھی اماں نے مجھے دیکھ لیا، پوری زندگی میں انہوں نے مجھ پر پہلی بار ہاتھ اٹھایا تھا۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی اپنے گھر کی عزت روندتے ہوئے ہاں“۔ انہوں نے چیخ کر کہا تھا اور مجھے نجانے کیا ہوا کہ میں نے انہیں زور سے دھکا دیا تھا اور وہ کچھ فاصلے پر جا گری تھیں۔

”میں ہر بار ایسا کروں گی آپ نے جو کرنا ہے کر لیں اور ہاں آج مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے پھر ایسی غلطی مت کرنا۔ آپ تو ہیں ہی میری آزادی کی دشمن، یہ مت کرو، وہ مت کرو، آپ نے میری زندگی عذاب بنا رکھی ہے، یہ میری زندگی ہے میں چاہے جیسے رہوں آپ کون ہوتی



ہیں مجھ پر روک ٹوک کرنے والی''۔ مارے غم وغصے سے میں پاگل ہوگئی تھی، چیخ چیخ کر بولتے ہوئے میں اپنے کمرے میں گھس گئی اور شام تک پڑی رہی تھی۔

مغرب کے قریب ہی گھر میں شور اٹھا تھا۔ میں بھاگ کر کمرے سے باہر آئی اور میرے قدم وہیں پر ساکت ہوگئے۔ سامنے اسی جگہ پر جہاں پر میں نے اماں کو دھکا دیا تھا وہ لاش بنی پڑی تھیں۔

پورا گھر بکھر کر رہ گیا تھا۔ ابا اور بھائی بجھے بجھے سے رہنے لگے تھے۔ ابا نے اماں کے سوئم کے بعد مجھے بتایا کہ اماں کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور میں جانتی تھی کہ ان کی موت کی ذمہ دار صرف میں تھی، مجھ پر کسی نے ایف آئی آر نہیں کٹوائی تھی، کسی نے شک بھی نہیں کیا تھا مگر میں نہیں جانتی تھی کہ کسی کو پتہ ہو نہ ہو اس میرے خدا کو سب پتہ تھا۔

وقت کچھ اور گزرا، بھائیوں نے شادی کرلی، ابا اماں کے پاس چلے گئے۔ بھابیاں سارا دن بیڈ پر پڑی رہتیں اور میں سارا دن گھر کا کام کرنے میں گزار دیتی۔ اگر کبھی کوئی کام غلط ہو جاتا یا وقت پر نہیں ہوتا تھا تو دونوں بھابیاں مل کر میری اچھی خاصی درگت بنا دیتیں۔ اور ایک دن انہوں نے میری شادی اکرم سے کردی، جو کہ بڑی بھابی کا سب سے بڑا بھائی تھا وہ مجھ سے کئی سال بڑا تھا، میں روتی رہی چیختی رہی لیکن کسی نے میری ایک نہ سنی۔ اکرم نکما اور نکھٹو شخص تھا وہ سارا دن گھر پر پڑا رہتا تھا اور میں لوگوں کے گھر کام کر کے اسے بھی کھلاتی اور خود بھی کھاتی تھی۔

وقت کچھ اور گزرا میرا پہلا بیٹا علی ہوا، پھر دو بیٹیاں ہوئیں نادیہ اور شازیہ۔ اپنے بیٹے کو میں نے بڑے ارمانوں سے دولہا بنایا، اس کی شادی کی پھر بیٹیوں کی شادیاں کیں اور جب میں اپنے بیٹے پر بوجھ پر بن گئی تو اس نے مجھے گھر سے نکال دیا کہ وہ میرا خرچہ برداشت نہیں کرسکتا۔ میں وہاں سے نادیہ اور شازیہ کے گھر گئی، انہوں نے بھی مہنگائی کا رونا رونا شروع کر دیا، اور میں وہاں سے نکل کر اس دربار پر آ کر بیٹھ گئی۔ آس پاس کے لوگ مجھے فقیرنی سمجھ کر میرے پاس پیسے پھینکتے گئے، میں شدید سردی میں بغیر کسی گرم کپڑے کے صبح سے شام تک بیٹھی رہی اور تبھی پاس سے گزرتے علی کی مجھ پر نظر پڑی، وہ مجھے گھر لے گیا اور مجھ سے کہا۔

''اماں! تو تو جانتی ہے کہ مہنگائی کتنی ہے، تو یہاں پر رہ لیکن روز تجھے بھیک مانگ کر پیسے میری بیوی کو دینے پڑیں گے۔ اور اس کے بعد سے وہ روز صبح کو مجھے یہاں پر بٹھا کر جاتا ہے اور شام کو مجھ سے سارے پیسے لے لیتا ہے۔ اماں کے مرنے پر میں نے سوچا تھا کہ شکر ہے مجھ پر کسی نے ایف آئی آر نہیں کٹوائی، مقدمہ نہیں چلا لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ اوپر اللہ کے پاس FIR بھی کٹ چکی تھی اور مقدمہ بھی چل رہا تھا، بس سزا دینا باقی تھی جو کہ مجھے آج مل رہی ہے اور اس وقت تک ملتی رہے گی جب تک اوپر والا مجھے معاف نہ کردے۔ زندگی کا نظام بھی ایک اسکول کے نظام کی طرح ہے جس طرح اسکول میں ہم پورا سال پڑھتے ہیں پھر ایک دن ایک پیپر میں ہم وہ سب کچھ لکھ کر دے دیتے ہیں جو کچھ پورا سال ہم پڑھتے ہیں پھر اس کا فیصلہ ہوتا ہے پاس یا پھر فیل؟ اگر ہم پورا سال محنت کرتے ہیں تو پاس ہو کر اگلی کلاس میں چلے جاتے ہیں اور اگر ہم پورا سال کھیلنے میں اور بیکار میں گزارتے ہیں تو فیل ہو کر دوبارہ اسی کلاس میں واپس چلے جاتے ہیں تاکہ دوبارہ محنت کریں۔ اسی طرح زندگی ہے، جس میں ہم جو کچھ کرتے ہیں ایک دن اس کا حساب لیا جائے گا اور پھر اللہ ہمیں پاس کی صورت جنت میں اور فیل کی صورت میں دوزخ میں ڈال دے گا۔ مگر آج کے انسان کو اپنے صرف ایک سال کی اور پیپر کی فکر ہے مگر اصل امتحان کی نہیں حالانکہ پیپروں میں فیل ہونے کی صورت میں ایک اور موقع ملتا ہے مگر اصل زندگی میں صرف ایک بار موقع ملتا ہے''۔

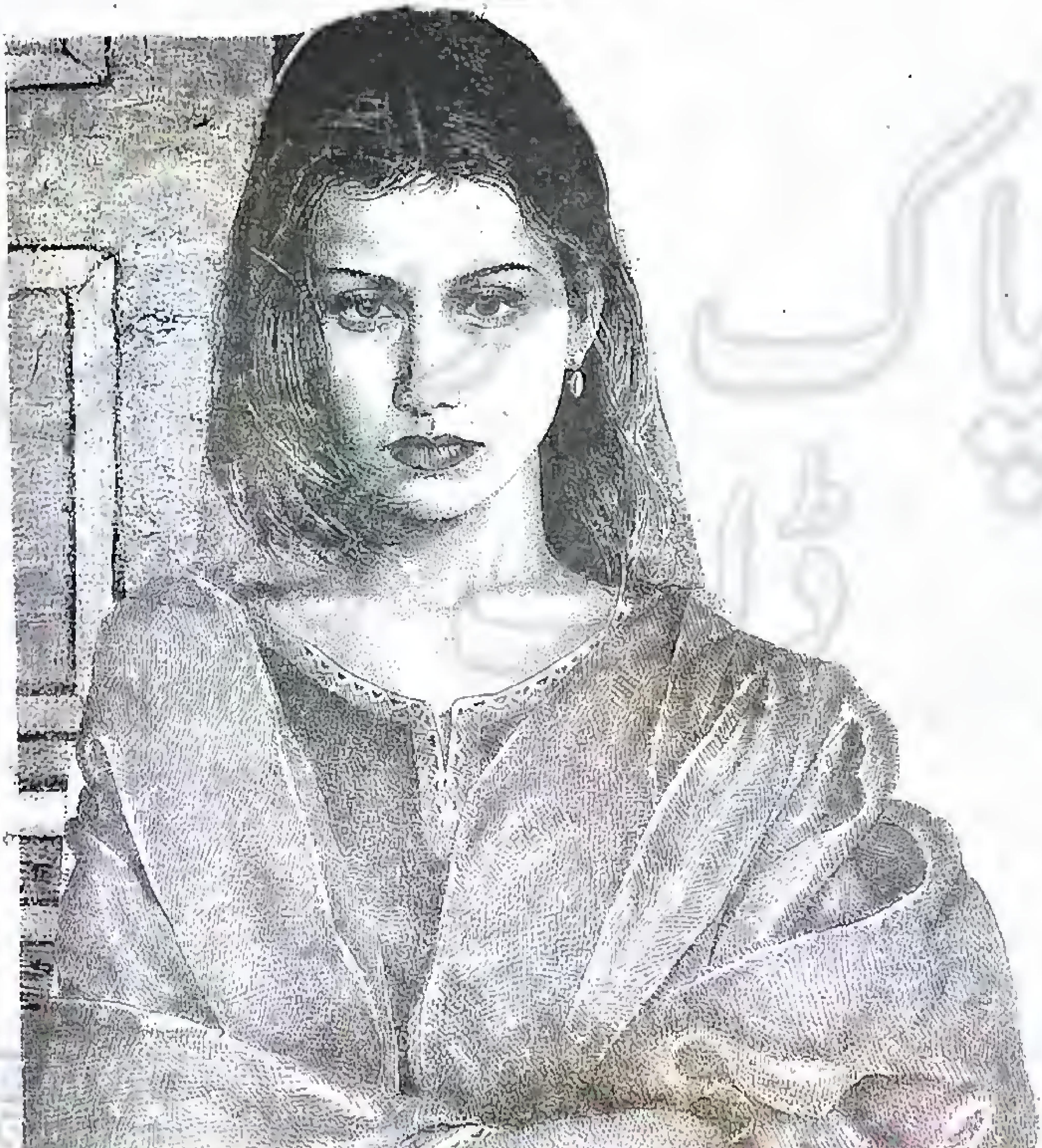
باقی کا راستہ میں خود سے صرف ایک سوال کرتی رہی اور وہ سوال آپ سب سے کرتی ہوں۔ کہیں ہم میں سے کوئی فوزیہ تو نہیں ہے؟ اگر ہے تو آئیں ہم سب اس کے خلاف احتجاج کریں، اس مدرز ڈے پر فوزیہ کو ختم کر کے اپنی ماؤں سے معافی مانگیں، انہیں اپنے ہونے کا احساس دلائیں۔

☆..........☆..........☆

کوثر ناز

افسانہ

ڈھیٹ



شکن آلود بیڈ شیٹ، تکیے کا آدھا اترا ہوا غلاف، کمرے میں مختلف اشیاء کا پھیلاوا، بیڈ پر الٹی ماریہ کا آدھی ٹانگوں سے بھی اوپر جاتا ٹراؤزر، بکھرے بالوں کے ساتھ نگاہیں ملٹی میڈیا فون پر جمائے وہ اذان ونماز کے اوقات کے گزر جانے کے خیال سے قطعی ناآشنا دنیا و مافیہا سے بے خبر کھوئی الگ ہی دنیا میں تھی۔ لگتا تھا کہ دنیا اگر اپنی جگہ سے ایک آدھ انچ بھی سرک جائے تو اسے قطعی کوئی فرق نہیں پڑنا۔

''ماریہ!'' ماں کی چنگھاڑتی ہوئی آواز نے ماریہ عرف میری کو حال میں لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چونک کر ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی ماں کو دیکھ کر ایک انگڑائی لی اور پھر بیٹھ گئی۔

''کیا ہے اماں۔'' چہرے پر جھنجھلاہٹ سجائے وہ ماں سے مخاطب تھی اور اماں کا ترش لہجہ اسے مزید بیزار کر گیا۔

''کیا پڑا رہ جائے گا تیرا اس موئے کے بغیر، فجر کی نماز کا وقت بھی نکل گیا اور تم اپنے حواس میں غرق نہ جانے کون سی دنیا میں کھوئی رہتی ہو۔ میری ہزار باتوں میں سے بھی ایک بات پر بھی دھیان دیا ہے تم نے، میری تو زندگی اجیرن کر دی صبح سے ہی چیخنے کا موقع دے دیتی ہو۔''

ماریہ کا غصہ بھی عروج پر جا پہنچا ضبط کرتے کرتے بھی کئی بار دکھاوے کے لیے گہرے سانس لیے۔ پر وہ بھی اس کی اماں تھیں سنائے گئیں، بولے گئیں اور آخر میں ماریہ کو یونہی بستر میں گھسے دیکھا تو ایک لفظ کہہ کر ماریہ کا خون جلا گئیں۔

''ڈھیٹ۔''

☆......☆

''میری تو سمجھ نہیں آتا کہ اس لڑکی کا کیا کروں 24 گھنٹے فون پر لگی رہتی ہے نہ کھانے کا خیال کرتی ہے نہ گھرداری کا جب ڈانٹو تو تھوڑا بہت کام کر کے پھر موبائل میں جا لگتی ہے چلو گھرداری تو چھوڑو اپنے کپڑے تک دھونے کی فرصت نہیں ملتی اسے۔'' اماں آج صبح ناشتے کی میز پر ماریہ کی شان میں قصیدہ گوئی کر رہی تھیں۔ ماریہ آتے آتے رک گئی اور وہ اف اف کرنے لگی اماں کے بولنے پر کیونکہ اسے خود اپنا آپ بھی غلط لگا ہی نہ تھا۔ وہ اسکول کالج میں اچھی کارکردگی دکھاتی تھی۔ دوستوں میں اچھا نام رکھتی تھی اس کے علاوہ اس کے مطابق وہ ہر کام کرنے کے بعد اپنا فون لے کر بیٹھتی تھی پھر بھی اماں کے لاکھوں کوسنے، شکوے ہزار......! وہ اکتا گئی، بےزار ہو گئی اماں سے دور دور رہتی پھر بھی اماں اسے کہیں نہ کہیں پکڑ ہی لیتیں کہ ماں بچوں کے بنا بھلا کہاں رہ سکتی ہے۔

شیخ صاحب خاموشی سے سنتے جاتے اور ناشتہ کرتے رہتے۔ اپنی باتوں کی شوقین بیوی کے آگے وہ کبھی نہ بولے تھے۔ یوں بھی بولتے تو بات چیت میں ہار ہی جاتے کہ پہلے تو عورت سے جتنا مشکل اوپر سے بیوی سے تو مکمل طور پر ہی ناممکن سوا نہیں بہتری اسی میں نظر آتی خاموشی سے مفاہمت کو وہ ترجیح دیتے۔ گھر کو پرسکون رکھنا بھی ضروری تھا مگر وہ سنے جاتے غور کیے جاتے مگر نہ بولنے کی شاید قسم کھا رکھی تھی۔

''آپ کو پتا ہے کہ گھر تو گھر اپنے کمرے پر بھی دھیان نہیں دیتی، لوگ کیا کہتے ہیں، آپ کو تو فرق نہیں پڑتا شادی کی فکریں تو ماؤں کو ہی کھاتی ہیں۔ بٹی، ماں کا پرتو گردانی جاتی ہیں مگر یہ ماریہ تو مجھ سے مکمل طور پر مختلف ہے اس قدر ڈھیٹ ہے کہ جواب بھی نہیں دیتی، سامنے سے کہوں تو بھی اپنے کاموں میں لگی رہتی ہے کہ گھر دیکھنے کی فرصت ہے نہ گھر آئے مہمان کی سمت توجہ دینے کی سننا تو مجھے پڑتا ہے سب کہتے ہیں تمہاری بٹی ہے گئی کس پر ہے عادتیں کس پر پڑی ہیں اس کی کسی کے ساتھ بولتی ہے نہ محفلوں میں کہیں جاتی ہے اور میں، میں بس خاموش ہو جاتی ہوں کہ کیا کہہ سکتی کسی کو کچھ نہ جانے کس ڈھیٹ کا سایہ پڑا ہے اس پر۔'' وہ دل کا سارا غبار

نکال رہی تھیں ماریہ جو ناشتے کی غرض سے آئی تھی واپس چلی گئی اس دماغ خرابی سے تو بہتر تھا کہ سکون کے دو سانس وہ کمرے میں لے لیتی تھی۔ اماں کا دماغ بھی خراب تھا جو فضول بولتی رہتی تھیں۔ کبھی تو بندہ چپ ہوتا ہے انہیں تو مسلسل ڈانٹنے کی عادت تھی۔ ہر بات کو کھینچ کر اتنا لمبا کر دیتیں کہ ماریہ اپنے آپ بے زار ہو جاتی اور نسل نو کی عادات سے کون واقف نہیں، جلدی اکتا جانے والی، اپنے مطلب کے کام کرنے والی اپنی عقل کو عقل کل سمجھنے والی اسے یوں ڈانٹوں اور گھرکیوں سے سخت چڑ تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ اگر بات آرام سے کہی جائے تو وہ شاید سمجھ جائے مگر مجال ہے کہ وہ جب بھی کام کرنے جاتی، کچھ غلطی ہو جاتی تو اماں پرانے سارے حساب کتاب بے باق کر دیتیں چھوٹی سی غلطی پر اس کی ہستی بکھیر دیتیں۔ ذات کی بخیا ادھیڑ دیتیں جو ماریہ کو اور متنفر کر دیتا وہ مزید خود میں سمٹ جاتی۔

☆......☆

"تم نے اپنا کنگھا دیکھا ہے کچھ شرم کرو دھو لیا کرو اسے بھی۔"

"تمہارے اتنے کپڑے بنا دھلے پڑے ہیں موبائل سے فرصت ملے تو جا کر دھو لینا تمہارے باپ نے نوکر نہیں لگائے ہیں۔"

"آ کر کھانا کھا لو، اس موبائل نے تمہاری مغفرت کی دعائیں نہیں کرنی۔"

"کمرا ٹھیک کر لو اگلے گھر جا کر میرا منہ کالا کرواؤ گی۔"

"یہ کیسے کپڑے پہنے ہیں استری کرنے کا وقت نہیں ہے کیا یہ وقت کس لیے بچاتی ہو۔"

"اللہ کیسی عذاب سی اولاد دی ہے نہ دیتا تو بہتر تھا۔"

"جینا دوبھر کر دیا ہے تمہیں تو جلد سے جلد رخصت کروں گی۔"

یہ جملے اور اس طرح کے ہزار جملے آئے روز وہ سنتی ذرا سی غلطی پر بھی اور نہ ہوتی تو بھی کیونکہ اماں کو اس پر تیر برسانے کے لیے کسی موقع کی ضرورت نہ ہوتی۔ اکثر سبھی کے سامنے اس کی عزت افزائی کر دیتیں۔ اماں کو بولنے کی عادت ہو گئی تھی وہ جب تک چیخ نہ لیتیں ان کا کھانا ہضم نہ ہوتا تھا ایسا ماریہ کا ماننا تھا سو اسے ان کی باتوں سے دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ ان پر دھیان کم ہی دیا کرتی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں ڈھیٹ ہو گئی تھی۔ پہلے پہل اسے بہت تکلیف ہوتی تھی اماں بولتے ہوئے کچھ بھی نہ سوچتی تھیں۔ غصے میں کچھ بھی بول دیا کرتیں سو ماریہ کو اب عادت ہو گئی تھی اسے اماں کی باتوں کے بجائے اسے فون دلچسپ لگتا نہیں۔

☆......☆

"ہائے اللہ اتنی مہنگی سبزی جلا دی تم نے، توبہ توبہ میرا جینا حرام کر دیا ہے کس مٹی کی بنی ہو اتنی ڈھیٹ کیوں ہو ایک بار بیٹھ کر کام کرنا حرام ہے کیا تم پر، دفع ہو جاؤ اب یہاں سے۔"

"مائیں کیا اچھی لگتی ہیں یوں بیٹیوں پر چلاتی، غلطیاں انسانوں سے ہوتی ہیں۔"

اور اتنی ڈانٹ ڈپٹ تو اچھے خاصے انسان کو بگاڑ دیتی ہے۔ بیٹیاں تو نازک ہوتی ہیں وہ تو سلیقے سے سمجھانے والی ہوتی ہیں۔ مائیں سلیقے سے سمجھائیں تو بیٹیاں کیسے غلط راہ پر جا سکتی ہیں وہ اگر ماں کا پرتو نہیں تھی تو کس پر چلی گئی تھی۔ ماں نے تو تربیت کی مگر کس انداز میں ہوئی تھی ماریہ کا دل یک دم بھر آیا تھا ماں کی ڈانٹ پر اب تو وہ بھی خواہش کرتی کہ اللہ کرے جلدی سے شادی ہو اور وہ اس گھر سے نجات پائے اماں کی چیخ چیخ تو ختم ہو گی ماریہ کمرے میں جانے کو مڑی تو اماں نے پھر بولنا شروع کر دیا۔

"بدنام کرواؤ گی اگلے گھر جا کر مر کیوں نہیں جاتی۔"

اول فول کہتی اماں ماریہ کو سخت بیزار اور متنفر کر گئیں۔

سفید پوش یا کم حیثیت گھرانوں میں چیخ چیخ عام ہوتی ہے۔ ماریہ کا ماننا تھا کہ اسے کسی رئیس کے گھر پیدا ہونا چاہیے تھا جہاں روز ہر بات پر بحث نہ کرنی

پڑے۔ یہاں تو دال بھی منگوانی ہے تو پہلے مہنگائی کا رونا رویا جاتا تھا پھر بیٹی کی سستی کام چوری جیسی خوبیوں کا گردان کیا جاتا تھا پھر دال کے پیسے نکال کر تھمائے جاتے اور جب بن جاتی تو سالن میں کیڑے نکالے جاتے پھر کوسنے ملتے جب روٹی کھالی جاتی تو برتن نہ اٹھانے پر ڈانٹا جاتا، وہ سخت پریشان، سخت بیزار اور سخت ڈھیٹ۔

☆......☆

''آپ مجھے سلیقہ سکھا رہے ہیں میں آپ کو بتا دوں مجھے ایسا اس ہی نے کہا ہے۔ مجھے پتا ہے کیا کرنا ہے آپ تو مجھے بتائیں ہی مت پوری زندگی چپ کا روزہ رکھے رکھا، آپ کو بھی کچھ سکھانا چاہیے گھر کے کاموں سے فرصت نہ ملتی تھی مجھے تو آپ کی اماں حضور اس قدر ظالم تھیں خیر اللہ جنت نصیب کرے، ویسے تھیں بہت کڑوی زندگی بھر سکون کا سانس نہ لینے دیا اور اب یہ ماریہ بھی تمہاری اماں پر جا پڑی ہے۔'' اماں بولتے بولتے سوچتی بھی نہ تھیں کہ کیا بول رہی تھیں۔

''بس کرو سفینہ۔ تمام عمر تم نے میری اماں کو ایسے ہی کوسا ہے اب جب وہ دنیا میں نہیں تو تمہیں اپنی زبان کو لگام دینے کی ضرورت ہے ان کے بارے میں کچھ نہیں سنوں گا میں، جاؤ جا کر ماریہ کو بلا کر لاؤ۔''

''ہاں ہاں مجھے ہی بولو اس لاڈلی کو کچھ نہ سمجھانا تمہاری ماں پر گئی ہے جبھی تو سب برداشت کرتے ہو، سہنا سننا تو مجھے پڑے گا ناں۔'' وہ چیختی شیخ صاحب کے پیچھے ہی ماریہ کے کمرے کی سمت چل دیں جو انہیں نہ اٹھتے دیکھ کر فوراً اٹھ گئے تھے۔ پھر جلد ہی انہوں نے مناسب رشتہ دیکھ کر ماریہ کی شادی کر دی اور ماریہ بھی اپنے نئے رشتوں میں مصروف ہو کر ماں کی ڈانٹ کو بھول کر اپنی گرہستی میں لگ گئی۔

☆......☆

ماریہ کی شادی کو کچھ عرصہ ہی ہوا تھا کہ سفینہ کی اماں ان کے گھر رہنے آگئیں اور سفینہ ماں کی تیمارداری میں جت گئیں کہ کہیں نہ کہیں قلق اسے بھی تھا۔

''ارے سفینہ بیٹا پانی تو پلا دو۔'' وہ کبھی اٹھ جاتیں کبھی نظر انداز کر دیتیں۔

''ارے ذرا مجھے باتھ روم تک تو چھوڑ دو سفینہ بیٹا۔''

''میرے سالن میں نمک زیادہ ہے ذرا چٹنی تو کر دو۔''

''ارے سفینہ بیٹا کنگھا ہی کر دو میرے بالوں میں۔''

''اماں آپ کو کسی پل چین نہیں ہے کبھی تو سکون لینے دیا کریں۔''

''ارے موئی زبان چلاتی ہے ماں سے بھول گئی کیسے مشکل سے پالا تھا تجھے۔''

''اماں بس کر دیں ہر وقت کا ایک ہی رونا ہے آپ کا کبھی تو مختلف بات کر لیا کریں آئے روز وہی داستانیں۔'' بے زاری عروج پر تھی اماں کا دل سخت دکھا مگر بولنے کی عادت تھی چپ نہ ہوتیں۔

''ہاں اولاد جوان ہو، اپنے گھروں کی ہو جائے تو بڑوں کی باتیں بے وقعت لگنے لگتی ہیں، سمجھتے ہی نہیں بڑے کیا کہہ رہے ہیں کبھی تم بھی میری جگہ ہو گی تو پتا چلے گا تمہیں۔'' اماں بولتی رہیں وہ اٹھ کر چلی گئیں کچن میں سبزی چڑھانے اماں باآواز بلند بولتی رہیں۔

''ڈھیٹ!'' کمرے سے نکلتے شیخ صاحب نے کچن کے بیسن پر کھڑی سفینہ بیگم کو دیکھا اور سفینہ بیگم نے سامنے نظر آتے آئینے میں خود کو۔

''بیٹیاں تو ماں کا پرتو ہوتی ہیں۔'' کب یہ لڑائی ختم ہوئی جو سفینہ نے ماریہ کو خود سے مختلف سمجھا تھا۔ شیخ صاحب نے ماریہ کو دل ہی دل یاد کرتے دروازہ عبور کیا اور سفینہ نے باہر جا کر خود کو آئینے میں بغور دیکھا اور آج انہیں سارے جواب ان کی اپنی ذات دے رہی تھی۔ سارا خسارہ اب محسوس ہو رہا تھا مگر وہ کہتے ہیں ناں کہ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

☆......

افسانہ

سچائی کی روشنی

''نازی، فاری جلدی کرو۔ نیچے سب بارات کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ تم دونوں کی تیاری نہ جانے کب ختم ہوگی۔'' اینہ بیگم بڑی عجلت میں ان کے کمرے میں آئیں تھیں مگر ان کو تیار نہ دیکھ کر جھنجھلا



گئیں۔

''بس امی! یہ بجو کے سپوتوں کی تیاریوں میں ہی دیر لگ گئی۔ ورنہ آپ جانتی ہیں کہ میں تو جلدی تیار ہوتی ہوں۔'' فادی نے بڑے آرام سے سارا الزام نازی کے بچوں کو دے دیا۔

''ہاں، ہاں سارا مسئلہ ہی ان معصوم بچوں کا ہے۔''

''اچھا بس۔ باتیں ختم کرو اور جلدی سے نیچے آؤ ورنہ تم دونوں کے بغیر ہی بارات چل پڑے گی۔'' امینہ ان دونوں کو بحث کے لیے تیار دیکھ کر ٹوکتی ہوئی واپس چلی گئیں۔ اور وہ دونوں بھی ان کی دھمکی سے ڈرتی تیاری مکمل کرنے لگیں کہ آخر ان کے بھائی کی شادی تھی اور اگر بارات ان کے بغیر چلی گئی تو۔

☆......☆

نازیہ جسے سب پیار سے نازی بلاتے تھے۔ ارشاد صاحب کی پہلی لاڈلی اولاد تھی۔ جس کی شادی ابھی چند سال پہلے ہی ہوئی تھی۔ اس کے دو بچے گھر بھر کی رونق تھے۔ اس کے بعد حارث کا نمبر تھا۔ وہ ایک قابل آئی اسپیشلسٹ تھا۔ پھر فارینہ تھی اور اس کے بعد ارشاد صاحب کے جڑواں بیٹے تھے حماد اور



حمزہ۔ یہ تینوں ابھی پڑھائی مکمل کر رہے تھے۔ حارث کی شادی نازیہ نے اپنی کیلی کی بہن کے ساتھ کروائی تھی۔ معصوم سی رامین آج دلہن بن کر سب کی دعاؤں کے سائے میں رخصت ہو کر ان کے ہاں آ گئی تھی۔

☆.....☆

شادی کے ہنگامے کچھ سرد ہوئے تو دعوتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ ہر جگہ رامین اور حارث کی جوڑی کی خوب پذیرائی ہوئی۔ گھر میں بھی رامین کے آنے سے رونق ہو گئی تھی۔ وہ دن کو امینہ کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی شام میں نازی کی لمبی لمبی کالج کی کہانیاں سنتی۔ دن اس مصروفیت سے گزر رہے تھے کہ اللہ نے ان کے دامن میں اپنی رحمت ڈال دی رامین اور حارث کو اللہ نے ایک خوب صورت بیٹی کا تحفہ دیا تھا۔ بچی نے ماں اور باپ دونوں کا عکس چرایا تھا اس لیے بے حد خوب صورت بھی تھی اور اس کا نام ''کشف'' اسے مزید خوب صورت بناتا تھا۔ گھر والوں کی تو اس میں جان تھی۔ کبھی وہ دادا کی گود میں ہوتی تو کبھی حارث اسے اٹھائے پھرتا۔ حماد اور حمزہ کو بھی گھر میں مصروفیت مل گئی تھی۔ رامین خوش تھی کہ اس کی بیٹی کو اتنا پیار مل رہا تھا۔ مگر کبھی کبھی وہ غصہ بھی کرنے لگتی تھی کہ وہ کشف کے ساتھ اس وجہ سے زیادہ وقت نہیں گزار سکتی تھی۔ مگر یہ غصہ کچھ ہی دیر کا ہوتا تھا۔ جب وہ سب کو اس کے لاڈ اٹھاتے پیار کرتے دیکھتی تو اس کا دل مطمئن ہو جاتا کہ اس کی بیٹی کی پرورش اتنی توجہ اور محبت سے ہو رہی تھی۔

☆.....☆

اب کشف چار سال کی ہو گئی تھی اور اس کا اب اسکول میں داخلہ کروانا تھا۔ شہر کا ہر اچھا اسکول نظر میں رکھا گیا تھا اور خوب سوچ و بچار کے بعد ایک اچھے اسکول کا انتخاب کر لیا گیا تھا۔

''السلام علیکم!'' حارث نے اندر آتے ہی سب کو مشترکہ سلام کیا تھا۔ سب لوگ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ساتھ میں کشف اور سمیرا کی شرارتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ حارث بھی وہیں بیٹھ گیا اور کشف اور سمیرا کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا۔

''بیٹا! تم کشف کے داخلہ فارم لے آئے؟'' امینہ بیگم نے استفسار کیا۔

''جی امی! یہ صبح ہی لے لیے تھے بلکہ فل بھی کر دیا ہے۔ بس اس کی تین تصاویر چاہئیں۔ رامین تمہارے دستخط بھی چاہئیں وہ کر دینا۔ میں پھر جمع کروا دوں گا۔'' ماں کو بتاتے ہوئے اس نے بیوی کو مخاطب کیا۔ جب کہ داخلہ فارم پڑھتے ارشاد صاحب خاصے حیران ہو رہے تھے۔

''حارث! اس میں کشف کی عمر غلط ہے۔ یہ تو ماشاء اللہ سے چار سال سے اوپر کی ہے جب کہ یہاں تم نے اسے تین سال کا لکھا ہے۔'' ان کو یہ بات عجیب لگ رہی تھی۔ بھلا حارث کیسے کشف کی تاریخ پیدائش بھول سکتا ہے۔

''جی ابو! میں نے خود ہی یہ لکھی ہے۔ آپ کو یاد ہے کالج میں داخلے کے وقت میری عمر کے حوالے سے کچھ مسئلہ ہو گیا تھا، اس لیے میں نے ابھی سے اس کا یہ کام آسان کر دیا ہے۔ آگے کسی داخلے وغیرہ کے لیے اس کو پریشانی نہ ہو اور آج کل تو ویسے بھی پہلی کلاس سے پہلے اتنا کچھ ہوتا ہے بلاوجہ ہی سال ضائع ہوتے ہیں اس لیے عمر کم لکھوانا بہتر ہے اور آگے جاب کے لیے بھی آسانی ہی آسانی اور سرکاری نوکری ہو تو ریٹائرمنٹ بھی دیر سے۔'' اپنی جون میں بولتا وہ ارشاد صاحب کی حالت سے بے خبر تھا۔ جب کہ باقی سب تو اس کی اتنی لمبی پلاننگ کا سن کر ہی دھنگ تھے۔ ابھی تو کشف اسکول نہیں گئی اور حارث ابھی سے اس کی جاب اور ریٹائرمنٹ کا سوچے بیٹھا تھا۔

''شاباش میرے بیٹے شاباش! بہت خوب سوچا ہے تم نے۔'' طنزیہ لہجے میں کہتے وہ حارث کو بری طرح ملامت کرنے لگے۔

''یہ تربیت کرنے لگے ہو اپنی بیٹی کی؟ یہ تعلیم دو گے اسے پہلا قدم ہی اس کا جھوٹ پر رکھو گے، کتنے شرم کی

بات ہے میری اولاد ہو کر تم نے یہ سب سوچا۔"
"پر ابو! اس میں غلط ہی کیا ہے؟" حارث کو ان کے اتنے تیخ پا ہونے کی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔
"ویسے بھی آج کل تو سب یوں ہی کرتے ......"
"بس خاموش رہو تم۔" غصے سے گرجتے وہ اس کی بات کاٹ گئے۔
"اور لوگ اگر کنویں میں چھلانگ لگائیں تو تم بھی لگا دو گے، کیا تم نے کبھی رشوت لی ہے؟ کیا کبھی اسپتال میں دوائیوں کا ادل بدل کیا؟ کیا امیری غریبی کے ترازو میں اپنے مریض تولے؟ کیا کبھی کسی کو کوئی غلط دوا دی۔"
"نہیں ابو! کبھی بھی نہیں۔" حارث تو یہ باتیں سن کر ہی تڑپ گیا تھا کجا کہ وہ یہ سب کرتا۔
"کیوں، کیوں نہیں کیا؟" اب کہ ان کا لہجہ کچھ نرم تھا۔ وہ حارث کی تڑپ دیکھ چکے تھے۔ جانتے تھے کہ وہ کتنا مخلص ڈاکٹر ہے۔
"کیونکہ ابو یہ سب غلط ہے، میں ایک سچا، دیانت دار ڈاکٹر ہوں اور یہ سب میرے پیشے سے خیانت کے مترادف ہے۔" حارث کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کس طرح اپنے پیشے سے اپنی وابستگی ان کو بتائے۔
"تو بیٹا! صرف یہی سب ہی تو خیانت نہیں کہ تم ڈیوٹی چھوڑ دو، کسی مریض کے ساتھ تعاون نہ کرو، غلط دوا دے دی۔ دیکھو بچے، جھوٹ بول کر کوئی کام کوئی فائدہ حاصل کرنا بھی گناہ ہے اور اس کام کے نتیجے میں بہ ظاہر جو کچھ بھی حاصل ہوگا نا وہ حقیقت میں اچھا نہ ہوگا۔" ارشاد صاحب کی باتیں حارث اور وہاں بیٹھے ہر ایک کے دل میں اتر رہی تھیں۔
"دیکھنے میں یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے مگر تم ذرا گہرائی میں سوچو، ایک جھوٹ بول کر جب یہ داخل ہوگئی تو کیا یہ تعلیم اس کے لیے فائدے مند ہوگی؟" انہوں نے کچھ لمحے رک کر حارث کا جھکا سر دیکھا اور پھر کہنے لگے۔
"بیٹا! جب عمارت بنتی ہے نا تو اس کی بنیاد کو مضبوط بنایا جاتا ہے۔ بنیاد کی مضبوطی ہی عمارت کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے، بنیاد اچھی ہوگی تو عمارت بھی اچھی ہوگی اور تم کشف کے کردار کی عمارت کی بنیاد سچائی کی مضبوطی کی بجائے جھوٹ کے ناسور پر رکھ کر اس کو کھوکھلا کرنا چاہتے ہو؟ ابھی سے اس کو سچائی اور دیانت کا سبق دو گے تو یہ آگے چل کر ایک کامیاب انسان بنے گی۔ بھلا اس تعلیم کا کیا فائدہ ہوگا جو غلط بیانی سے حاصل کی جائے۔ پھر تو تعلیم کا حصول ثواب کی بجائے گناہ میں شمار ہوگا نا اور یہ جو تم نے نوکری کی بات کی تو کیا وہ رزق حلال ہوگا۔ غلط عمر کی بنیاد پر جو نوکری اور اس کی کمائی ہوگی نا وہ چاہے کتنی ہی محنت و لگن سے کمائی جائے، رہے گی حرام ہی۔ اس لیے کہ اس کے پیچھے ایک جھوٹ ہوگا۔ اب رہ گئی یہ ریٹائرمنٹ والی بات تو اصل عمر کے بعد جو نوکری ہوگی وہ بھی غلط ہوگی اور کسی دوسرے کا حق بھی مارا جائے گا تم سمجھ رہے ہو نا میری باتیں؟" ارشاد صاحب کی باتوں نے حقیقت میں حارث کو شرمسار کیا تھا۔ وہ اپنی غلط سوچ پر بہت نادم تھا۔ یہ سب تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ جب بنیاد کھوٹی ہوگی تو عمارت خالص کیسے ہوگی۔ ابھی اگر ارشاد صاحب یہ باتیں نہ کرتے تو وہ انجانے میں ہی اپنی اور کشف کی دنیا و آخرت دونوں خراب کر لیتا۔
"جی ابو! آپ نے ٹھیک کہا ہے۔ میں نے تو اس انداز سے سوچا ہی نہیں تھا جس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں، میں صبح نیا فارم لے آؤں گا اور اس میں سب صحیح لکھوں گا۔" ندامت سے اس کا سر نہیں اٹھ رہا تھا کہ وہ ان کی جانب دیکھ سکے۔
"اچھی بات ہے مگر جب اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور اسے سدھارنے کی بھی ٹھان لی جائے تو شرمندہ نہیں ہوا کرتے۔" پیار سے کہتے ہوئے انہوں نے حارث کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا اور لاؤنج میں موجود سبھی مسکرا اٹھے تھے۔

......☆......

مصباح مسکان روف

مکمل ناول

ایک پیالی پیار

'مجھے دل سے نہ بھلانا
چاہے روکے یہ زمانہ'



ہوئے روٹیاں پکاتے ہوئے مسلسل گا نا گا رہی تھی، یہ اس کی پرانی عادت تھی وہ کام کے دوران کچھ نہ کچھ ضرور گنگناتی ہی رہتی۔ اس نے آخری الفاظ کو دہرایا۔

''نہیں''۔ اچانک اس کے سُر کے ساتھ باہر سے کسی نے اونچی آواز میں ''نہیں'' کو خاصا لمبا کھینچا تو وہ چونکی۔

''کیا مسئلہ ہے ذینی، کیوں چلا رہی ہو؟'' اندر کمرے سے شبینہ آپی نے خفگی سے پوچھا تو وہ تیزی سے باہر نکلی، کرسی پر بیٹھے وجود کو دیکھ کر اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''آپی! میں نہیں... یہ تو یہ اومڑ ہے جہان، میں تو آرام سے گانا گا رہی تھی''۔ ذینیہ نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے شبینہ آپی کو وضاحت دی۔ شبینہ آپی جو کل شام ہی میکے آئی تھیں یہاں آ کے آرام کرنا چاہتی تھیں، ابھی بھی وہ بمشکل بیٹے کو سلانے کے بعد آنکھیں بند کر کے لیٹی تھیں کہ باہر کی آواز نے انہیں ڈسٹرب کر



دیا۔

کچن کی کھڑکی جو لان میں کھلتی تھی، اس کے عین آگے لو مڑ (جہان) کرسی پر بیٹھا دھوپ لگوا رہا تھا، ساتھ ساتھ اپنے پیپر کی تیاری کر رہا تھا۔

''کیا ہے تمہیں؟'' آپی کو اپنی صفائی پیش کرنے کے بعد وہ اب اس کے سر پر کھڑی تھی۔

''تم اتنی دیر سے نہیں، تمہیں کی سُر لگا رہی تھیں تو اسی لئے میں بھی تمہارے سُر سے سُر ملا رہا تھا مگر برداشت نہیں ہوا تم''۔

''برداشت تو تم سے نہیں ہوا میرا گنگنانا، جل کے فوراً میری سریلی خوبصورت آواز کے ساتھ اپنی پھٹے ڈھول والی سُر ملالی''۔ جہان کی بات نے تو ذینی کو تپا ہی دیا تھا۔

''میں تو نہیں جلا... مگر... غالباً بلکہ یقیناً آپ کی روٹی جل رہی ہے''۔ جہان نے شرارت سے کہا تو وہ اسے خونخوار نظروں سے گھورتی پیر پٹختے ہوئے اندر دوڑی جہاں توے پر پڑی روٹی جہان کی باتوں کی تصدیق کے طور پر جل بھن کر اسے خوب گالیاں دے رہی تھی۔

'سانوں اک پل چین نہ آوے

سانوں اک پل چین نہ آوے سجنا تیرے بنا'

''اف توبہ... یا اللہ! کبھی کسی دشمن کا بھی موبائل خراب نہ ہو، ورنہ اس کا بھی ایسے ہی دماغ خراب ہوگا اور جھیلنا ہم جیسے بے چاروں کو پڑے گا''۔ کچھ ہی دیر میں جب وہ دوبارہ سے اپنے سابقہ مشغلے میں مصروف ہو چکی تھی تو باہر سے جہان نے پھر بلند آواز میں لقمہ دیا، جس نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔

''تکلیف کیا ہے تمہیں؟'' وہ وہیں سے بلند آواز میں گرجی۔

''دعا کر رہا تھا کاش تمہارا دماغ... میرا مطلب ہے موبائل خراب نہ ہوا ہوتا تو ہمیں تمہاری ''سریلی آواز'' میں Live گانے سننے کی بجائے اصلی گانے سننے کو ملتے''۔ جہان نے بے چاری شکل بناتے ہوئے لمبی آہ بھرتے ہوئے سر پر ہاتھ رکھا تو ذینیہ جو اس کی فضول گوئی پر تلملا رہی تھی نل سے جگ بھر کے پانی کھڑکی سے باہر اس پر پھینکا۔

''اب بولو اور...'' وہ جو اپنی بات پر قہقہہ لگا کے دوہرا ہوا تھا، اس اچانک افتاد پر اچھل کے اپنی کرسی سے اٹھا اور مڑ کے کھڑکی کی طرف دیکھا۔

''میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ میرے ساتھ پنگا مت لینا، اب بھی وقت ہے سمجھ جاؤ ورنہ...'' اس نے کھڑکی کے پار سے جہان کو خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے بیلنا گھماتے ہوئے دھمکی دی تو وہ دانت پیستے ہوئے اسے دیکھ کے رہ گیا۔

☆..........☆..........☆

''ذینی! جب تم اپنی یہ روی بیچو تو مجھے بھی بتانا، دونوں حصہ آدھا آدھا کر لیں گے''۔ جہان نے مفت مشورہ دیا۔

''کیوں جی''۔ اس نے بھنویں چڑھائیں۔

''اچھا تو تمہاری اسائمنٹس جمع کروانے بھاگ بھاگ کے کون جاتا تھا بھلا؟'' جہان نے جتایا۔

''بھاگنے سے کیا تمہارا پٹرول خرچ ہوتا تھا جو اب اس کے پیسے مانگ رہے ہو''۔ وہ اسے گھورتے ہوئے بولی تو وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔

''جو بھی کہو، میرا حصہ تو بنتا ہی ہے، سیدھے طریقے سے میرا حصہ میرے حوالے کردینا ورنہ...''

''ورنہ کیا؟''

''ورنہ مجھے گھی ٹیڑھی انگلی سے بھی نکالنا آتا ہے''۔ اس نے آنکھیں گھماتے ہوئے دھمکایا۔

''تم نکال کے تو دکھاؤ انگلی سے گھی، میں نے ہیچ مار کے تمہاری انگلی نہ توڑ دی تو نام بدل دینا''۔ ذینی نے جوابی دھمکی دی تو وہ مسکرایا۔

''ویسے اتنی جلدی نہ کرو کتابیں بیچنے میں، رزلٹ کا انتظار کرلو، یہ نہ ہو کہ...'' جہان نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''جناب جو آپ کے دماغ میں ہے ویسا کچھ نہیں ہونے والا، ویسے بھی شکل اچھی نہ ہو تو بندے کو کم از کم بات تو اچھی کرنی چاہیے یا تھوڑی سی کوشش ہی کرلینی چاہیے''۔

''واہ... بڑی خوش فہمی ہے محترمہ کو''۔ جہان نے پھر اسے چھیڑا تو اس نے بھنویں اچکائیں۔

''تو تمہیں کیا تکلیف ہو رہی ہے سڑیل لومڑ، تم اپنی کتابوں پر دھیان رکھو، کہیں انہیں نہ دوبارہ پڑھنے کی نوبت آجائے''۔ وہ تنک کر بولتی اپنی ردی (کتابیں) سمیٹتی اسے گھور کر واک آؤٹ کرگئی۔

وہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے BA کررہی تھی، آج لاسٹ سمیسٹر کا لاسٹ پیپر دے کر آئی تھی اور ان دونوں کا ہمیشہ سے آپس میں تکرار رہتا تھا اور دونوں ہمیشہ یونہی دشمنوں کی طرح لڑتے، بحث کرتے اور ناراض ہوجاتے مگر دو دن بھی ناراض نہ رہ پاتے اور خود بخود صلح ہوجاتی۔

☆..........☆..........☆

ذینیہ کے ابا رحمان احمد بیرون ملک ملازمت کرتے تھے، ان کی تین بیٹیاں تھیں، سب سے بڑی شبینہ جو کہ شادی شدہ تھی پھر ذینیہ اور سب سے چھوٹی عائشہ، جبکہ اولادِ نرینہ سے وہ محروم تھے مگر کبھی رب سے شکوہ نہ کیا۔

عائشہ I.Com کررہی تھی اور ذینیہ نے ایف اے کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی مگر پھر سال بعد ہی آگے پڑھنے کا فیصلہ کرلیا جس کے نتیجے میں اب وہ اوپن یونیورسٹی سے BA کے لاسٹ سمیسٹر کے بعد اب رزلٹ کی منتظر تھی۔

ان کا گھر دو حصوں میں بنا ہوا تھا، ایک جیسے دو پورشن آمنے سامنے۔ اس کے بچپن میں ابا نے اپنے ایک دوست کو سامنے والا پورشن کرائے پر دیا تھا، وہ لوگ تب سے یہیں مقیم تھے، سیدھے سادے شریف لوگ۔ وہ دوست ابا کے لئے بھائیوں سے بڑھ کر تھے۔ وہ مطمئن تھے کہ ان کی غیر حاضری میں ان کی بیوی اور بیٹیاں اکیلی نہیں ہوں گی۔

ابراہیم صاحب کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی فاطمہ پھر بیٹا جہان جو میڈیکل کے فائنل ایئر میں تھا اور پھر سب سے چھوٹی حلیمہ جو عائشہ کی ہم عمر اور ہم جماعت تھی۔

☆..........☆..........☆

ذینیہ ہر جمعرات کو آنے والے مانگنے والوں کو ایک پیالی چاول اور آٹا دیتی تھی، یہ کچھ سالوں سے اس کا

معمول تھا، اس کا کہنا تھا کہ اس طرح رزق حلال میں برکت پڑتی ہے۔
ابھی بھی وہ حسب معمول گنگناتے ہوئے صحن دھو رہی تھی کہ کسی نے ہاتھ سے دروازہ بجایا، وہ فوراً پائپ چھوڑ کے کچن میں گئی اور پیالی میں چاول ڈال کے لے آئی اور آگے بڑھ کے دروازہ کھولا۔
''یہ لو بھائی''۔ اس نے دروازے کی اوٹ سے چاول کی پیالی آگے بڑھائی تو خاموشی سے پیالی تھام لی گئی تھی۔ اس نے حیرانگی سے تھوڑا سا آگے ہو کے باہر جھانکا تو اس کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے، سامنے جہان اس کی ''خاص پیالی'' تھامے کھڑا مسکرا رہا تھا۔
''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' ذینیہ نے خفگی سے پیالی اس کے ہاتھ سے چھیننی چاہی۔
''بدتمیزی... یہ سوال تو میں بھی کرسکتا ہوں محترمہ کہ یہ کیا بدتمیزی ہے''۔ اس نے جواباً پیالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کا سوال اسے لوٹایا تو اس نے شانے اچکائے۔
''میں نے تو مانگنے والا سمجھ کے دیئے تھے چاول، اب مجھے کیا پتہ تھا کہ آگے تم ہو گے''۔ اس نے لاپرواہی سے بولتے ہوئے اپنے آپ کو بری الذمہ کیا۔
''دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھنا بھی پڑتا ہے میڈم''۔ اس نے طنز کیا۔
''بیل بھی بجانے کے لئے ہی ہوتی ہے مسٹر!'' ذینیہ نے جواباً اسی کے انداز میں طنز کیا۔
''تو بجلی کے بغیر چلنے والی کوئی بیل اب تک تمہارے سسرالیوں نے ایجاد نہیں کی ناں''۔ وہ کہاں کم تھا۔
''تو تم اپنے سسرالیوں سے کہہ دو ناں کہ وہ کرلیں''۔ اس نے پھر حساب چکایا اور وائپر اٹھالیا۔
''ویسے گھر سے باہر تو پیالی پیالی چیزیں بانٹتی پھرتی ہو، کبھی گھر میں بھی کسی کو ایک پیالی پیار بانٹ دیا کرو''۔ جہان نے اسے جاتا دیکھ کر شرارت سے بولتے ہوئے ''کسی'' پر زور دیا تو وہ تیزی سے پلٹی۔
''ایک پیالی زہر نہ بانٹوں کسی کو؟'' ذینیہ نے اسے کھاجانے والے انداز میں دیکھتے ہوئے کسی پر زور دیا۔
''بس ہر وقت جنگلی بلی ہی بنی رہا کرو، کسی خونخوار شیرنی کی جانشین''۔ جہان نے پھر اسے چھیڑا تو اس نے کوئی توجہ نہ دی اور وائپر تھامے پانی سے فرش گیلا کرتی رہی۔
''پتہ نہیں اس بے چارے فرش کا کیا قصور ہے جو تم یوں پانی سے غسل دے دے کر بدلہ لے رہی ہو''۔ جہان اس کے خاموش رہنے پر بھی باز نہ آیا تو وہ غصے سے پلٹی۔
''اپنی فضول بک بک بند کرو اور نکلو یہاں سے''۔ اس نے پائپ بند کر کے سنبھالا اور وائپر پکڑ کے کھڑی ہو گئی جیسے اس کے جانے کی منتظر ہو۔
''توبہ کرلو توبہ، یہ نہ ہو کسی دن تمہیں فرش کو تنگ کرنے کی سزا مل جائے''۔ وہ جاتے جاتے پھر بولا تو ذینیہ نے ماتھے پر بل ڈال کے اسے گھورا۔
''اس پیار سے میری طرف نہ دیکھو
پیار ہو جائے گا''
وہ غصے سے لال بھبوکا ہوتے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے گنگنایا تو وہ دانت پیستے ہوئے اردگرد کوئی چیز مارنے کے لئے تلاش کرنے لگی، جہان اس کا ارادہ بھانپتے ہی فوراً وہاں سے غائب ہو گیا۔
☆.........☆.........☆
وہ دن بعد وہی ہوا جس کا جہان کو خدشہ تھا، ذینیہ حسب معمول صحن دھوتے ہوئے گنگنا رہی تھی جب بے

دھیانی میں پاؤں میں آنے والے پائپ کو نہ دیکھ سکی، پائپ راستے میں آنے سے اسے ٹھوکر لگی اور وہ زور سے فرش پر گری اس کی دائیں ٹانگ قریب پڑے گملے سے ٹکرائی، اس کی دردناک چیخ پر سب گھر والے باہر نکل آئے اور اس کی طرف بڑھے، عائشہ اور حلیمہ نے اسے اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ ٹانگ نہ ہلا سکی، درد کی شدید لہر نے اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر دیں، اس نے دائیں ٹانگ پر ہاتھ رکھے درد ضبط کرتے ہوئے آنکھیں میچ لیں۔

''میں گاڑی لے کر آتا ہوں'' ۔ ذینیہ کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر اسے کسی انہونی کا احساس ہوا اور وہ حواس باختہ ہو کے باہر کی طرف لپکا، چند منٹوں میں دوست سے گاڑی لے آیا۔ ذینیہ کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا اور ہسپتال پہنچے، جہاں ڈاکٹر نے اس کے دل میں اٹھتے خدشے کی تصدیق کر دی۔

ذینیہ کی دائیں ٹانگ کی ہڈی فریکچر ہوئی تھی، دو ماہ کے لئے پلستر چڑھوا کے گھر آئے تو امی نے اچھی خاصی کلاس لی، ذینیہ بے چاری سر جھکائے خاموشی سے امی کی ڈانٹ سنتی رہی۔

''دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ مت ستاؤ بے چارے فرش کو، مل گئی ناں سزا اس کو ہر وقت بے وقت غسل دینے کی'' ۔ جہان نے امی کے نکلتے ہی انٹری ماری تو ذینیہ نے کوفت سے اسے دیکھا۔

''اب ذرا احتیاط کرنا ورنہ...''

''ورنہ کیا...'' ذینیہ نے تنک کے پوچھا۔

''ورنہ کون بیاہنے آئے گا ایک لنگڑی لڑکی کو'' ۔ جہان بڑی بوڑھیوں کے سے فکرمندانہ انداز سے بولتا ہوا سامنے پڑی کرسی پر بیٹھا۔

''تو نہ آئے، تمہیں میری فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے، سمجھے'' ۔ ذینیہ کو اس کا انداز اور باتیں سخت زہر لگ رہی تھیں۔

''توبہ توبہ... گز بھر کی تو زبان ہے اس لڑکی کی، کیا بنے گا تمہارا اگلے گھر میں، تم تو ناک ہی کٹواؤ گی اپنے پچھلوں کی لڑکی'' ۔ جہان پھر ''دادی اماں اسٹائل'' میں بولا تو ذینیہ نے پاس پڑا پلاسٹک کا گلاس اٹھا کے زور سے اسے مارا جو اس نے مہارت سے کیچ کر لیا، ذینیہ سخت تلملائی۔

اک ہم ہیں کہ غیروں سے بھی کرتے ہیں محبت
اک تم ہو کہ اپنوں کا برا سوچ رہے ہو

جہان نے گلاس کو دیکھتے ہوئے سنجیدہ انداز میں شعر پڑھا۔

''نکل جاؤ فوراً یہاں سے، جاہل بدتمیز'' ۔ اس کے شعر پر وہ چلائی۔

''توبہ ہے تم سے تو ذینی! میرے پاس کبھی تم جیسا زبان دراز اور گستاخ مریض آیا تو انجکشن لگا لگا کے اسے سیدھا کر دوں گا، اور اگر کبھی تم میرے پاس علاج کے لئے آئیں تو دیکھنا کیسے کیسے بدلے لوں گا، کڑوی گولیاں اور بڑے بڑے ٹیکے لگا کے'' ۔ جہان نے مستقبل قریب کے بارے میں اپنے نادر و نایاب خیالات کا فخریہ اظہار کیا۔

''اللہ نہ کرے جو کبھی حالات اتنے برے ہوں کہ مجھے تمہارے پاس آنا پڑے علاج کے لئے'' ۔ جواباً ذینیہ بھی اپنے دل کی بھڑاس نکال کے رہی۔

"لگتا ہے ٹانگ کی چوٹ نے دماغ پر اثر کر دیا ہے اس لئے محترمہ زینیہ صاحبہ بہکی بہکی باتیں کر رہی ہیں"۔ جہان نے اس کی غصے بھری باتوں کو ناک سے مکھی کی طرح اڑاتے ہوئے اس کی دماغی حالت پر شک کیا تو وہ دانت پیس کے رہ گئی۔

"افوہ... جہان کیا ہر وقت تم لڑتے ہی رہتے ہو، منٹ نہیں لگتا تمہیں بدلحاظ ہونے میں"۔ اس سے پہلے کہ زینیہ جواباً کچھ کرارا سا سناتی، جہان کی آپی نے انٹری دی اور جہان کو ڈانٹا۔

"اچھا تو ان محترمہ کے منہ سے کون سے پھول جھڑ رہے ہیں اتنی دیر سے؟" وہ آپی کی بات پر تپ کے بولا تو زینیہ آپی کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے دل ہی دل میں اسے کوسنے دینے لگی۔

"حد ہے بھئی، تمہیں تو کوئی نہیں روک سکتا، تیز گام نان اسٹاپ ٹرین کی طرح چلتے ہی رہا کرو"۔ آپی نے جیسے ہار مانی تو وہ خفگی سے پیر پٹختا باہر نکل گیا۔

☆............☆............☆

دو ماہ بعد زینیہ کا پلستر اُترا تو اس نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا۔ اس دوران جہان اور زینیہ کی نوک جھونک چلتی رہی مگر کسی نے ہار نہ مانی۔

زینیہ جاتی سردیوں کی دھوپ میں بیٹھی Wavi کھاتے ہوئے رسالہ پڑھنے میں مگن تھی جب اچانک جہان آ کر گرنے کے سے انداز میں سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے افسوس سے بولا تو وہ اس کے انداز پر چونکی۔

"کیا ہوا ہے خیریت؟" اس کے خلاف معمول سنجیدہ انداز پر وہ پریشان ہی ہو گئی۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے"۔ جہان نے تھکے تھکے انداز میں سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔

"ہوا کیا ہے؟" وہ مزید متفکر ہوئی۔

"بس نہ پوچھو"۔

"افوہ جہان! اب بتا بھی دو، کیا ڈرامے کر رہے ہو؟" اس کے جواب اس کو تپا دیتے تھے۔

"بس... جو کچھ بھی ہوتا ہے اس میں مصلحت ہی ہوتی ہے، بندہ ہونی کو تو نہیں ٹال سکتا بس صبر کے ساتھ قبول کرنا پڑتا ہے"۔ جواباً پھر تمہید، وہ سخت کوفت زدہ ہوئی۔

"جہان..."

"زینیہ! تمہارا رزلٹ آ گیا ہے"۔ اس نے دھیمے لہجے میں بولتے ہوئے بند مٹھی ہونٹوں پر جمائی، خبر تھی یا دھماکہ، ہاتھ سے رسالہ چھوٹ گیا اور ڈھیلی پڑ گئی، جہان کی اتنی لمبی تمہید نے اس کے حوصلے پست کر دیئے، اسے یقین ہو گیا کہ واقعی خیریت نہیں ہے۔

"تمہیں امید ہو لیکن مجھے بالکل بھی ایسے رزلٹ کی امید نہیں تھی"۔ جہان نے ایک سنجیدہ سی نظر اس کے رنگ اڑے چہرے پر ڈالی تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

"پیپرز تو کافی اچھے ہوئے تھے پھر... یہ..." وہ سوچ کے رہ گئی۔ مارے شرمندگی کے جہان سے نظر ملانے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"ہائے امی سے اب بے عزتی ہو گی"۔ دل میں خیال آیا تو ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

"اچھا تو پھر کیا کھلا رہی ہو؟" وہ گود میں ہاتھ رکھے سوچوں میں گم تھی، نمبر تک پوچھنے کی ہمت نہیں تھی، جب اچانک جہان کے سوال نے اسے چونکایا۔ اس نے سر اٹھا کے اسے دیکھا جو لبوں پر شریر مسکان سجائے اسے ہی

دیکھ رہا تھا۔

''اب ٹریٹ تو بنتی ہے ناں شہزادی''۔ اس نے اس کے پیسے سنبھال کے رکھنے والی عادت پر چوٹ کی۔

''جہان...'' اس نے اس کی شرارت کو سمجھتے ہوئے اسے گھورا، زینیہ کی تو جیسے جان میں جان آ گئی تھی۔

''سیریسلی مجھے ایسے رزلٹ کی بالکل بھی امید نہیں تھی''۔ اس نے اس کے غصے سے لال ہوتے چہرے کو دیکھتے ہوئے ہاتھ اٹھا کے اپنی صفائی پیش کی۔

''ویسے کس سے نقل ماری تھی، کہیں کوئی بوٹیاں وغیرہ تو نہیں...'' جہان نے رازدارانہ انداز میں مشکوک نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جہان کے بچے... کمینے انسان''۔ وہ دانت پیستے ہوئے غصے سے رسالہ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

''میرے بچے ابھی اس دنیا میں آئے بھی نہیں اور تم ان کے کمینہ ہونے کی پیش گوئی پہلے سے ہی کر رہی ہو، بڑی ناانصافی ہے یہ ویسے''۔ وہ سر کھجاتے ہوئے معصومیت سے بولا تو زینیہ نے پانی کی بوتل اٹھالی مگر وہ فوراً نو دو گیارہ ہو گیا۔

☆............☆............☆

جا جا کے کہاں منتیں فریاد کرو گے
لو ہم نے تمہیں دل دیا کیا یاد کرو گے

جہان صحن میں بیٹھا گنگناتے ہوئے موبائل پر گیم کھیل رہا تھا، زینیہ سامنے اپنے برآمدے میں بیٹھی اپنی قمیض پر کڑھائی کر رہی تھی۔

ہلکی ہلکی بارش نے موسم کو خوشگوار بنا دیا تھا اور بارش کی موجودگی میں لائٹ بھلا کب موجود رہتی ہے اس لئے دو گھنٹے سے مسلسل غیر حاضر تھی۔ موسم کی وجہ سے کچھ اندھیرا سا چھا گیا تھا اس لئے زینیہ کمرے میں اندھیرے کے باعث صحن میں بیٹھی تھی مگر جہان کے گنگنانے سے سخت ڈسٹرب ہو رہی تھی۔

زینیہ کے ابا کو آئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ آج وہ اور اماں جہان کے اماں ابا کے ساتھ کسی جاننے والے کے ہاں عیادت کے لئے گئے تھے۔ فاطمہ آپی کو بھی جہان کی امی زبردستی ساتھ لے گئیں، عائشہ اور حلیمہ کا آج لاسٹ پیپر تھا اس لئے واپس آتے ہی دونوں آزادی کی خوشی میں سو گئی تھیں۔

زینیہ کی جہان سے ناراضی چل رہی تھی اس لئے اس کی طرف خاموشی تھی۔ جہان جان کے اس کی طرف رخ کر کے بیٹھا مسلسل گنگنا رہا تھا۔ بظاہر وہ موبائل پر مصروف تھا مگر کن انکھیوں سے وہ زینیہ کے سنجیدہ چہرے کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا جو ناراضی کے باعث پھولا ہوا لگ رہا تھا، وہ جان کے اسے متوجہ کرنا چاہ رہا تھا۔

دراصل کل جمعرات تھی اور زینیہ کی امی نے بریانی بنائی تھی۔ جہان کا حصہ انہوں نے الگ کر کے رکھ دیا تھا کیونکہ جہان اپنے دوست کے پاس ضروری کام سے گیا ہوا تھا، واپس آتے آتے شام ہو گئی۔ جب وہ گھر آیا تو دروازے سے ایک فقیر دعائیں دیتا ہوا پلٹ رہا تھا، وہ مسکراتا ہوا اندر آیا تو کچن کے پاس ہی زینیہ مل گئی، جہان کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اُس نے اس کی بریانی اس فقیر کو دے دی ہے، جہان جو بریانی کے خیال سے بھاگم بھاگ گھر آیا تھا اور دوست کی ڈنر کی آفر بھی رد کر دی تھی زینیہ کی اس حرکت پر تپ گیا۔

''میں نے سوچا تم کھانا کھا کے آؤ گے اس لئے، ویسے بھی ریسٹورنٹ کے کھانے کے آگے گھر کی بریانی کی بھلا کیا ویلیو''۔ اس کے معصومیت سے کہنے پر وہ مزید تپ گیا۔

''ویلیو ہے، بہت ہے کیونکہ یہ بریانی میری خالہ نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے اور تم...''

''اُفوہ... کتنے چھوٹے دل کے ہو تم جہان... صرف ایک پیالی ہی تو دی ہے تمہارے حصے میں سے، کون سا ساری پلیٹ دی ہے جو تم یوں ری ایکٹ کر رہے ہو، ایک پیالی سے دیکھو کتنی دعائیں دے کر گئے ہیں وہ بابا جی اور تم صرف ایک پیالی چاول کم ہو جانے پر یوں...'' زینیہ جہان کی بات کاٹ کر شروع ہو گئی تھی۔

''تمہاری اس ایک پیالی کی تو میں''۔ جہان نے اس کی لمبی تقریر اور ''ایک پیالی'' کی گردان سے زچ ہو کر اس کے ہاتھ سے اس کی وہ ہر دلعزیز پیالی چھین لی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے جہان! میری پیالی واپس دو''۔ زینیہ نے آگے بڑھ کر پیالی لینا چاہی۔

''بدتمیزی ہے تو وہ کیا ہے جو تم کر رہی ہو''۔ جہان کی گرفت پیالی پر ہنوز مضبوط تھی۔ زینیہ نے بھرپور کوشش کی پیالی چھڑوانے کی، اس چھینا جھپٹی میں پیالی گر گئی اور چھوٹے چھوٹے ٹکروں میں زینیہ کے قدموں میں بکھر گئی۔

''جہان...!'' زینیہ نے اس حرکت پر خونخوار نظروں سے جہان کو دیکھا۔

''بے شک یہ مجھ سے جان کے نہیں گری، مگر اچھا ہوا ٹوٹ گئی، خس کم جہاں پاک''۔ جہان نے پہلے دونوں ہاتھ اٹھا کے اپنی صفائی پیش کی ساتھ ہی شرارت سے دلی خوشی بھی ظاہر کر دی تو زینیہ کے ماتھے کے بلوں میں اضافہ ہو گیا۔ وہ بولی کچھ نہیں بس غصے سے نم آنکھوں کے ساتھ ایک نظر فرش پر بکھری پیالی اور ایک نظر جہان کو دیکھ کر اندر چلی گئی۔ اس کے بعد کل سے ابھی تک وہی خاموشی اور قطع تعلقی تھی۔ اسے پیالی کا بہت دکھ تھا کیونکہ وہ پیالی کوئی عام پیالی نہیں تھی بلکہ عام پیالیوں سے قدرے بڑی اور چینی کی بنی ہوئی تھی جو کہ اس کی مرحومہ دادی کی نشانی تھی، جو اَب نہیں رہی تھی۔

''کیا تم اب اپنی بکواس بند کرو گے؟'' وہ جو کافی دیر سے خاموشی سے جہان کی بے سری راگنی سن اور برداشت کر رہی تھی، خفگی سے بولی تو وہ چونکا۔

''اوتو آپ سن رہی ہیں، مجھے لگا کہ شاید میں یونہی گا رہا ہوں بٹ آپ تو میری طرف متوجہ ہیں''۔ جہان زینیہ کی طویل خاموشی کے بعد بولنے پر خوشی و شرارت سے چہکا تو اس نے غصے سے دانت پیستے ہوئے رخ بدل لیا۔

''کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے''

زینیہ کے یوں رخ بدلنے پر وہ پھر بولا تو وہ سنی ان سنی کر کے اپنے کام میں لگی رہی۔

اس سے پیشتر کہ وہ اسے کچھ خوبصورت القابات دیتی ڈور بیل بجی۔

''ذرا دیکھو تو دروازے پر دستک کون دیتا ہے''

''محبت ہو تو کہنا کہ یہاں اب ہم نہیں رہتے''۔ جہان نے کرسی پر مزید پھیلتے ہوئے شعر پڑھا جو اشارہ تھا کہ زینیہ دروازہ کھولے۔

''دو عدد ٹانگیں آپ بھی رکھتے ہیں لہٰذا بذات خود جا کے آپ اپنی محبت کو ریسیو کر لیں ناں''۔ زینیہ نے سنجیدہ

نظریں اس کے چہرے پر جمائیں تو وہ مسکرایا کہ بالآخر وہ بولی تو۔

''جوابی کارروائی... مطلب... صلح صفائی، مبارک ہو''۔اس نے شرارت سے آنکھیں پھیلائیں تو ذیبیہ نے اس کی ڈھٹائی پر لمبی سانس لے کر اسے دیکھا۔

'تعلقات میں گنجائش تو ہوتی ہے
ذرا سی بات پر کیا آدمی خفا ہو جائے'

اس نے دائیں مٹھی ٹھوڑی کے نیچے جماتے ہوئے ناصحانہ انداز میں شعر پڑھا۔

''برائے مہربانی آدمی پہلے دروازے پر جائے''۔ ذیبیہ نے اس کے انداز پر مسکراتے ہوئے اسے دروازہ کھولنے کا کہا تو وہ مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے''۔ جہان نے اس کے چہرے پر آئی مسکان کو دیکھ کر شرارت سے کہا تو وہ تاسف سے سر ہلا کے رہ گئی۔

''اف توبہ اتنے شعر نجانے کہاں سے آتے ہیں اسے، لگتا ہی نہیں کہ یہ مستقبل کا ڈاکٹر ہے، چلتی پھرتی شعروں کی دکان ہے یہ تو''۔ذیبیہ نے دل میں سوچا۔

وہ مسکراتا گنگناتا دروازے پر پہنچا اور دروازہ کھولا مگر آنے والے کو دیکھ کر جہان کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

☆............☆............☆

جہان کے رزلٹ آنے میں ابھی ایک ماہ رہتا تھا کہ جہان کی زندگی میں وہ موڑ آ گیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

جہان کے دادا ملک اسماعیل حسین اپنے اکلوتے بیٹے ابراہیم حسن، بہو اور بچوں کو لینے آ گئے تھے۔

دراصل ابراہیم کی والدہ کے انتقال کے بعد 12 سالہ ابراہیم کے لئے ملک اسماعیل کو مجبوراً دوسری شادی کرنی پڑی، حالانکہ وہ دوسری شادی کے حق میں نہیں تھے مگر ماں کے مجبور کرنے اور پھر بیٹے کی خاطر انہیں ایسا کرنا پڑا لیکن دوسری بیوی شاکرہ کا سلوک ابراہیم کے ساتھ روایتی سوتیلی ماں والا تھا۔ مگر ابراہیم نے کبھی باپ سے کوئی شکوہ نہ کیا، دادی کے بعد شاکرہ کا سلوک مزید بدتر ہو گیا، مگر ابراہیم نے ہمیشہ سر جھکا کے اس کا ہر حکم مانا مگر جب ابراہیم کی شادی کا وقت آیا تو شاکرہ اپنی بھانجی کو لانے کی خواہشمند ہوئیں لیکن ابراہیم اپنی کلاس فیلو شازیہ کو پسند کرتا تھا، ہر حکم پر تابعداری سے سر جھکا دینے والے ابراہیم کی طرف سے انکار نے شاکرہ کو مشتعل کر دیا، اس نے تو ایسا سوچا بھی نہ تھا۔ اس نے غصے میں آ کر اسماعیل کو بیٹے کے خلاف اتنا بھڑکایا کہ اسماعیل نے طیش میں آ کر اکلوتے بیٹے کو اس نافرمانی پر گھر سے بے دخل کر دیا، ابراہیم نے گھر سے نکلنے کے بعد اپنے دوست رحمان کے گھر کا آدھا پورشن کرائے پر لیا اور جلد ہی شازیہ سے شادی کر کے وہاں رہنے لگا۔

ابھی کچھ ہی ماہ قبل شاکرہ کو فالج کا اٹیک ہوا تو انہوں نے اسماعیل صاحب سے اپنے کیے کی معافی مانگی اور رو رو کے خواہش کی کہ وہ ابراہیم کو ڈھونڈ کے گھر لے آئیں، وہ اس بن ماں کے معصوم بچے پر کیے گئے ظلم کی معافی مانگنا چاہتی ہیں۔ اسماعیل صاحب خود بھی عمر کے اس حصے میں بیٹے کو بہت یاد کرتے تھے، شاکرہ سے ان کی دو بیٹیاں تھیں جن کی وجہ سے بیٹے کی کمی شدت سے محسوس ہوتی تھی، وہ خود کو قصوروار ٹھہراتے کہ انہوں نے اپنے بیٹے پر اعتماد نہ کیا اور اسے بے دردی سے گھر سے نکال دیا۔ خالی حویلی سائیں سائیں کرتی

تھی، بالآخر قسمت کو ان کی تنہائی اور بے چارگی پر رحم آ گیا، کچھ دن پہلے سر راہ ملک اسماعیل کی ملاقات ابراہیم کے ایک کالج فیلو سے ہوئی جو اکثر ابراہیم کے ساتھ حویلی آیا کرتا تھا، اس سے ملک صاحب کو ابراہیم کا ایڈریس ملا اور وہ فوراً وہاں پہنچے۔

بیٹے کی دید کی پیاسی آنکھیں فوراً پہچان گئیں کہ دروازہ کھولے حیران کھڑا نوجوان ان کا اپنا خون ہے کیونکہ اس نے سارے نقش اپنے باپ کے چرائے تھے، وہ ابراہیم کی جوانی تھا، انہوں نے فوراً اسے سینے سے لگا لیا۔ جہان بھی انہیں پہچان گیا کیونکہ اس کے ابا کے پاس دادا دادی کی کافی تصویریں موجود تھیں۔

پھر جب 24 سالوں کے بچھڑے باپ بیٹا ملے تو ہر آنکھ نم ہوگئی، انہوں نے فوراً بیٹے، بہو اور پوتے پوتیوں کو ساتھ چلنے کا حکم سنایا۔ یوں ابراہیم صاحب اور ان کی فیملی جو 24 سال سے رحمان احمد کے گھر کرائے دار تھے، ان کے ساتھ ایک اچھا اور یادگار وقت گزار کے اس گھر سے چلے گئے اور اپنے پیچھے بیتے سالوں کی یادیں چھوڑ گئے۔

☆..........☆..........☆

وقت منٹوں، گھنٹوں، دنوں، ہفتوں اور پھر مہینوں میں یوں گزرا کہ دو سال بیت گئے۔ بصد مجبوری رحمان صاحب فیملی کے ساتھ دوسرے شہر میں شفٹ ہوگئے۔ ان دو سالوں میں ذینیہ نے ایم اے کر لیا اور عائشہ نے B.Com۔ آج کل بس ذینیہ کی شادی کی فکریں تھیں، گزشتہ دو سالوں میں ذینیہ کے کافی رشتے آئے مگر ذینیہ نے پڑھائی کا بہانہ کر کے ٹال دیا۔

آج کل ذینیہ کے لئے ایک ڈاکٹر کا رشتہ آیا ہوا تھا، ابا اماں کو تو لڑکا بے حد پسند آیا مگر شبینہ آپی کے شوہر توقیر بھائی نے کہا کہ لڑکے کا نام پتہ لے کر پہلے پوری طرح چھان بین کر کے تسلی کریں گے پھر کوئی حتمی جواب دیں گے۔

''ویسے ڈاکٹر تو ڈاکٹر احمر کی طرح کا ہونا چاہئے، ڈیسنٹ، پنکچوئل، ایکٹو، آئیڈیل اور انسپائرنگ، اپنے کام سے مخلص اور ذمہ دار، Efficient''۔ ذینیہ اور عائشہ بیٹھی ''دھوپ کنارے'' ڈرامہ دیکھ رہی تھیں جو کہ PTV Home پر دن کے ٹائم Repeat ہو رہا تھا جب ذینیہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''چلیں دیکھتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر کیسے نکلتے ہیں''۔ عائشہ نے ڈاکٹر کے بارے میں ذینیہ کے خیالات سن کر شرارت سے بولتے ہوئے اس پرپوزل کی طرف اشارہ کیا جو کہ کچھ دن سے زیر غور تھا۔

''ویسے آپی! جہان بھائی بھی ڈاکٹر بن گئے ہوں گے ناں؟'' ذینیہ کو یہ ڈرامہ بے حد پسند تھا اس لئے وہ پوری طرح سے ڈرامے کی طرف متوجہ تھی جب عائشہ کے اچانک سوال نے اسے چونکایا۔

''ہوں... اس وقت تو اس کا رزلٹ آنے ہی والا تھا''۔ ذینیہ نے سوچتے ہوئے بتایا۔

''اچھا تو پھر...''

''عائشہ! بیٹا یہاں آؤ''۔ عائشہ کی بات بیچ میں ہی رہ گئی کیونکہ امی نے اسے پکارا تھا، وہ فوراً کمرے سے نکل گئی۔

''کیسا لگتا ہوگا وہ وائٹ اوور آل پہنے، گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لٹکائے مریضوں کا معائنہ کرتا ہوا، لازماً شرٹ کے بازوؤں کی طرح اوور آل کے بازو بھی فولڈ کرتا ہوگا''۔ ذینیہ جہان کو ڈاکٹر کے روپ میں تصور کرتے

ہوئے اپنی سوچ پر مسکرائی، اس کا دھیان ڈرامے سے مکمل ہٹ کر جہان کی طرف چلا گیا تھا۔

☆............☆............☆

وہ صحن کی صفائی کررہی تھی جب اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ زور سے گیلے فرش پر گر گئی حالانکہ وہ دو سال پہلے کے حادثے کے بعد کافی محتاط ہوگئی تھی مگر پھر نجانے کیسے پاؤں پھسل گیا۔ پچھلی فریکچر شدہ ہڈی پہ ہی زور پڑا تھا، نتیجتاً پلستر چڑھایا گیا، اس گھڑی ذینیہ کو شدت سے جہان کی یاد آئی جب وہ پلستر کی وجہ سے بے زار رہتی تھی تو وہ اسے ہنسایا کرتا تھا، باتیں کرکر کے، تنگ کرکر کے اس کا دھیان اس تکلیف کی طرف سے ہٹانے کی پوری کوشش کرتا تھا، ہر وقت موقع کی مناسبت سے شعر اس کے پاس موجود رہتے تھے۔

آج بھی وہ آنکھیں موندے لیٹی تھی، اسے یہاں ایڈمٹ ہوئے آج چوتھا دن تھا جب خلاف معمول غیر معمولی ہلچل نے اسے چونکایا تو اس نے آنکھیں کھول کے اردگرد نظر ڈالی، وارڈبوائے اور نرسز تیز تیز اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔

''کوئی آرہا ہے کیا؟'' اس نے بے اختیار قریب کھڑی نرس سے سوال کیا جو نجانے کب اس کے پاس آئی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آرہے ہیں''۔ نرس نے اس کے لیے انجکشن تیار کرتے ہوئے جواب دیا۔

''تو اس میں اتنی افراتفری والی کیا بات ہے؟'' وہ حیران ہوئی کہ ایک ڈاکٹر کے راؤنڈ پر آنے پر اتنی ہنگامی صورتحال۔

''دراصل بڑے ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آرہے ہیں ناں، ڈاکٹر ملک جو اس اسپتال کے مالک ہیں، کچھ ہفتے پہلے ملک سے باہر گئے تھے، کل ہی واپس آئے ہیں اور آج ابھی راؤنڈ پر آنے لگے ہیں، انہیں بے ترتیبی اور لاپروائی بالکل بھی پسند نہیں، بڑے سخت ڈاکٹر ہیں، اصولوں کے پابند، گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلنے والے''۔ نرس نے اس کے سوال کا تفصیلاً جواب دیا تو نرس کی باتیں سن کر وہ دو سال پیچھے کہیں چلی گئی۔

''جب میں اپنا اسپتال بناؤں گا تو تم دیکھنا ذینی! میں بڑا اسٹرک قسم کا ڈاکٹر بنوں گا، اور جب میں راؤنڈ پر آیا کروں گا تو سب ڈاکٹرز، نرسز اور تو اور مریض بھی الرٹ ہوجایا کریں گے اور سب تیز تیز اپنے کاموں میں مصروف ہوجایا کریں گے اور پتہ ہے میں ہر مریض کے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر روز فریش پھول رکھواؤں گا تاکہ انہیں فریش نیس کا احساس ہو اور وہ بہتر فیل کریں اور اس معاملے میں کسی کی ذرا سی بھی لاپروائی برداشت نہیں کروں گا''۔ جہان اپنے مستقبل کے اسپتال کے تصور میں کھویا بول رہا تھا۔

''اچھا یعنی بڑے ظالم ڈاکٹر بنو گے، اپنے آنے سے پہلے ہی اسپتال میں ہائی الرٹ کروایا کرو گے''۔ ذینیہ نے اسے چھیڑا۔

''ارے اس میں بھلا ظالم والی کون سی بات ہے، ایک ڈاکٹر کا پہلا کام ہی مریضوں کا خیال رکھنا ہے تو میں ان کی دیکھ بھال میں کوتاہی کیسے برداشت کرسکتا ہوں''۔ وہ اپنا مستقبل قریب کا لائحہ عمل بتا رہا تھا تو وہ مسکرائی تھی۔ جہان کی باتیں اسے اپنے اردگرد گونجتی محسوس ہورہی تھیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے اردگرد دیکھا۔ اُس نے اسپتال بنایا ہوگا تو وہاں بھی یہی سب ہوتا ہوگا، پتہ نہیں وہ واقعی ویسا ہی ہوگا جیسا وہ کہتا تھا یا پھر...

سوچتے سوچتے اس کی نظر دروازے سے اندر داخل ہوتے ڈاکٹر پر پڑی تو وہیں ٹھہر گئی، گرے شرٹ پر

وائٹ اوورآل، گلے میں اسٹیتھواسکوپ ڈالے سنجیدہ چہرے والے ڈاکٹر پر اسے جہان کا گمان ہوا، وہ ٹھٹکی پھر مسکرا کے نظریں پھیر لیں۔

''افوہ... اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں تو وہی نظر آنے لگا ہے''۔ مزید سوچا۔ اس نے خود کو سرزنش کی اور نرس کا انجکشن والا ہاتھ قریب بڑھتے دیکھ کر آنکھیں میچ لیں۔ اسے ہمیشہ انجکشن لگوانے سے ڈر لگتا تھا، ابھی بھی اس نے بائیں مٹھی میں بستر کی چادر کو جکڑا ہوا تھا اور آنکھیں سختی سے میچ رکھی تھیں، مگر اسے شدید حیرت ہوئی کہ انجکشن کا درد ویسا نہیں ہوا جیسا ہمیشہ ہوتا تھا۔

''آنکھیں کھول لو، انجکشن لگ چکا ہے''۔ اس سے پہلے کہ وہ آنکھیں کھولتی، مانوس سی مردانہ آواز نے اسے چونکایا، اس نے فوراً آنکھیں کھولیں تو نرس کی جگہ سامنے جہان کو کھڑا دیکھ کر حیران ہوئی۔

''اف... اب تو ہر طرف یہی نظر آنے لگا ہے، حد ہے یہ کیا ہو گیا ہے مجھے''۔ وہ اپنی سوچ پر سر جھٹک کے مسکرائی مگر وہ ہنوز سامنے کھڑا رہا۔ لبوں پر وہی مخصوص شریر مسکان تھی، اس کے پیچھے وہی نرس کھڑی تھی۔

''یعنی یہ میرا وہم نہیں ہے بلکہ اصلی جہان ہے''۔ اسے اپنی بصارت پر یقین نہ آیا کہ یہ نظر کا دھوکا ہے یا واقعی حقیقت میں جہان اس کے سامنے کھڑا ہے۔

''تم ابھی بھی انجکشن سے ڈرتی ہو، بالکل بھی نہیں بدلی''۔ وہ مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے گویا ہوا تو اسے اس کی موجودگی کا یقین آ گیا۔

''تو یہ ہے ڈاکٹر ملک، اس اسپتال کے مالک بڑے ڈاکٹر صاحب یعنی ڈاکٹر جہان ملک، یعنی میں اس کے اسپتال میں ہوں، واہ ری قسمت ملوایا بھی تو کیسے''۔

''تم بھی تو نہیں بدلے، بالکل ویسے ہی ہو''۔ زینیہ نے جہان کے کف فولڈ کرنے کے انداز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرایا۔

''ویسے تم یہاں کیسے، تم لوگ تو شاید باہر چلے گئے تھے''۔ جہان نے قریبی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا تو زینیہ نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

''گاؤں شفٹ ہونے کے تقریباً مہینے بعد ہم لوگ گھر آئے تھے تو محلے والوں سے پتہ چلا تھا کہ تم لوگ گھر بیچ کر دوسرے شہر چلے گئے ہو اور تمہاری شادی ہونے والی ہے، اس کے بعد سب چاچو کے ساتھ باہر شفٹ ہو جائیں گے''۔ جہان نے پوری بات بتائی تو جواباً وہ خاموش ہی رہی۔

''اسپتال اچھا بنایا ہے تم نے، جیسا تم بتاتے تھے بالکل ویسا ہی ہے سب کچھ''۔ کچھ سیکنڈز خاموش رہنے کے بعد وہ اردگرد نظریں دوڑاتے ہوئے بولی تو وہ اس کے یوں بات بدلنے پر مسکرایا۔

''مگر دیکھ لو حالات بھی ٹھیک ہیں اور یقیناً تمہارا دماغ بھی، پھر بھی تم میرے اسپتال میں میرے پاس علاج کے لئے موجود ہو''۔ جہان نے اس کی کہی بات کا حوالہ دیتے ہوئے چوٹ کی تو وہ کندھے اچکاتے ہوئے مسکرائی۔

''تو پھر لے لو بدلے، بڑے بڑے انجکشن لگا کے اور کڑوی گولیاں کھلا کے''۔ اس نے بھی جواباً اس کی بات دہرائی تو وہ ہنسا۔

''ویسے اس بے چاری ٹانگ پر ترس نہیں آتا تمہیں، پھر کسی فرش کی دھلائی کر رہی تھیں کیا؟'' جہان کے سوال پر اس نے کھسیا کے سر جھکا لیا۔

''خالہ کیسی ہیں اور فاطمہ آپی اور حلیمہ ٹھیک ہیں؟'' زینیہ کے سوال پر جہان نے بند مٹھی ہونٹوں پر جماتے ہوئے بیڈ پر لیٹی اس پلستر میں جکڑی ٹانگ والی لڑکی کو گہری نظر سے دیکھا جس کی یہ عادت بچپن سے تھی کہ جب کوئی جواب نہ بن پا رہا ہو تو بات بدلنے میں منٹ نہیں لگاتی جیسا کہ ابھی کیا۔

''سب ٹھیک ہیں، تم سناؤ گھر میں سب کیسے ہیں؟ گھر کیوں بدلا تم لوگوں نے اور تمہاری شادی...''

''ساری باتیں یہیں کرو گے کیا، گھر نہیں آؤ گے؟'' جہان کو واپس انہی سوالوں پر آتا دیکھ کر وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے شرارت سے بولی تو وہ مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

''انشاء اللہ ضرور آؤں گا، تم ایڈریس تو دو اور ذرا یہ بیڈ چھوڑنے کی تیاری کرو، قبضہ ہی کر لیا تم نے تو، صبح ہم تمہیں ڈسچارج کرنے والے ہیں''۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا تو وہ اسے گھورتے ہوئے مسکرائی۔

''ابھی تک اتنے ہی کمینے ہو''۔

''کیا کروں ڈیئر! اتنے سالوں کی تمہاری صحبت کا اثر ہے، دو سالوں میں کہاں جاتا ہے''۔ وہ معصومیت بھرے لہجے میں بولا اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ وہ خاموشی سے اسے مریضوں سے بات چیت کرتا دیکھتی رہی۔

☆............☆............☆

زینیہ ڈس چارج ہو کر گھر آئی تو اسی شام جہان اپنی امی اور حلیمہ کے ساتھ آ گیا۔ امی اور شازیہ خالہ دو سال بعد ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئیں، عائشہ تو فوراً حلیمہ کو لئے اپنے کمرے میں گھس گئی، زینیہ بیڈ پر بیٹھی تھی امی اور خالہ وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ ابو دکان پر تھے، جہان بھی یہیں بیٹھ گیا۔ شازیہ خالہ نے گھر چھوڑنے کے بارے میں استفسار کیا تو امی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''بس شازیہ کیا بتاؤں، کیا کڑی آزمائش آن پڑی تھی ہم پر، ورنہ کوئی چھوڑتا ہے اپنا ذاتی گھر، جو اتنی محبتوں اور ارمانوں سے اینٹ اینٹ جوڑ کے بنایا ہو''۔ امی نے اداسی سے بتایا تو جہان جو ٹی وی دیکھ رہا تھا فوراً ان کی طرف متوجہ ہوا۔

''دراصل ہمارے گھر کے سامنے والا گھر تھا ناں احسان صاحب کا، جہاں تم لوگوں کے جانے سے پہلے نئی فیملی آئی تھی''۔ امی نے خالہ کو یاد دلایا۔

''ہاں ہاں، وہ جن کے دو بیٹے تھے اور بیٹیوں کی شادیاں ہوئیں تھیں انہی دنوں''۔ خالہ شازیہ نے فوراً یاد آتے ہی بتایا۔

''ہاں وہی، ان کا چھوٹا بیٹا پتہ ہے ناں کسی دوسرے شہر ہوتا تھا، تم لوگوں کے جانے کے ایک دو دن بعد ہی واپس آیا تھا، پتہ چلا کہ پڑھائی مکمل ہو گئی ہے اس کی، سچ پوچھو تو مجھے نہیں یقین آتا کہ وہ وہاں پڑھنے گیا تھا، شکل اور حلیے سے تو بالکل آوارہ، بدمعاش ہی لگتا تھا پکا۔ اس منحوس مارے نے کہیں زینی کو دیکھ لیا اور لے کے رشتہ بھیج دیا اپنا۔ پورے محلے کو پتہ تھا بلکہ بچہ بچہ جانتا تھا کہ کس کردار کا لڑکا ہے وہ، پھر بھی اس کی ماں آ گئی اپنے آوارہ بیٹے کا رشتہ لے کر۔ ہم نے تو بہانہ کر دیا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے، مگر وہ عورت روز آ جاتی تھی کہ آپ منگنی توڑ کے میرے بیٹے سے اپنی بیٹی بیاہ دیں''۔

''کیوں بھئی ایسی بھی کیا زبردستی بھلا، ذرا کھری کھری سنائی تھیں اس ڈھیٹ عورت کو دوبارہ قدم نہ

رکھتی''۔ شازیہ خالہ نے غصے سے کہا۔
''ذینیہ کے ابو نے پہلے تو نرمی سے انکار کیا، مگر دو تین دن جب وہ لگا تار آتی رہیں تو انہوں نے کافی غصے سے بولا تھا اسے، پھر ایک دو دن تو سکون رہا مگر فطرت تو نہیں بدلتی ناں۔ ماں نے آنا چھوڑا تو بیٹا ستانے لگا، سارا سارا دن چھت پر کھڑا رہتا، اونچے اونچے گانے لگاتا تو کبھی رقعے پھینکتا، اس کے ابو نے اس کے باپ سے بات کی تو اس نے صاف جواب دے دیا کہ بیٹا میری سنتا ہی نہیں، بہت لاڈلا ہے ناں اس لئے ہم اسے ناں نہیں کرتے، جو اسے پسند آئے لے کر دیتے ہیں''۔
''انسان میں اور چیزوں میں کوئی فرق نہیں پتہ نہیں، کتنے عجیب لوگ ہیں، ایسی اولاد کو تو جوتے لگانے چاہئیں اور انہوں نے سر چڑھایا ہوا ہے''۔ شازیہ خالہ کو تو سن کر اتنا غصہ آیا، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ عورت سامنے ہو تو حشر کر دیں اس کا اور اس کے بیٹے کا۔
''اس ذلیل انسان نے بھی اتنے پر بس نہیں کی، کالج آتے جاتے ان دونوں کو تنگ کرنے لگا، کالج تک پیچھا کرتا، آوازیں کستا، زندگی عذاب کر دی تھی اس نے تو ہماری، عائشہ تو رو رو کے برا حال کر لیتی تھی، اس کے ابو نے واپس بھی جانا تھا مگر اس طرف سے اتنی پریشانی تھی انہیں، پھر کچھ دن گزرے وہ کہیں نظر نہ آیا ہم نے شکر کیا کہ جان چھوٹی مصیبت سے، اردگرد سے پتہ چلا کہ وہ واپس چلا گیا ہے پھر اس کے ابو کچھ دن دیکھ کر تسلی کر کے واپس چلے گئے''۔
''تو آپا آپ لوگوں نے پولیس کو بتانا تھا ناں، خود ہی عقل ٹھکانے آجاتی مار کھا کے اس کی''۔
''اس کے ابو نے یہی سوچا تھا مگر وہ خود ہی چلا گیا تو ہم نے شکرانے کے نفل پڑھے مگر ہفتہ ڈیڑھ ہی گزرا تھا کہ ایک روز جب عائشہ نے کالج سے چھٹی کی تھی اور ذینیہ اکیلی کالج گئی ہوئی تھی، کافی دیر ہو گئی مگر ذینیہ گھر نہ آئی تو مجھے پریشانی ہونے لگی۔ کوئی تھا نہیں کہ جسے بھیج کر پتہ کرواتی، گھنٹہ دو گھنٹے گزرے، عائشہ نے رونا شروع کر دیا اتنے میں کسی انجان نمبر سے فون آیا، میں نے اٹھایا تو دوسری طرف وہی منحوس بولا کہ ذینیہ اس کے پاس ہے، اگر صحیح سلامت چاہئے تو رشتے کے لئے ہاں کر دیں، میری تو جان ہی نکل گئی، کیا کرتی بیٹی کو بچانے کے لئے ہاں بول دی۔ پھر اللہ کا شکر تھوڑی دیر میں ذینیہ گھر آ گئی، اس کی تو رو رو کے آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کے ابو کا فون آیا تو میں نے فوراً انہیں واپس آنے کو کہا اور سب کچھ بتا دیا۔ انہوں نے ادھر سے اپنے دوست کو فون کیا اور فوراً پہلی فلائٹ سے واپس آ گئے''۔
''خالہ اتنا کچھ ہو گیا اور آپ نے ہمیں بتایا تک نہیں، فون تو کیا ہوتا، میں اور ابو آ جاتے''۔ جہان نے پریشانی سے پوچھا۔
''بس بیٹا! پریشانی میں کہاں کچھ یاد رہتا ہے کبھی کبھی سب مشکلیں اکٹھی ہی آجاتی ہیں، اس منحوس کی وجہ سے سارا دن عذاب میں گزرتا تھا، اسی دوران ذینی کا موبائل بھی گر کر ٹوٹ گیا، سب نمبر اسی میں تھے، زبانی کہاں نمبر یاد رہتے ہیں، پھر اس کے ابو آئے تو ان کا دوست اپنی فیملی کے ساتھ آ گیا اور ہم لوگوں نے ذینی کے فرضی نکاح کی اطلاع محلے میں دی اور سامان سمیٹنا شروع کر دیا کہ ہم لوگ اس کے ابو کے ساتھ ہی باہر شفٹ ہونے لگے ہیں''۔
''تو وہ آرام سے بیٹھا رہا کیا؟'' خالہ کو حیرت ہوئی۔
''جتنے میں وہ کچھ کرتا، ہم سامان باندھ کے اس گھر کو چھوڑ کے یہاں آ گئے، ایک دن میں ہی وہاں سے

یہاں، نہ کسی کو ایڈریس دیا نہ کوئی نمبر، اس کے ابو نے سم بھی نئی لے لی اور دوست کو کہہ کر وہ گھر بکوا دیا۔ اس کے ابو کی تو پوری مرضی تھی کہ ہم تینوں ان کے ساتھ ہی چلیں مگر میں نے انکار کر دیا کہ اپنا ملک، اپنی مٹی چھوڑ کر اس عمر میں کیوں پرائے ملک میں لے جانا چاہتے ہیں، میں تو باقی سانسیں بھی یہیں لینا چاہتی ہوں، پھر اس کے ابو مان گئے اور اکیلے واپس گئے مگر ان کی تسلی نہ ہوئی کہ ہم یہاں اکیلے ہیں، اس لئے جلد ہی واپس آ گئے اور یہاں دکان ڈال لی کپڑے کی، اللہ کا شکر ہے کہ اس منحوس کی دوبارہ صورت نظر نہیں آئی''۔ امی نے بتاتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا۔

''چلو اچھا ہوا جان چھوٹی اس عذاب سے، اللہ سب کو ایسی آزمائشوں سے بچائے''۔ خالہ شازیہ نے کہا۔

''دیکھو ذرا عائشہ کو اندر جا کے بیٹھ گئی ہے، کوئی چائے پانی کا بندوبست نہیں کیا، ٹھہرو میں دیکھتی ہوں''۔ امی کو اچانک خیال آیا تو وہ بولتی ہوئی اٹھیں۔

''ارے آپا! رہنے دیں ہم کون سا کوئی مہمان ہیں''۔

''ارے نہیں نہیں تم بیٹھو میں بس ابھی آئی''۔ امی نے انہیں ٹوکتے ہوئے کہا اور کچن کی طرف بڑھیں۔

''ذینی بیٹا! اپنا خیال رکھا کرو، ہڈی کوئی بھی ہو ایک بار ٹوٹ جائے تو احتیاط لازمی کرنی چاہئے''۔ خالہ نے ذینی کے پاس بیٹھتے ہوئے سے سمجھایا۔

''امی! اتنی عقل ان کو کہاں سے آئے''۔ جہان نے ماحول کی سنجیدگی کو ختم کرنے کی غرض سے ذینی کو چھیڑا۔

''جی ہاں ساری عقل کا اسٹاک تو آپ کے پاس ہی ہے ناں''۔ ذینی نے اسے گھورتے ہوئے جواباً کہا تو خالہ بھی مسکرائیں۔

''بس اب لڑنا شروع مت کرو، بالکل بچوں والی حرکتیں ہیں تم دونوں کی''۔ خالہ نے لاڈ سے ڈانٹا تو دونوں مسکرانے لگے۔

☆..........☆..........☆

''بھئی ڈاکٹر صاحب! اب آپ دلہن لے ہی آئیں''۔ وہ سب شام کی چائے پی رہے تھے لان میں بیٹھ کے جب اچانک دادا جی نے جہان کو مخاطب کیا۔

''میں تو کہہ کہہ کر تھک گئی ہوں، میری تو سنتا نہیں یہ، آپ ہی زبردستی کریں ابا جی''۔ اپنا من پسند موضوع کھلتا دیکھ کر امی فوراً بولیں تو جہان اور ابو مسکرائے۔

''کیوں برخوردار! کیوں ماں کو ستاتے ہو، کیا ارادے ہیں ارینج کرو گے یا کوئی Love کا چکر ہے''۔ دادا جی نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

''میں آپ لوگوں کو لڑکی ڈھونڈنے کے مسئلے میں نہیں ڈالنا چاہتا، بس آپ لوگ لو کو ارینج کروا دیں''۔ جہان نے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے بڑے سنجیدہ انداز میں اطلاع دی تو سب چونکے۔

''کون ہے وہ، کہاں رہتی ہے، نام کیا ہے اس کا؟'' سب کی طرف سے سوال آئے تو وہ سٹپٹا گیا۔

''ان سوالوں کا صرف یہ جواب ہے کہ امی آپ تین دن پہلے اس سے ملی ہیں''۔ جہان نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ایکدم چونکیں۔

''واقعی... ''انہیں خوشی ہوئی اس کی پسند جان کر۔
''بھئی یہ ماں بیٹا کیا کوڈ ورڈ میں بات کر رہے ہو، کوئی ہمیں بھی تو بتائے، کس سے ملی ہو، کون ہے وہ؟'' دادا جی نے دونوں کو باری باری دیکھا تو متجسس ہو کر پوچھا۔
''آپ بھی ملیں گے تو بہت خوش ہوں گے دادا جی، وہ ہے ہی ایسی''۔ جہان نے دادا کا ہاتھ تھامتے ہوئے یقین دلایا تو حلیمہ خوشی سے اچھلی۔
''مجھے پتہ چل گیا بھائی! آپ ذینیہ آپی کی بات کر رہے ہیں ناں''۔ حلیمہ چہکی تو وہ جواباً مسکرایا۔
''تو پھر ہم کل ہی چلیں گے اور رشتہ پکا کر کے آئیں گے، کیوں بیٹا؟'' دادا جی نے فوراً فیصلہ کیا اور فاطمہ سے تائید چاہی تو وہ بھی خوشی سے مسکرا دی۔

☆............☆............☆

اس بار کی چوٹ چونکہ کچھ شدید نوعیت کی تھی اس لیے پلستر 8 ماہ بعد کھلنا تھا، ابھی صرف ایک ہفتہ ہی گزرا تھا بمشکل اور وہ اس پلستر سے شدید تنگ آ گئی تھی۔ ایک ہی جگہ بیٹھنا اور بیٹھے رہنا یا پھر لیٹ جانا، سخت کوفت ہو رہی تھی اسے۔ ابو نے اس کے لیے وہیل چیئر لی تھی تاکہ وہ باآسانی اندر باہر آ جا سکے کیونکہ 10-8 ماہ بغیر چلے گزارنا آسان کام نہیں تھا۔ پڑھائی کے دنوں میں وہ رسالے پڑھنے کے لیے فارغ وقت تلاشتی تھی اور اب جب وقت ہی وقت تھا تو ہر وقت رسالے پڑھنے کا بھی دل نہیں کرتا تھا۔ اس کے لیے جو ڈاکٹر کا رشتہ آیا ہوا تھا اس کے جواب کے لیے رشتے کروانے والی خالہ اور ڈاکٹر کی والدہ کل آئی تھیں، یہاں آ کے اور ذینیہ کی ٹانگ کے بارے میں جان کے لڑکے کی والدہ کے تاثرات کچھ روکھے پھیکے سے ہو گئے، وہ لوگ جلد ہی چلی گئیں۔ پھر شام کو ان کی طرف سے انکار بھی آ گیا۔
رشتے کروانے والی کا کہنا تھا کہ دو بار ٹانگ ٹوٹ چکی ہے اب کیا گارنٹی ہے کہ دوبارہ نہ جوڑ کھلے، ہمیں تو لنگڑی بہو نہیں چاہیے، رشتے کروانے والی خاصی منہ پھٹ خاتون تھی لفظ بہ لفظ ان کے الفاظ دہرائے بغیر کسی لحاظ کے۔ امی کو تو سخت غصہ آیا۔ امی نے رشتے والی خاتون کو خاصی سخت سنائیں اور یہی تمام الفاظ ابس ڈاکٹر کی والدہ تک پہنچانے کا بھی کہا۔
''سمجھ کیا رکھا ہے ان لوگوں نے، اپنی بیٹی نہیں ہے تو کیا وہ دوسروں کی بیٹی کو جو دل چاہے گا کہہ دیں گے''۔ اس وقت سے امی کا موڈ خراب تھا، کسی نے بھی انہیں چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔
ابھی بھی ذینیہ ناشتے کے بعد سے اپنے کمرے میں تھی دھوپ نہیں نکلی تھی ورنہ وہ صحن میں چلی جاتی، موسم کافی سرد اور خنک تھا، دھند ہنوز موجود تھی۔ ذینیہ اپنی وہیل چیئر کھڑکی کے پاس رکھے، کھڑکی سے پار نظر آتے مین گیٹ کو دیکھتے ہوئے نجانے کہاں کھوئی ہوئی تھی، جب اچانک ڈور بیل کی آواز نے اسے چونکایا، بیل کا انداز عام روٹین سے قدرے مختلف تھا، عام طور پر آنے والے سنگل بیل بجاتے تھے مگر یہ ٹریپل بیل بجی تھی، ذینیہ کچھ سوچتے ہوئے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ عائشہ نے آ کے دروازہ کھول دیا، سامنے جہان، شازیہ خالہ، فاطمہ آپی، حلیمہ اور ایک بارعب سے بزرگ کھڑے تھے جو یقیناً جہان کے دادا تھے۔ امی نے انہیں لاؤنج میں بٹھایا۔
ذینیہ نے بھی دوپٹہ ٹھیک کیا اور وہیل چیئر دھکیلتی لاؤنج میں چلی آئی۔ حلیمہ اور فاطمہ اتنے عرصے بعد سب

سے مل کر بہت خوش تھیں۔ جہان کے تعارف کروانے کے بعد اس کے دادا بڑے پیار بھرے اور دوستانہ انداز میں ذینیہ کے ساتھ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، ذینیہ کو حیرت ہوئی کہ اس عمر میں بھی وہ اتنے فریش اور زندہ دل ہیں۔ امی اور خالہ شازیہ دور صوفے پر بیٹھی آہستہ آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ کہیں کہیں ان کی آواز اونچی ہوتی تو ذینیہ جو ادھر ہی دھیان رکھے بیٹھی تھی، غور سے سن رہی تھی وہ دونوں فاطمہ کی شادی اور اس کے سسرال والوں کی باتیں کر رہی تھیں۔

''میری بڑی خواہش تھی کہ ان دونوں کی شادی اکٹھی ہو، ایک بیٹی رخصت کروں تو ساتھ ہی دوسری بیٹی گھر لے آؤں، حلیمہ تو ابھی پڑھ رہی ہے اس لئے تھوڑا بہت ہی گھر کا کام کاج کرتی ہے، مگر میری فاطمہ نے تو میرے ساتھ پورا گھر سنبھالا ہوا ہے، اس لئے میں نے سوچا کہ جہان کا بھی ساتھ ہی سوچوں''۔ شازیہ خالہ امی کو بتا رہی تھیں اور ذینیہ چونک گئی یعنی جہان کی بھی شادی ہو رہی ہے۔

''ذینیہ بیٹا! لگتا ہے ہماری باتوں سے بور ہو رہی ہے''۔ دادا جی نے اس کی عدم توجہی کو فوراً محسوس کر لیا تو وہ بدقت مسکرائی۔

''ارے نہیں دادا جان! مجھے تو بڑی خوشی ہوئی ہے آپ سے مل کر، انفیکٹ آپ کی بدولت میں کافی عرصے بعد اتنا مسکرائی ہوں اور اتنی باتیں کی ہیں میں نے''۔ اس نے مسکراتے ہوئے فوراً ان کی غلط فہمی دور کی اور انہیں یقین دلانا چاہا۔

''اچھا کیوں، پہلے آپ کے باتیں کرنے پر پابندی تھی کیا؟'' جہان نے اس کی بات کو فوراً پکڑا۔

''پابندی تو نہیں تھی مگر کوئی باتیں کرنے والا بھی تو نہیں تھا، ابو دکان پر، امی کاموں میں مصروف اور عائشہ تو بس پڑھنے میں ہی لگی رہتی ہے، ایسے میں، میں کس سے باتیں کروں''۔ ذینیہ کے لہجے میں محسوس کی جانے والی بے چارگی تھی، دادا جی نے بغور اس کے چہرے پر پھیلی اداسی اور تنہائی کی داستان کو پڑھا۔

''تو تم بھی آگے پڑھائی شروع کر دیتیں''۔ جہان نے کہا تو وہ مسکرائی۔

''آگے پڑھائی... تم تو جانتے ہی ہو کہ میں کتنی پڑھنے کی شوقین ہوں''۔ اس نے مسکرا کر ''کتنی'' پر زور ڈالتے ہوئے کہا تو جہان نے قہقہہ لگایا۔

''آئی نو ویری ویل، مجھے یاد ہے بی اے کی اسائمنٹس بناتے وقت تم کیسی شکلیں بناتی تھیں اور کس دل سے پڑھتی تھیں، مجھے تو امید بھی نہیں تھی کہ تمہارا BA کلیئر ہوگا، مگر تم نے یہ MA کیسے کر لیا؟'' جہان کے حیرانگی کے اظہار پر وہ مسکرائی۔ دادا جی بھی مسکراتے ہوئے ذینیہ کے مسکراتے چہرے کو اور گالوں پر پڑنے والے ڈمپل کو دیکھ رہے تھے، انہیں یہ بے ریا اور سادہ سی لڑکی اپنے اکلوتے پوتے کے لئے بہت پسند آئی تھی۔

جس وقت شازیہ خالہ نے امی سے جہان کے لئے ذینیہ کا ہاتھ مانگا اس وقت ذینیہ جہان سے بات کر رہی تھی، اس لئے سن نہ سکی۔ امی کو بڑی خوشی ہوئی شازیہ خالہ کی بات سن کر، انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور ذینیہ کے ابو سے بات کرنے کا وقت مانگا۔

''جہان کے ابو کی بھی بڑی مرضی تھی آنے کی مگر انہیں ضروری کام سے جانا تھا، وہ کہہ رہے تھے کہ تم بات کر آؤ پھر ایک بار رشتہ پکا کرنے سب ساتھ جائیں گے''۔ شازیہ خالہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھیں۔

''بیٹا! آپ کو کیا کرنا زیادہ اچھا لگتا ہے، مطلب کیا ہابی ہے آپ کی؟'' دادا جی نے زینیہ سے سوال کیا تو جہان کی آنکھیں چمکیں۔

''معصوم لوگوں کو گھورنا اور آنکھوں سے ہی نگل جانا سب سے بڑی ہابی ہے ان کی''۔ زینیہ کے بولنے سے پہلے ہی جہان نے گل فشانی کی تو جواباً زینیہ نے اسے گھورا۔

''دیکھا دیکھا دادا جی، ٹھیک کہا ہے ناں میں نے''۔ جہان نے فوراً اس کے گھورنے پر دادا جی کو متوجہ کیا تو وہ مسکرا دیئے۔

''تمہاری ماں ٹھیک ہی کہتی ہے، تم اسی طرح پہلے بھی اسے تنگ کرتے ہو گے، ہے ناں زینیہ!'' دادا جی نے زینیہ کی تائید چاہی۔

''جی بالکل، ہر وقت یونہی الٹی سیدھی باتیں کر کے ستاتا رہتا تھا یہ مجھے''۔ زینیہ نے فوراً دادا جان کو جہان کی شکایت لگائی تو اس نے بھنویں اچکا ئیں۔

''لگاؤ لگاؤ جتنی شکایتیں لگانی ہیں لگاؤ، کچھ فرق نہیں پڑتا مجھے''۔ جہان کرسی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے مزے سے بولا۔

''بھئی زینیہ! ہم تمہارے ساتھ ہیں، تم بے فکر ہو جاؤ اب اگر اس نے تمہیں تنگ کیا تو ہم اس کے کان کھینچیں گے''۔ دادا جی نے زینیہ سے کہا تو جہان فوراً سیدھا ہوا۔

''ارے دادا جی! یہ کیا آپ پارٹی بدل رہے ہیں''۔ جہان نے احتجاجی انداز میں پوچھا۔

''بھئی ہم ظلم اور ظالم کے خلاف مظلوم کا ساتھ دینے کے حق میں ہیں اور یہاں ہم اپنی بیٹی کے ساتھ ہیں''۔ دادا جی نے مسکراتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا اور زینیہ کا ہاتھ تھاما تو جہان نے زینیہ کو گھورا جو لب دبائے اپنی ہنسی کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''وہ تو خود آنا چاہ رہی تھیں مگر آپ کو تو پتہ ہے ناں کہ گھر میں ایک شادی ہو تو کتنے کام ہوتے ہیں، وہ تو پھر ایک بیٹی رخصت کر رہے ہیں اور بہو لا رہے ہیں، دوہرے کام ہیں گھر میں، مہمان بھی آ رہے ہیں اس لئے ان کی طرف سے کارڈ میں لے آئی، یہ رہے آپ کے لئے دونوں کارڈ، آنا لازمی ہے آپ سب نے، ہمارے اسپیشل مہمان ہیں آپ لوگ''۔ شازیہ خالہ نے بولتے ہوئے بیگ میں سے شادی کے دو خوبصورت کارڈ نکال کے امی کے سامنے ٹیبل پر رکھے۔

''جی انشاء اللہ ضرور، ہم پوری کوشش کریں گے کہ آپ کی محبتوں کا پورا جواب دے سکیں''۔ امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ زینیہ نے ان دونوں کا یہ مکالمہ با آسانی سنا کیونکہ شازیہ خالہ کی آواز کچھ بلند تھی، اس کے دل کو کچھ ہوا، نجانے جہان کی شادی کا سن کر اس کا دل کیوں بیٹھا جا رہا تھا۔

''زینیہ تم نے بھی ضرور آنا ہے شادی پر، میں انتظار کروں گی، اچھا''۔ خالہ شازیہ نے اچانک اسے مخاطب کر کے تاکید کی تو وہ صرف سر ہلا کے رہ گئی، کچھ دیر پہلے والی خوشی غائب ہو گئی تھی، اسے لگا جیسے ابھی وہ رو دے گی۔

''اچھا زینیہ وہ...''

''ایکسکیوزمی دادا جی!'' دادا جی اپنے دھیان میں کچھ بولنے لگے تھے کہ زینیہ سر جھکائے ایکسکیوز کرتی تیزی سے ویل چیئر دھکیلتی اندر کی طرف بڑھ گئی اور پیچھے دادا جی اسے دیکھتے رہ گئے۔

''اسے کیا ہوا؟'' دادا جی نے جہان سے پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کندھے اچکائے، دادا جی نے کچھ دیر بعد اسے اندر جانے کا اشارہ کیا تو وہ اٹھ کے اندر کی طرف بڑھا۔

وہ اندر کمرے میں کھڑکی کے قریب خاموشی سے بیٹھی تھی، جب جہان دروازہ کھول کے اندر آیا اور اس کے قریب آ پہنچا، اس کی طرف اُس کی پشت تھی۔

''تم رو رہی ہو؟'' جہان نے اس کے انداز سے اندازہ لگایا تو وہ اس کی آواز پر چونکی اور تیزی سے آنسو پونچھے۔

''نہیں تو، میں کیوں روؤں گی؟'' اس نے آنسو پیتے ہوئے بمشکل کہا تو اس کے سامنے آیا اور اس کی پلکوں پر اٹکے آنسو کو انگلی کی پور پر اٹھایا تو اس نے بے اختیار اسے دیکھا۔

''تم رو تو نہیں رہی ہو ناں''۔ اس نے اپنی انگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ سر جھکا گئی، وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے جو تمہیں رُلا رہی ہے، مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟'' جہان نے اس کے یخ ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا تو اس نے بمشکل خود کو سنبھالا اور اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں ہے بس، ٹانگ میں پین ہے''۔ اس نے اسے ٹالنے کے لئے بات بدلی۔

''تو پھر یہاں کیوں بیٹھی ہو، آرام کرلو''۔ جہان نے مشورہ دیا۔

''نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں، تم جاؤ دادا جی ویٹ کر رہے ہوں گے، میں نے لیٹنا ہوا تو لیٹ جاؤں گی، ڈونٹ وری''۔

''میں تم سے بہتر تمہیں جانتا ہوں، سمجھی''۔ اس نے اس سے بولتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے کھڑا کیا، ذنیعہ نے اپنی بیساکھی کا سہارا لینا چاہا مگر جہان اپنے مضبوط بازو کا سہارا دے کر اسے بیڈ تک لایا اور احتیاط سے بیڈ پر لٹایا پھر کمبل اس کے اوپر برابر کیا۔

''ساری فضول سوچیں ذہن سے نکال کے ریلیکس ہو کر سو جاؤ، اوکے''۔ اس کے پاس بیٹھ کر پیار سے بولتا اس کا ہاتھ تھپتھپا کر لائٹ آف کر کے باہر چلا گیا اور وہ اسے جاتا دیکھتی رہ گئی، نیند تو آنکھوں سے کوسوں دور جا چکی تھی۔

☆..........☆..........☆

رات کو کھانے کے بعد امی ابو بیٹھ کے نجانے کیا باتیں کرتے رہے۔ ان دونوں کو تجسس ہو رہا تھا مگر جلد ہی ان کا تجسس تمام ہوا کیونکہ امی آ گئی تھیں، پھر جو انہوں نے ذنیعہ سے سوال کیا تو وہ پلکیں جھپکانا ہی بھول گئی، شازیہ خالہ نے ذنیعہ کا رشتہ دیا تھا یہ بات سن کر ذنیعہ شاک میں تھی۔ امی نے اسے خاموش دیکھ کر دوبارہ پوچھا کہ اسے کوئی اعتراض تو نہیں، جواباً وہ خاموش رہی، اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ کیا کہے۔ اسے اگر اقرار نہیں تھا تو انکار بھی تو نہیں تھا۔ دل کی جس کیفیت کو وہ سمجھ نہ پا رہی تھی وہ پیار ہی تو تھا، امی نے اس کی خاموشی کو مشرقی لڑکی کا اقرار سمجھا اور مسکراتے ہوئے اٹھ کے چلی گئیں۔

پھر امی نے ابو کی رضامندی سے شازیہ خالہ کے پوچھنے پر ہاں کر دی نتیجتاً ہفتے بعد کی منگنی کی تاریخ طے پا گئی۔ اس دوران ذنیعہ کی جہان سے ملاقات نہ ہو سکی، 14 کو ان کی منگنی اور 16 کو فاطمہ کی رخصتی تھی اس لئے جہان بزی تھا۔

پھر دن تیزی سے گزرے اور 14 تاریخ آ گئی، منگنی کا جوڑا جہان کی پسند کا آیا تھا، وائٹ نیٹ کا لمبا فراک سرخ نگینوں سے سجا، اس کے ساتھ سرخ خوبصورت نگوں والا دوپٹہ، منگنی کے اس جوڑے میں ذینیہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی، شاذیہ خالہ نے جہان کو اس کے ساتھ بٹھا دیا پھر دادا جی نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے منگنی کی انگوٹھی پہنائی اور امی نے جہان کو۔ سب نے اس خوشی کے موقع پر ایک دوسرے کو مبارکباد دی، پھر اکٹھے بیٹھ کے کھانا کھایا گیا۔ بعد میں عائشہ، حلیمہ اور فاطمہ ذینیہ کی ویل چیئر تھامے اسے لان میں لے آئیں۔

وہیں ایک طرف جہان کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، انہیں دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔

''یہ لیں آپ کی امانت جہان بھائی! آپ کا کام تو ہو گیا، اب ہمارا انعام''۔ جہان کو دیکھتے ہی عائشہ اور حلیمہ آگے بڑھیں اور بولتے ہوئے جہان کے آگے ہاتھ پھیلائے تو اس نے مسکرا کے ان کے ہاتھوں پر ڈیری ملک کا ڈبہ رکھتے ہوئے شکریہ ادا کیا تو وہ دونوں ہنستے ہوئے اندر بھاگ گئیں، جہان ویل چیئر کی طرف آیا جہاں ذینیہ کے پاس فاطمہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''میں اتنے میں نہیں مانوں گی''۔ وہ شرارت سے مسکرائی۔

''تمہارے لئے تو میری جان بھی حاضر ہے، بولو کیا چاہیے؟'' جہان نے فاطمہ کو پیار سے ساتھ لگا کے سر پر بوسہ دیا اور پیار سے پوچھا۔ اسے اپنی یہ معصوم اور خاموش طبع بہن بہت اچھی لگتی تھی۔

''میری ذینیہ کچھ خاموش سی ہے، بے بی اداس یا پریشان ہے، ان کے چہرے پر مسکراہٹ لا دیں''۔ فاطمہ کی فرمائش پر وہ بے اختیار مسکرایا۔

''یہ کون سا مشکل کام ہے جناب!'' وہ مسکرا کے کہتے ہوئے اس کے سامنے آیا۔

چہرے پہ بناوٹ کا غصہ، آنکھوں سے جھلکتا پیار بھی ہے
اس ادائے عشق کو کیا کہیں، انکار بھی ہے اور اقرار بھی ہے

جہان کے اس شعر پر اس کے چہرے پر شرمیلی سی مسکان ٹھہر گئی، فاطمہ اسے دیکھ کر مسکرائی اور بھائی کو تھینک یو بول کے اندر چلی گئی۔

''اچھا تو مس ذینیہ جہان ابراہیم ملک! کیوں ہماری ہمشیرہ کو آپ کے چہرے پر اداسی اور پریشانی کے رنگ دکھائی دیئے، وجہ جان سکتے ہیں ہم؟'' جہان نے اس کے سامنے کرسی رکھ کے بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''ابھی صرف ذینیہ رحمان احمد''۔ ذینیہ نے تصحیح کی تو اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''وہ کیوں، منگنی تو ہو گئی ہے ناں''۔ جہان نے حیرانگی سے پوچھا تو وہ مسکرائی۔

''صرف منگنی سے تو سرنیم نہیں بدلتا''۔ ذینیہ کے جواب پر جہان مسکرایا، وہ پھر بات بدل گئی تھی۔

''اچھا تو پھر مس ذینیہ صاحبہ میرے سوال کا جواب تو دیں''۔ جہان واپس اسی سوال پر آیا، اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

''اداس نہیں مگر کچھ پریشان تھی اور پریشان بندہ تو ویسے ہی اداس لگنے لگتا ہے بالکل ان پودوں کی طرح''۔ ذینیہ نے کیاری میں لگے گلاب کے سوکھے پودے کو دیکھتے ہوئے کہا، شدید سردی کی وجہ سے گلاب تو کیا سبھی پودے مرجھا گئے تھے۔

''کیا پریشانی ہے تمہیں؟'' وہ فکر مند ہوا۔

''یہی کہ تم سب کچھ جانتے ہوئے بھی کیوں مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' زینیہ نے گود میں رکھے ہاتھوں پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا تو وہ حیران ہوا۔

''شادی اس لیئے کرنا چاہتا ہوں کیونکہ آئی لو یو یار! بٹ وٹ ڈو یو مین بائے سب کچھ جانتے ہوئے؟''

جہان کے سوال پر اس نے اس کی طرف دیکھا۔

''دو بار میری ٹانگ ٹوٹ چکی ہے، کیا گارنٹی کہ کب تک... اسی وجہ سے ایک رشتہ بھی آیا اور انکار ہو گیا کہ لنگڑی بہو کا کیا کرنا، ٹھیک ہی تو کہتے ہیں سب ایک لنگڑی لڑکی کو کون بیاہنا چاہے گا، مگر تم کیوں؟ میں کسی پر بوجھ بننا نہیں چاہتی جہان''۔ زینیہ کی بولتے بولتے آواز رندھ گئی اور اس نے سر جھکا لیا، جہان کے دل میں غصہ اور دکھ کی کیفیات ایک ساتھ ابھریں۔

''ابھی تک ویسی ہی بیوقوف ہو تم زینی! تم سے پیار کرتا ہوں، اب سے نہیں اتنے سالوں سے، یہاں سے جانے کے بعد بھی صرف تمہیں ہی سوچا اور یاد کرتا رہا، پھر کیسے تم نے ایسا سوچا اور پھر تم سے کہا تھا ناں کہ لنگڑی کو کوئی بیاہنے نہیں آئے گا اسی لیئے خود آ گیا کہ یہ بار بار ٹانگ تڑوانے والی صرف اس ڈاکٹر کی ہی ہے، اسپیشل مریض اور ویسے بھی جن سے پیار کرتے ہیں وہ بوجھ نہیں ہوتے بلکہ ان کے ساتھ ان کے دکھ اور بوجھ شیئر کیئے جاتے ہیں، تم کیوں نیگیٹو سوچتی ہو، چھوڑو جو چلے گئے، ہیرے کی قدر تو جوہری ہی جانتا ہے ناں''۔ اسے سمجھاتے ہوئے آخر میں شرارت سے مسکرایا تو وہ جھینپ گئی۔

''ویسے اس دن روئی کیوں تھیں؟'' جہان نے لگے ہاتھوں پوچھ ہی لیا۔

''غلط فہمی ہو گئی تھی ایک مگر وہ اسپیشل آنسو تھے''۔ زینیہ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''اسپیشل آنسو... وہ کون سے ہوتے ہیں؟'' جہان نے دلچسپی سے پوچھا۔

''کبھی کبھی آنسو مسکراہٹ سے زیادہ اسپیشل ہوتے ہیں، کیونکہ مسکراہٹ تو سب کے لیئے ہوتی ہے مگر آنسو صرف ان کے لیئے ہوتے ہیں جنہیں ہم کھونا نہیں چاہتے''۔ زینیہ نے بتایا تو جہان نے بڑی گہری نظر سے اس کے چہرے کو دیکھا جہاں خوشی دھنک کے تمام رنگوں کے ساتھ موجود تھی۔

''او... مطلب میرے لیئے تھے وہ آنسو، ویل تھینک یو ڈیئر زینی فار یور لو''۔ جہان نے گمبھیر لہجے میں بولتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیئے۔

''سوئٹ زینیہ منگنی مبارک ہو''۔ جہان نے پیار بھرے انداز میں بولتے ہوئے ایک خوبصورت سا ریڈ ریپر میں لپٹا گفٹ اس کے ہاتھوں میں رکھا تو زینیہ حیران ہوئی پھر مسکرائی، جہان نے اسے گفٹ کھولنے کا کہا تو اس نے پیار سے اس خوبصورت پیکنگ کو بڑی احتیاط سے کھولا، پیکنگ اتار کے ڈبہ کھولا تو بے اختیار ہنسی۔

''یہ... یہ پیالی... یہ کیسا گفٹ ہے؟'' اس نے پیالی کو ڈبے سے نکالا۔ سفید رنگ کی بڑے سائز کی پیالی تھی جس کا خوبصورت سرخ بارڈر تھا، زینیہ نے حیرت سے جہان کو دیکھا۔

''ہماری آخری لڑائی تو یاد ہے ناں تمہیں، میں نے تمہاری وہ پسندیدہ پیالی توڑ دی تھی''۔

''تم نے جان کے تو نہیں توڑی تھی''۔ زینیہ نے فوراً تردید کی، وہ مسکرایا۔ دو سال پہلے وہ اسے ہی قصوروار ٹھہرا کے ناراض ہو گئی تھی اور اب اسے بری الذمہ قرار دے رہی تھی۔

''مگر وجہ تو میں ہی بنا تھا ناں اس کے ٹوٹنے کی، اس لیئے میں ہمیشہ سوچتا رہا کہ کبھی نہ کبھی ضرور تمہیں تمہاری

پیالی لوٹاؤں گا، اب یہ میری طرف سے میرے پیار کا ثبوت ہے تمہارا گفٹ''۔ جہان محبت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تو اس نے مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔

''بہت پیارا گفٹ ہے، میں اسے کبھی خود سے جدا نہیں ہونے دوں گی''۔ زینیہ پیالی کو دیکھتے ہوئے بولی تو وہ مسکرایا۔

''پتہ ہے مجھے یہ پیالی دادا جی نے دی ہے، یہ اصل میں میری دادی جان کی پیالی تھی، اس میں وہ روز غریبوں کو آٹا اور چاول دیا کرتی تھیں، ان کے بعد دادا جی نے اسے بہت سنبھال کے رکھا اور آج مجھے دے دی تمہیں دینے کے لئے، کیونکہ تم بھی دادی جی کی طرح غریبوں کا خیال رکھتی ہو''۔ جہان نے بتایا تو وہ حیران ہوئی اس حسین اتفاق پر، وہ بڑے غور سے پیالی کو دیکھ رہی تھی، اس نے اس کے ہاتھ تھام لئے۔

''سنو زینی!'' جہان کے پکارنے پر وہ چونکی اور اس کی طرف دیکھا۔

'زندگی کے سفر میں
ہر دکھ میں، ہر سکھ میں
چاہتا ہوں اک ایسا ساتھی
جو تھامے رکھے ہاتھ
اور نبھائے عمر بھر ساتھ
کیا تم بنو گی وہ ہمسفر!
بن کہے، جو جان لے
اس دل ناداں کی ہر بات
اور چاہے تم سے کچھ نہیں
فقط
ایک پیالی پیار'

جہان اس کے ہاتھ تھامے بول رہا تھا اور وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی، اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس کی زندگی میں اتنا خوبصورت موڑ بھی آئے گا۔

''کتنی یادگار ہے ناں ہماری منگنی، ویل چیئر پر لڑکی...'' جہان بولا۔

''گفٹ میں پیالی...'' وہ بھی شرارت سے بولی۔

ساتھ میں سرخ پھول کی پتیوں کی برسات۔ دونوں نے ایک ساتھ سر اٹھایا، عائشہ، حلیمہ، فاطمہ ٹیرس پر کھڑی مسکراتے ہوئے پھول نچھاور کر رہی تھیں، ان کے پیچھے باقی سب گھر والے بھی مسکرا رہے تھے۔

جہان نے مسکراتے ہوئے زینیہ کو دیکھا تو وہ حیا سے لال چہرے کو جھکا گئی۔ محبت کے اس دن دو محبت کرنے والوں کی نئی محبت بھری زندگی کی شروعات ہو گئی جس میں وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ ہر مشکل میں، ہر خوشی میں ساتھ رہیں گے۔

☆..........☆..........☆

فضائل قرآن

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

★ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن شریف کو سیکھے اور سکھائے۔

★ حق سبحانہ وتقدس کا یہ فرمان ہے کہ جس شخص کو قرآن شریف کی مشغولی کی وجہ سے ذکر کرنے اور دعائیں مانگنے کی فرصت نہیں ملتی، میں اس کو سب دعائیں مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ شانہ کے کلام کو سب کاموں پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی کہ خود حق تعالیٰ شانہ کو تمام مخلوق پر۔

★ حسد دو شخص کے سوا کسی پر جائز نہیں۔ ایک وہ جس کو حق تعالیٰ شانہ نے قرآن شریف کی تلاوت عطا فرمائی اور دن رات اس میں مشغول رہتا ہے دوسرے وہ جس کو حق سبحانہ نے مال کی کثرت عطا فرمائی اور وہ دن رات اس کو خرچ کرتا ہے۔

★ حق تعالیٰ شانہ اس کتاب یعنی قرآن پاک کی وجہ سے کتنے ہی لوگوں کو بلند مرتبہ عطا کرتا ہے اور کتنے ہی لوگوں کو پست و ذلیل کرتا ہے۔

★ قیامت کے دن صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا۔ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا۔ بس تیرا مرتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔

★ جو شخص ایک حرف کتاب اللہ کا پڑھے اس کے لئے اس حرف کے عوض ایک نیکی اور ایک نیکی کا اجر دس نیکی کے برابر ملتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارا (الم) ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف، میم ایک حرف ہے۔

★ جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل کرے اسکے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا جسکی روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ ہوگی اگر وہ آفتاب تمہارے گھر میں ہو۔ پس کیا گمان ہے تمہارا اس شخص کے متعلق جو خود عامل ہے۔

★ جس شخص نے قرآن پڑھا پھر اس کو حفظ یاد کیا اور اس کے حلال کو حلال جانا اور حرام کو حرام حق تعالیٰ شانہ اس کو جنت میں داخل فرماویں گے اور اس کے گھرانے میں سے ایسے دس آدمیوں کے بارے میں اس کی شفاعت قبول فرماویں کے جس کے لئے جہنم واجب ہو چکی ہو۔

★ جس شخص کے قلب میں قرآن شریف کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہیں وہ بمنزل ویران گھر کے ہے۔

★ دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جیسا کہ لوہے کو پانی لگنے سے زنگ لگتا ہے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ ان کی صفائی کی کیا صورت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ موت کو اکثر یاد کرنا اور قرآن پاک کی تلاوت کرنا۔

★ تم لوگ اللہ جل شانہ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جو خود حق سبحانہ سے نکلی ہے یعنی کلام پاک۔

★ جو شخص ایک آیت کلام اللہ کی سنے اس کیلئے دو چند نیکی لکھی جاتی ہے اور جو تلاوت کرے اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگا۔

★ کلام اللہ کو آواز سے پڑھنے والا علانیہ صدقہ کرنے والے کے مشابہ ہے اور آہستہ پڑھنے والا خفیہ صدقہ کرنے والے کی مانند ہے۔

★ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کلام پاک سے بڑھ کر کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا نہ کوئی نبی نہ فرشتہ وغیرہ۔

★ اگر تو صبح کو جا کر ایک آیت کلام اللہ شریف کی سیکھ لے تو نوافل کی سو 100 رکعات سے افضل ہے اور اگر ایک باب علم کا سیکھ لے خواہ اس وقت وہ معمول بہ ہو یا نہ ہو تو ہزار رکعات نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔

★ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو اطلاع دی کہ بہت سے فتنے ظاہر ہوں گے۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ ان سے خلاصی کی کیا صورت ہے انہوں نے کہا کہ قرآن شریف۔

بشریٰ مایا

ناولٹ

بن کے دعا تو مجھ کو ملا ہے

''دیکھو شانی! اب اس کو آف کر دو اور جلدی سے تیار ہو جاؤ یا ایسا کر و میں ہی کمپیوٹر آف......'' جمیلہ نے نا صرف وارن کیا تھا بلکہ آگے بڑھ کر کمپیوٹر کا سوئچ بھی آف کر دیا تھا۔ جس پر میں یعنی درخشاں



عرف شانی دو منٹ تک تو اسے گھورتی رہی اور پھر کمال اطمینان سے اپنا سیل فون اٹھا کر بیڈ پر دھم کر کے لیٹ گئی۔ کمپیوٹر آف ہونے پر فیس بک کا جو سلسلہ ٹوٹا تھا وہ سیل فون پر ایک بار پھر جڑ چکا تھا۔

''تمہیں اگر شاپنگ کے لیے نہیں جانا تو ویسے ہی بتا دو کم از کم میرا وقت تو برباد نہ کرو۔'' بجیلہ جو تیار ہو کر اسے لینے آئی تھی۔ اسے ایک بار پھر فیس بک پر مصروف دیکھ کر غصے سے بولی۔

''یار! اتنی گرمی ہو رہی ہے تھوڑی شام تو ہونے دو۔'' بجیلہ کا غصے سے سرخ چہرہ دیکھ کر میں آواز میں عاجزی بھر کر بولی۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو اگر ہم شام میں نکلیں گے تو واپسی تک رات ہو جائے گی جس کی اجازت ہمیں نہیں ہے۔ خیر اگر تم جانا چاہتی ہو تو دو منٹ ہیں تمہارے پاس۔ ورنہ پھر پہننا انصر بھائی کی شادی پر وہ ہی پرانے کپڑے۔'' وہ غصے سے بولتی جا چکی تھی۔ جب کہ میں اب تک بے فکری سے فیس بک پر مصروف تھی۔

شاپنگ کبھی میرا جنون ہوا کرتا تھا لیکن جب سے میری زندگی میں وہ یعنی آغا بدر خان آیا تھا



سارے شوق ادھورے رہ گئے تھے۔ اب یاد تھا تو صرف وہ۔

وہ میری بیسٹ فرینڈ نائلہ کا کزن تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا لاڈلا اور اکلوتا بیٹا ہونے کے ساتھ بے حد حسین بھی تھا لیکن یہ اس کا حسن نہیں تھا جس نے مجھے اپنا اسیر کیا تھا بلکہ اس کی باتیں اور آواز کا سحر تھا جس نے مجھے بری طرح سے اس کی گرفت میں جکڑ لیا تھا۔ اس کی آواز کانوں میں رس گھولتی سیدھی دل میں اتر جانے کی صلاحیت رکھتی تھی اور جس سے بات کرتے مجھے پھر کسی چیز کا ہوش نہ رہتا تھا۔

میں اپنے ماں باپ کی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی تھی۔ انہوں نے مجھے بے حد ناز و نعم سے پالا تھا لیکن بدر کو سامنے پا کر مجھے لگتا جیسے وہ فلک کا چاند اور میں زمین کا حقیر ذرہ۔ وہ بری طرح سے میرے اعصاب پر حاوی ہو چکا تھا۔ اس سے میری فیس بک پر دوستی کو دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور اب میں نے انصر بھائی کی دو ہفتے بعد ہونے والی شادی کی دعوت بھی بدر کو دے ڈالی تھی اور وہ آنے کا وعدہ بھی کر چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی سیل فون رکھ کر شاپنگ کے لیے ریڈی ہونے چلی گئی تھی۔ مجھے شادی میں سب سے حسین جو لگنا تھا۔

☆......☆

جب شاپنگ کر کے گھر آئی تو تھکن سے میرا برا حال تھا لیکن اس بات کی خوشی تھی کہ ایک ہی دفعہ میں، میں اپنی تمام تیاری مکمل کر چکی تھی۔ کچن میں کھڑی عفت بی کو اپنے لیے چائے کا آرڈر دے کر میں جھٹ سے اپنے کمرے میں چلی آئی اور کمپیوٹر آن کیا۔ بھلا بدر کو شاپنگ کی تفصیلات سے آگاہ کیے بنا مجھے چین آ سکتا تھا؟

فیس بک لاگ ان کرتے ہی میں نے آن لائن فرینڈز کی لسٹ دیکھی تھی اور بدر کا نام وہاں دیکھ کر میری ساری تھکن اتر گئی تھی اور میں یکدم فریش فیل کرنے لگی۔

''ہائے کیسے ہو؟ میں تو بری طرح تھک چکی ہوں۔'' میں نے جلدی جلدی ٹائپ کر کے ٹیکس بھیجا۔

''اُف کتنی دیر لگاتی ہو تم لڑکیاں شاپنگ میں۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' جواب فوراً آیا تھا۔

''اس کا مطلب تم مجھے مس کر رہے تھے؟'' میں نے خوش ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''بے حد......'' جواب مختصر تھا لیکن میرے لیے بہت اہم۔

''اچھا بتاؤ پھر کب آ رہے ہو؟'' میری تھکن تو اس سے بات کر کے کب کی اتر چکی تھی اور دل چاہ رہا تھا جلدی سے دن گزر جائیں اور وہ آ جائے۔

''شادی سے ایک دن پہلے۔ ورنہ دل تو چاہ رہا ہے ابھی چلا آؤں۔ اپنی پری سے ملنے۔'' اس نے شرارت سے اسمائلی کے ساتھ جواب دیا تھا۔ جب کہ میرا دل بے قابو ہونے لگا۔

☆......☆

مسلسل بجتی بیل نے مجھے اٹھنے پر مجبور کیا تھا۔ میں سیل فون نہ چاہتے ہوئے بھی ایک طرف رکھ کر گیٹ کھولنے باہر نکلی۔ ''پتہ نہیں بیل پر ہاتھ رکھ کے اٹھانا بھول جاتے ہیں کیا لوگ۔ حد ہے بدتہذیبی کی بھی۔'' میری بڑبڑاہٹ مسلسل جاری تھی۔

میں دروازہ کھول کر واپسی کے لیے مڑ گئی تھی۔ مجھے لگا تھا امی لوگ شاپنگ سے واپس آئیں ہوں گی لیکن میں غلطی تھی اور اس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب آنے والے نے آواز دے کر مجھے پکارا تھا۔ وہ آواز میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔ میرے قدم خود بہ خود تھمے تھے۔

''رک گئیں ہیں تو پلٹ کر بھی دیکھ لیں۔ ایک تو آدھے گھنٹے بعد دروازہ کھولا ہے اور اب بنا کچھ کہے یوں جا رہی ہیں جیسے آپ کی ٹرین چھوٹ جائے

گی۔"

"دیکھیے مسٹر! آپ جو کوئی بھی ہیں دادو کا کمرہ وہ سامنے ہے۔ سیدھے جائیں گے تو مل جائے گا اور ایک بات مجھے وہ لڑکے سخت زہر لگتے ہیں جو حسین لڑکیوں سے فری ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔" اپنی دانست میں، میں نے اسے دھمکایا تھا لیکن اگلے ہی پل اس کے قہقہے نے مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس دلایا تھا اور میں سرخ چہرہ لیے جھنجلاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

ابھی سیل فون ہاتھ میں لیے دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ عفت بی مجھے بلانے چلی آئی تھیں۔

"بی بی جی! آپ کو ماں جی بلا رہی ہیں۔" وہ دادو کو ماں جی ہی کہتی تھیں۔ مجھے ان کا پیغام دے کر وہ اگلے ہی پل واپس چلی گئی تھیں اور میں دوپٹہ سر پر سلیقے سے جمائے دادو کے کمرے کی طرف بڑھی۔ دادو سے مجھے بے حد محبت تھی اور وہ بھی مجھے بے حد چاہتی تھیں لیکن اس محبت کے باوجود مجھے ان سے ڈر بہت لگتا تھا۔

"السلام علیکم دادو۔" میں نے کمرے میں داخل ہو کر دادو کو سلام کیا اور اسی پل میری نظر ان کے تخت پر بیٹھے شخص پر پڑی تھی وہ اب سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"بیٹا! تم شہیر سے ملیں۔ اتنے سالوں بعد آیا ہے بچہ۔" دادو اسے پیار کرتے بولیں۔ میں سوچنے لگی تھی یہ شہیر آخر ہے کون، جسے دادو اتنا پیار کر رہی ہیں۔

"رہنے دیں دادو! انہیں کہاں یاد ہوں گا میں۔ اتنی سی تو عقل ہے ان کی۔" وہ شرارت سے کہتا میرے غصے کا گراف بڑھا گیا تھا اس کے چہرے پر پھیلی دبی دبی ہنسی میرا دل جلا گئی تھی۔ جب کہ میں دادو کے سامنے اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

"اے لو، تم تو جم ہی گئی ہو، جاؤ جا کے بچے کو کمرہ دکھاؤ اس کا اور سنو شانی! طویل سفر سے آیا ہے کھانے کا بھی پوچھ لو۔" دادو نے مجھے نیا حکم سنایا اور میں "جی اچھا" کہتے پلٹ گئی۔

"یہ رہا آپ کا کمرہ اور کسی چیز کی ضرورت پڑے تو عفت بی کو آواز دے لیجیے گا۔" میں نے سنجیدگی سے اسے مطلع کیا، گویا میں یہ جتانا چاہ رہی تھی مجھ سے کھانے کی فرمائش نہ کریں اور نہ ہی کسی اور چیز کی۔

"لیکن دادو نے تو آپ سے کہا تھا۔ خیر یوں کریں آپ صرف ایک کپ چائے بنا دیں مجھے۔"

"دیکھیے مسٹر! زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہ کریں۔ کہہ دیا ناں جو چاہیے عفت بی کو کہہ دیں۔" میں غصے سے کہتی جانے لگی تھی جب اس کی بات نے میرے قدم روکے، بات کیا تھی سیدھی سادی دھمکی دے رہا تھا وہ مجھے۔

"شانی! آپ کو دادو نے میرا خیال رکھنے کا کہا ہے اگر آپ نہیں رکھ سکتیں تو ٹھیک ہے میں دادو سے کہہ دیتا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولتا دادو کو شکایت کرنے جانے لگا۔

"رکیے! لا رہی ہوں آپ کے لیے چائے۔" مجبوراً مجھے حامی بھرنا پڑی تھی۔

"گڈ! یہ کی نا اچھی بچی والی بات۔" وہ مسکراتا ہوا اندر چلا گیا اور میں کچن میں۔

☆......☆

مجھے بعد میں پتا چلا کہ شہیر صاحب میرے اکلوتے ماموں کے اکلوتے فرزند ہیں جو کہ عرصہ دراز سے کویت میں رہتے ہیں لیکن اب ماموں نے بھی دوبارہ پاکستان شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دو دن بعد ماموں بھی مامی کے ساتھ پاکستان آ گئے تھے۔

امی تو بھائی، بھابی اور بھتیجے کی محبت میں بیٹی کو بھی بھول چکی تھیں۔ جب کہ دادو بھی شہیر کے واری صدقے جا رہی تھیں اور بجیلہ اور انصر بھائی کی تو دو

دن میں ہی شہیر سے بہت اچھی دوستی ہو چکی تھی۔

ان دنوں سب ہی شاید مجھے بھول چکے تھے۔ میرا سارا سارا دن فیس بک یوز کرنا بھی کسی کو نہیں کھٹکتا تھا اور میں خوش بھی بہت خوش۔ کل بدر لاہور آ رہا تھا۔ گو کہ اسے رکنا تو نائلہ کے گھر تھا لیکن پھر بھی میں بہت خوش تھی۔ بہت زیادہ۔ میرے لیے یہ ہی بہت تھا کہ وہ لاہور کی فضاؤں میں سانس لے رہا تھا اور کل انصر بھائی کے مایوں کے فنکشن میں نائلہ کے ساتھ وہ بھی آ رہا تھا۔

دو سال جس سے لاتعداد باتیں کیں اس کی تصویروں میں دیکھے چہرے سے خوابوں کو سجایا۔ وہ دشمن جان کل آ رہا تھا مجھ سے ملنے اور سب سے خوب صورت بات وہ بھی اتنا ہی بے قرار تھا مجھ سے ملنے کو جتنی میں تھی۔

☆......☆

گیندے کے پھولوں سے سجا لان اور فضا میں بسی خوشبو۔ اسٹیج پر سجے جھولے پر بیٹھے انصر بھائی اور ان سے مذاق کرتی بجیلہ اور شہیر۔ ایک طرف ڈھولک سنبھالے میری کزنز اور مما اور تائی جان، غرض ہر طرف رنگ تھے، خوشبو تھی اور خوشیاں تھیں جب کہ میں گہری سبز میکسی پہنے نفاست سے میک اپ کیے۔ بہت سے دلوں کی دھڑکن بنے ہوئے بھی مضطرب سی تھی وجہ وہ تھا جس کے انتظار میں، میں ٹھیک طرح سے فنکشن بھی انجوائے نہیں کر پا رہی تھی اور پھر وہ آ گیا تھا۔ بلیک کلر کے نفیس سے کرتے میں اس کی دودھیا رنگت دمک رہی تھی۔ وہ تصویروں سے زیادہ حسین لگ رہا تھا اس کے ڈارک براؤن سلکی بال بار بار اس کی آنکھوں پر گر رہے تھے۔ ایک لمحے کو مجھے اپنا دل رکتا محسوس ہوا تھا۔

وہ تھا ہی اتنا حسین مجھے اس کے حسن نے ہپناٹائز کر دیا تھا تب ہی مجھے نائلہ کی آواز نے چونکایا تھا۔

''یہاں کھڑی کس کا ویٹ کر رہی ہو۔ کیا کوئی خاص آنے والا ہے۔'' وہ شرارت سے بولی تھی۔

''نہیں...... جو خاص تھا وہ تو آ چکا ہے۔ خیر تم نے اتنی دیر کیوں لگائی؟'' میں ذو معنی انداز میں کہتی یکدم سیریس ہوئی تھی۔

''دیر...... اوہ ہاں یار بدر بھی تم سے ملنا چاہ رہے تھے۔ بس انہوں نے ہی دیر کی ہے۔'' اس نے تعارف کراتے کچھ شرمیلے انداز میں کہا تھا جب کہ میں اس کے انداز میں کافی حیران ہوئی تھی۔

''ارے تم اب تک وہاں کھڑی ہو شانی! ادھر انصر بھائی ضد کر رہے ہیں کہ وہ مہندی کی رسم کا آغاز اپنی لاڈلی بہن سے ہی کرائیں گے۔'' شہیر یوں بولے تھے جیسے میری ان سے بچپن کی دوستی ہو۔

''ویسے یہ کون ہیں۔'' اب شہیر نے نائلہ اور بدر کی طرف دلچسپی سے دیکھا تھا۔

''میں شانی کی بیسٹ فرینڈ نائلہ ہوں اور یہ بدر ہیں میرے کزن۔'' نائلہ نے مسکراتے ہوئے تعارف کرایا تھا۔

''اور میں شہیر، درخشاں کا کزن۔ کچھ دن پہلے ہی کویت سے آیا ہوں۔'' وہ خوش اخلاقی سے کہتا بدر سے ملا تھا اور ان لوگوں کو اچھے سے ویلکم کرتا، میرا ہاتھ تھام کے اسٹیج پر لے گیا تھا۔ میں اس کے اتنے فرینڈلی انداز پر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اسے خوب سناتی۔

مایوں کا فنکشن اختتام پذیر ہوا تو میں اتنی تھک چکی تھی کہ بیڈ پر لیٹتے ہی نیند کی وادیوں میں اتر چکی تھی اور بدر سے چاہنے کے باوجود یہ نہ پوچھ سکی کہ ہمیشہ تم تم کر کے بات کرنے والی نائلہ آج تم سے آپ جناب کر کے کیوں مخاطب تھی۔

☆......☆

دوسرے دن کیوں کہ شام کی برأت تھی اس لیے میں گیارہ بجے اٹھ کر کچن میں آئی تھی۔ ناشتے کی غرض سے امی اور تائی کچن میں مہمانوں کے ناشتے

میں مصروف تھیں۔ عفت بی بھی ان کے پاس کھڑی چائے تھرماس میں انڈیل رہی تھیں جب کہ بجیلہ ٹرے اٹھائے مہمانوں کو دے کر آرہی تھی۔

''لاؤ تم تھک گئی ہوگی یہ میں دے آتی ہوں۔'' میں نے سامنے رکھی ٹرے جس میں چائے، بوائل ایگ، جیم وغیرہ رکھا تھا اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اوکے، یہ شہیر کا ناشتا ہے اس کے بیڈروم میں دے آؤ۔'' بجیلہ نے کندھے اچکا کے یوں کہا جیسے مجھ پر احسان کر رہی ہو۔ جب کہ شہیر کا نام سن کر میرا دل بجھ گیا۔ ٹرے دوبارہ بجیلہ کو تھمادی لیکن ایسا کرکے میں کام چوری کا لمبا لیکچر نہیں سننا چاہ رہی تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ ٹرے اٹھائے چلی آئی تھی۔

میں دروازہ ناک کرکے جب اس کے کمرے میں گئی تو وہ لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر حیرت سے مسکرایا اور اس کی یہ ہی مسکراہٹ تھی جس سے مجھے چڑ ہوتی تھی۔

''سنو! تم چاہو تو ساتھ ناشتہ کرسکتی ہو۔'' اس نے مجھے جاتے دیکھ کر پکارا تھا اور میں یہ سوچ کر کہ نہ جانے کچن میں جاکے ناشتے کے لیے کتنی دیر اور انتظار کرنا پڑے، وہیں اس کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرنا شروع کرچکی تھی اور شہیر جو شاید مجھ سے یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ ہی ناشتہ اسٹارٹ کردوں گی بے ساختہ اپنی مسکراہٹ دباتا سلائس پر جیم لگانے لگا تھا۔

''ویسے تمہاری دوست بھی کافی حسین ہے اور شاید اسے وہ لڑکے سخت زہر بھی نہیں لگتے جو حسین لڑکیوں سے فری ہوں۔'' شہیر نے مجھے مخاطب کرکے کہا۔

''دادو کہتی ہیں جو لوگ کھاتے ہوئے بولتے ہیں وہ بے وقوف ہوتے ہیں۔'' میں نے ناشتے سے فارغ ہوتے ہوئے اپنا کپ اٹھایا اور ساتھ میں اپنے زریں خیالات سے دادی کا حوالہ دیتے اس تک پہنچائے۔

''اور آپ کیا کہتی ہیں؟'' وہ بنا شرمندہ ہوئے بولا۔

''مجھے لگتا ہے وہ ٹھیک کہتی ہیں۔ ویسے نائلہ کا کزن بھی بہت ہینڈسم تھا۔ آپ نے اس کی تعریف نہیں کی؟'' میں نے شرارت سے پوچھا۔ اس نے میری بات سن کر ایک لمحے کو مجھے غور سے دیکھا تھا جہاں شرارت دیکھ کر وہ بھی اس ہی موڈ میں مجھ سے بولا۔

''وہ ہینڈسم تھا لیکن مجھ سے کچھ کم لیکن نائلہ تو تم سے زیادہ حسین ہے۔''

''شہیر مجھے لگتا ہے آپ کو خوب صورتی کا مطلب نہیں پتا۔'' میں بغیر برا مانے بغیر بولی۔

''اچھا تو تم بتادو پھر......'' وہ محظوظ ہوا۔

''بتاؤں گی لیکن ابھی نہیں۔ فی الحال مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے۔ آپ ناشتہ کرکے برتن کچن میں رکھ آیئے گا۔ میں شرارت سے کہتی دوسرے ہی پل وہاں سے چلی آئی تھی۔

☆......☆

بارات کی تقریب شاندار رہی تھی۔ انصر بھائی مجھے سگے بھائیوں سے بڑھ کر چاہتے تھے۔ بجیلہ سے زیادہ میرا خیال رکھتے تھے۔ آج ان کی شادی تھی میں نے ایک بہن ہونے کے ناطے اپنے تمام ارمان پورے کیے تھے۔ میں ٹی پنک شرارہ پہنے حرا بھابی کے برابر بیٹھی مووی بنوا رہی تھی۔ تب ہی شہیر اور بجیلہ اسٹیج پر آئے تھے۔

''شانی اب تو بس کرو۔ کب سے بیٹھی مووی بنوا رہی ہو۔ اب تو اٹھ جاؤ میں بھی بہن ہوں انصر بھائی کی۔'' بجیلہ نے آتے کے ساتھ شور مچایا۔

''ہاں تو بیٹھ جاؤ دوسری طرف، میں تو یہاں سے نہیں اٹھوں گی۔ ویسے بھی انصر بھائی تم سے زیادہ مجھے پیار کرتے ہیں اس لیے بھابی کے پاس

بیٹھنے کا حق زیادہ میرا ہے۔'' میں اٹھلائی کیوں کہ مجھے انصر بھائی کی سپورٹ تھی۔ بھابی بھی میری بات پر مسکرادی تھیں۔ مجبوراً نبیلہ دوسری سائیڈ پر بیٹھ گئی تھی جب کہ شہیر میرے برابر والی چیئر پر۔

''او تم آج سچ میں حسین لگ رہی ہو۔ اس لیے آج تمہارے ساتھ فری نہیں ہو رہا۔ تمہیں زہر لگتے ہیں نا حسین لڑکیوں سے فری ہونے والے لڑکے۔'' اس نے میرے کانوں میں سرگوشی کرتے شرارت سے کہا اور میں جواباً غصہ بھی نہ کرسکی کہ اس نے تعریف ہی تو کی تھی میری۔ میں محض اسے گھور کے رہ گئی تھی۔

''اچھا تو اب کیا نظروں کے تیر چلا کے جان لوگی۔'' وہ شوخ ہوا۔

''شہیر تم پاگل ہو۔'' میں زچ ہوکر بولی۔

''اور تم بے وقوف۔ واہ کیا جوڑی ہے۔'' وہ بغیر برا مانے بولا۔

''اوہ ہیلو! شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں۔''

''ہاں روز دیکھتا ہوں اور پتہ ہے کیا بولتا ہے وہ۔ شہیر ماشاء اللہ۔''

''پاگل ہونے کے ساتھ خوش فہم بھی ہو۔'' میں جھنجلائی۔

''اچھا اور کیا ہوں؟'' وہ سنجیدگی سے ایک غیر سنجیدہ بات پوچھ رہا تھا۔

''مجھے نہیں پتا۔'' میں جی بھر کر بدمزہ ہوئی تھی اور اس سے پہلے کے وہ میرے مزید کان کھاتا میں اسٹیج سے اتر آئی تھی۔

☆......☆

آج ولیمے کا فنکشن تھا یہ رونقیں جو میرے اردگرد جمع تھیں آج ختم ہوجانی تھیں یہ سوچ کے ہی دل اداس ہو رہا تھا۔ میں تیار ہوکے ہال جانے کے لیے تقریباً ریڈی تھی لیکن گھر کے باقی افراد شاید ہال پہنچ چکے تھے۔ میں پاپا کو کتنی ہی بار کالز کرچکی تھی لیکن جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ میں لاؤنج میں بیٹھی اب پریشان ہونے لگی تب ہی شہیر آگیا۔ وہ مجھے یوں اکیلا لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر حیران ہوا۔

''تم اب تک یہاں کیا کر رہی ہو؟ ولیمے کا فنکشن اٹینڈ کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ سب لوگ تو اس وقت ہال میں پہنچ بھی چکے ہوں گے۔''

''کچھ دیر پہلے ہی تیار ہو کے آئی ہوں لیکن شاید سب لوگ مجھے بھول کر ہال چلے گئے ہیں۔'' میں نے منہ بسورتے کہا۔

''خیر سب لوگ تو نہیں گئے۔ میں اب بھی تمہارے پاس ہوں۔ چلو آجاؤ چلیں۔'' وہ ریسٹ واچ باندھتے بولا تھا اور میں سر ہلا کر اس کے پیچھے چل دی تھی۔

☆......☆

ولیمے کا فنکشن مکس گیدرنگ کا تھا۔ میں نے ہال میں پہنچتے ہی نائلہ کو ڈھونڈا۔ وہ مجھے ایک ٹیبل پر بیٹھی دکھائی دی تھی۔ آج وہ اپنی مما کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔

''ہائے کیسی ہو السلام وعلیکم آنٹی!'' میں پرجوش سی ان سے ملی تھی۔ ٹیبل پر بدر کو نہ دیکھ کر جو بے چینی ہوئی تھی اسے میں چھپا گئی تھی۔ باتوں باتوں میں آخر میں نے وہ بات بھی نائلہ سے پوچھنے کا سوچ لیا تھا جو میں سب سے پہلے پوچھنا چاہتی تھی۔

''نائلہ! آج تمہارا کزن نہیں آیا تمہارے ساتھ۔'' میں نے انداز کو سرسری بناتے پوچھا۔

''وہ تو واپس کراچی چلے گئے۔ کسی ضروری کام سے آئے تھے۔''

''اتنی جلدی۔'' اس بار میں اپنی حیرانی نہ چھپا سکی تھی۔

''شانی بیٹا! ہمارے یہاں شادی سے پہلے لڑکا سسرال میں زیادہ نہیں رکتا۔'' جواب آنٹی کی طرف سے آیا تھا۔

''سسرال؟'' میں ٹھٹکی۔

''ہاں بدر اور نائلہ کا رشتہ تو بچپن سے طے ہے۔ اب کچھ دن میں ہم باقاعدہ ان کی منگنی کی رسم کرنے والے ہیں۔'' آنٹی مسکرا کر بولی تھیں۔ جب کہ نائلہ شرما گئی تھی۔ تو یہ وجہ تھی نائلہ بدر کو آپ جناب سے پکار رہی تھی۔ میں اسے مبارک باد بھی نہ دے سکی تھی۔ میرا اس وقت زور زور سے چیخیں مار کے رونے کو جی چاہ رہا تھا۔

''ارے شانی! تم یہاں بیٹھی ہو۔ حرا بھابی کب سے تمہیں یاد کر رہی ہیں۔'' یہ شہیر تھا جو مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا اور مجھے اس وقت اس کی آمد کسی رحمت سے کم نہیں لگی تھی۔

''تم ٹھیک تو ہو نا شانی۔'' اس نے ساتھ چلتے چلتے تشویش سے پوچھا تھا۔ جب کہ میرا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا اور دماغ گھوم رہا تھا۔ بدر نے اتنا بڑا دھوکہ کیا میرے ساتھ آخر کیوں؟

''نہیں شہیر! میں ٹھیک نہیں ہوں مجھے لگ رہا ہے میرا بی پی نارمل نہیں ہے تم پلیز مجھے گھر چھوڑ آؤ۔ میرا دم گھٹ رہا ہے یہاں۔'' میں بمشکل سانس لیتے بولی۔

وہ پھر فوراً مجھے گھر لے آیا تھا۔ میری شوگر ڈاؤن ہو گئی تھی۔ اس نے میرے لیے شربت بنایا۔ وہ بہت فکر مند نظر آ رہا تھا۔ وہ جب تک میری طبیعت بہتر نہیں ہوئی میرے پاس ہی بیٹھا رہا۔ مجھے بہت شرمندگی ہو رہی تھی کہ میری وجہ سے اس کا فنکشن خراب ہوا تھا۔

''شہیر! اب میں بہتر ہوں۔ تھینک یو سو مچ۔ اب آپ پلیز واپس چلے جائیں۔'' میں احساس تشکر سے بولی تھی۔ جب کے دل تو چاہ رہا تھا سب کچھ بھول جاؤں اور کہیں ویرانے میں نکل جاؤں اور پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ اپنے دل کے لٹنے کا ماتم کروں۔

''او کے تم ریسٹ کرو۔ فنکشن تو اب تک ختم ہو چکا ہوگا۔ میں بھی اپنے روم میں جا رہا ہوں۔'' وہ مجھے آرام کی تاکید کر کے چلا گیا جب کہ میں نے نیند کی ٹیبلیٹ لیں اگر میں ایسا نہ کرتی تو یقیناً مجھے کچھ ہو جاتا۔ اس وقت جو میرا حال تھا۔ پرسکون نیند اس کے لیے بے حد ضروری تھی۔ میں دروازہ لاک کر کے کچھ دیر میں ہی نیند کی گہری وادیوں میں اتر چکی تھی۔

☆......☆

اگلے دن مہمانوں کی واپسی کا شور مچ گیا اور یہ شادی کے ہنگاموں سے زیادہ تھکا دینے والا کام تھا۔ شاید اسی لیے کسی کو میرا خیال نہیں آیا تھا۔ میں دوپہر تین بجے کے قریب سو کے اٹھی تھی۔ نیند سے آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ عام دنوں میں بھی میرا زیادہ وقت کمرے میں ہی گزرتا تھا۔ خیر اگر سب بے خبر تھے تو اچھا ہی تھا۔ ماموں ممانی بھی آج دوپہر کی فلائٹ سے واپس کویت جا رہے تھے۔ ماموں آج کل اپنا بزنس وائنڈ اپ کر رہے تھے شادی کی وجہ سے انہیں جلدی آنا پڑا تھا جب کہ شہیر ان دنوں پاکستان میں بزنس اسٹیبلش کرنے آیا تھا۔

☆......☆

میں نہا کر جب کمرے سے باہر آئی تو دن کے چار بج رہے تھے۔ میں نے کل دوپہر سے کچھ نہیں کھایا تھا لیکن بھوک لگتا تھا جیسے مر گئی تھی۔ میں اپنے لیے ایک کپ چائے بنا کر دوبارہ کمرے میں آ گئی تھی۔ اس وقت میرا کسی سے بات کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ دل رو رہا تھا بے آواز سسکیاں بھر رہا تھا اور اس وقت میں نہیں چاہتی تھی کوئی مجھے اس حالت میں دیکھے۔ اپنی انا تو سب سے عزیز تھی مجھے۔ جب مجھ سے مزید برداشت نہ ہو سکا تو میں نے مینجر آن کر کے بدر کو کال کرنے کا سوچا تھا اور اس پر فوراً عمل بھی کیا تھا۔

''ہائے کیسی ہو؟ فرصت مل گئی یاد کرنے کی۔''
کال پہلی ہی بیل پر ریسیو کر لی گئی تھی۔ وہ شکایت کرتا بولا۔ انداز وہی تھا جو ہمیشہ ہوتا ہے۔ اگر آنٹی سے مجھے وہ بات نہ پتا چلی ہوتی تو آج کتنا خوش ہوتی میں اس کے اس انداز پر۔ میں نے کرب سے سوچا۔

''کیا ہوا ناراض ہو مجھ سے؟'' وہ گہری خاموشی محسوس کر کے بولا۔

''وہ یار! اچانک ضروری کام پڑ گیا اس لیے بنا بتائے کراچی آنا پڑا۔'' وہ اس بات پر معذرت کر رہا تھا جس پر میں خفا بھی نہ تھی۔

''نائلہ سے کیا رشتہ ہے تمہارا بدر؟'' میں سرد لہجے میں بولی۔

''کزن ہے میری پتا تو ہے تمہیں۔'' وہ حیرانی سے بولا۔

''اس کے علاوہ تمہاری منگیتر بھی تو ہے وہ۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر غصے سے کہا۔

''ہاہاہا...... اس بات پر خفا ہو۔ یار میں انوائیٹ کروں گا انگیجمنٹ پر۔ ابھی تو صرف بات پکی ہوئی ہے۔''

''تم ایسے کیسے کر سکتے ہو بدر!'' میں ایک دم چلا اٹھی۔

''کیا ہو گیا ہے۔ کیوں ہائیپر ہو رہی ہو۔ آخر کیا کیا ہے میں نے۔'' وہ بدمزہ ہوتا بولا۔

اسے تو ہنس ہنس کر بات کرتی شانی پسند تھی۔ یہ چیخنے چلانے والی شانی کو کہاں جانتا تھا وہ۔ تب ہی ناگوار لگا تھا اسے شانی کا انداز۔

''اب بھی مجھ سے پوچھ رہے ہو اگر نائلہ سے تمہارا رشتہ بچپن سے طے تھا تو اتنے سال تم میرے ساتھ کیا کرتے آئے ہو؟ مذاق یا دھوکا؟''

''پاگل مت بنو درخشاں ہمارا رشتہ ہمیشہ سے دوستی کا تھا اور ہے اور تم اکیلی نہیں ہو جو میری دوست ہو۔ تمہاری طرح اور بھی میری فرینڈ ہیں۔ میں نے تم سے کیا کبھی محبت کے یا شادی کے وعدے کیے؟ نہیں ناں تو اب تماشا کیوں کر رہی ہو۔ مجھے نہیں پتا تھا تم اتنی سطحی سوچ رکھتی ہو۔ وہ وہ ناگواری سے کہتا فون کاٹ چکا تھا۔ جب کہ میں اس کے انداز پر ہکا بکا رہ گئی تھی۔

کیا وہ سب صرف دوستی تھی۔ پہروں مجھ سے باتیں کرنا۔ میری فکر کرنا۔ میری پسند کا سوچنا، میری ایک پل کی جدائی برداشت نہ کرنا۔ کیا وہ سب صرف دوستی تھی۔ تو میں اسے محبت کیوں سمجھتی رہی۔ مجھے اس سے زیادہ خود پر غصہ آرہا تھا۔ کیا میں اپنی جان لے لوں لیکن نہیں میری زندگی اتنی سستی ہرگز نہ تھی جو میں اس مطلبی شخص کے لیے قربان کرتی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ مجھے سانس لینے میں پریشانی ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کمرے میں آکسیجن ختم ہو گئی ہو۔ میں بمشکل ہمت کرتی کمرے سے نکل کر صحن میں آئی تھی اور سانس لینے کی کوشش کی تھی لیکن میری ہر کوشش ناکام ہو گئی تھی اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔

☆......☆

جب میری آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھی۔ سامنے ہی امی بیٹھی ہوئی تھیں اور تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر وہ فوراً میری طرف لپکیں جب کہ پاپا ڈاکٹرز کو بلانے گئے ہوئے تھے۔

''ہائے میری بچی! آخر کیا ہوا تھا تجھے؟ کس بات کا صدمہ لیا ہے؟ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری بچی کو تین دن بعد ہوش آگیا۔'' امی اللہ کا شکر ادا کرتیں میرا چہرہ چوم رہی تھیں۔

اس دن مجھے نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا اور یہ امی کی دعائیں تھیں کہ تین دن بعد میں زندگی کی طرف دوبارہ لوٹ آئی تھی۔

ایک ہفتے بعد میں گھر آگئی تھی اس دوران شہیر نے ماما پاپا کو بیٹے کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ وہ ہر

کام بھول کر میری فکر میں ہلکان رہا۔ مجھے اپنے رویے پر دکھ ہوا جو میں اس کے ساتھ روا رکھتی تھی۔ وہ ایک اچھا انسان تھا۔

میں گھر تو آگئی تھی لیکن اب مسکرانا، بولنا تو جیسے بھول ہی چکی تھی۔ میں ہنستی تو میری ہنسی میری آنکھوں کا ساتھ نہ دیتی، بولتی تو اچانک لفظ کھو جاتے۔ بیٹھے بیٹھے کھو جاتی۔ میرا دکھ تھا کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا چلا جارہا تھا میرے مرض کی بس ایک دوا تھی بدر کی محبت جو کہ میرے مقدر میں نہیں تھی۔ ہم لڑکیاں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں۔ کوئی ہنس کر بات کرلے تو ہم خواب دیکھنا شروع ہوجاتی ہیں لیکن جتنی تیزی سے ہم خواب دیکھتی ہیں اس سے زیادہ تیزی سے ہمارے خواب چکنا چور کردیئے جاتے ہیں۔

اب مجھے احساس ہورہا تھا کہ غلطی بدر کی نہیں میری تھی۔ میں نے ایک غیر محرم میں محبت تلاش ہی کیوں کی؟ آخر اتنے سال تک اس سے دوستی کا رشتہ رکھا ہی کیوں وہ تو مرد تھا لیکن میں تو ایک عورت تھی۔ کیوں اپنے جذبے ایک غلط مرد پر لٹاتی رہی۔ میں دور خلا میں نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھی۔ مجھے اپنی غلطیوں کا احساس تھا لیکن احساس ہوجانا محبت کو ختم تھوڑی کرتا ہے۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' مجھے احساس ہی نہیں ہوا وہ کب میرے پاس آکر بیٹھا تھا۔ میں چونکی تو تب جب اس نے مجھے مخاطب کیا۔

''کون تھا وہ درخشاں؟'' اس نے دوسرا سوال کیا اس سوال سے بھی میں چونکی نہیں۔ میری حالت ہی ایسی تھی کہ کوئی بھی اندازہ لگا لیتا کہ میں مرض عشق میں مبتلا ہوں۔

☆☆......☆☆

''شانی! کل ماما پاپا آرہے ہیں اور کل ہی ہم اپنے نیو گھر میں شفٹ ہورہے ہیں۔ اسی خوشی میں، میں تمہیں ڈنر دینا چاہ رہا ہوں۔ کوئی ایکسکیوز نہیں سنوں گا جلدی سے ریڈی ہوجاؤ۔'' وہ اچانک پروگرام بتاتا ہوا بولا تھا۔

''ابھی تک یہیں کھڑی ہو جلدی جاؤ۔ میں کار میں تمہارا ویٹ کررہا ہوں۔'' وہ عجلت میں کہتا بولا تھا ناچار مجھے اٹھنا تھا۔

وہ مجھے لے کر ایک پارک آیا تھا۔ کافی دنوں بعد کھلی کھلی فضا میں مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ میں چپ چاپ ایک بینچ پر جاکر بیٹھ گئی۔

''میں تمہیں یہاں اس لیے نہیں لایا ہوں کہ تم خاموش بیٹھو۔ دیکھو شانی ہم سب تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ تمہاری یہ حالت دیکھ کر ہم سب پریشان ہیں۔ تم اگر بولوگی نہیں تو دکھ تمہیں اندر ہی اندر ختم کردے گا۔ پلیز تم مجھ سے شیئر کرو جو بھی بات ہے۔'' وہ فکر مندی سے بول رہا تھا اس کی آنکھوں میں دکھ تھا۔ مجھے پتا نہیں کیوں رونا آرہا تھا اور میں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی۔ مجھے اس کے سامنے روتے کوئی شرمندگی نہیں ہورہی تھی۔ جب میں جی بھر کے رو چکی تو اس نے ٹشو میری طرف بڑھایا۔ میں آنکھیں صاف کرکے اسے ساری بات بتاتی چلی گئی تھی۔

''مجھے لگتا تھا وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس کے ہر انداز سے محبت چھلکتی تھی۔ اس نے کبھی کہا نہیں لیکن محبت تو محسوس کرتے ہیں نا۔ چلیں مان لیا اسے مجھ سے محبت نہیں تھی لیکن میں اس سے محبت کرتی ہوں کیا اس بات کا کبھی اسے کبھی احساس نہیں ہوا۔'' میں نے بولتے بولتے آخر میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ خاموشی سے مجھے سن رہا تھا۔

''شانی! یہ سوشل ویب سائٹس صرف اس لیے ہوتی ہیں کہ آپ یہاں ان سے رابطے میں رہ سکو جو دل کے تو قریب ہیں لیکن نگاہ سے دور، یہاں کام

کی چیزیں ہیں تو بہت کچھ ایسا بھی ہے جو ہمیں اپنے مدار سے بھٹکا دے۔ پھپھو اور انکل نے تمہیں بیٹے کی طرح پالا، مان دیا، اعتبار کیا، محبت کی، ان کے جذبوں میں کہاں کمی رہ گئی تھی کہ تمہیں کہیں اور محبت تلاش کرنے کی ضرورت پڑی۔ جانتی ہو تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ اس نے تمہیں دھوکا دیا تو اس میں بھی تمہاری ہی غلطی ہے۔ تم کیوں اس سے دھوکہ کھاتی رہیں؟ ہوسکتا ہے تمہیں میری باتیں بہت بری لگ رہی ہوں لیکن تم غور کرو گی تو تمہیں سب سمجھ آتا جائے گا۔ یہ بھی کہ تم جسے محبت سمجھ رہی ہو یہ محبت نہیں محض پسند تھی بھروسہ تھا۔ جو کچھ اتنی اچانک سے ٹوٹا کہ تم برداشت ہی نہ کرسکیں۔ لڑکیاں چاہے کتنی بھی مضبوط نظر آئیں لیکن وہ کانچ سے زیادہ نازک ہوتی ہیں۔ ذرا سا دھوکا انہیں ریزہ ریزہ کردیتا ہے۔

تم میں کوئی کمی نہیں۔ تم ایک بہت اچھی لڑکی ہو۔ ہوسکتا ہے کوئی تم سے تمہاری سوچ سے بھی زیادہ محبت کرتا ہو۔ اس لیے اب یہ اداسی اتار پھینکو۔ تم پر تو مسکراہٹ ہی بجتی ہے۔ تم ہنستی ہو تو تم سے جڑے رشتے بھی مسکراتے ہیں۔ اپنے لیے نا سہی ان ہی کے لیے زندگی کی طرف لوٹ آؤ۔'' وہ مسکراتے ہوئے مجھے سمجھا رہا تھا۔ وہ تلخ بول رہا تھا لیکن بول تو صحیح رہا تھا۔

دادو میری وجہ سے کتنی بیمار نظر آتی تھیں۔ پاپا کچھ ہی دن میں بوڑھے لگنے لگے تھے امی اور تائی بھی ہمیشہ اداس نظر آتی تھیں۔ اور انصر بھائی اپنی نئی نئی شادی کی خوشیوں کو انجوائے کرنے کے بجائے میری وجہ سے پریشان تھے۔ مجھے زندگی کی طرف لوٹنا تھا اپنے لیے نہیں تو اپنے رشتوں کے لیے ہی۔

☆......☆

ماموں ممانی پاکستان آگئے تھے۔ شہیر اپنے گھر شفٹ ہوگئے تھے ممانی نے مجھے شفٹنگ میں ہیلپ کے لیے اپنے پاس ہی بلوا لیا تھا اور امی نے یہ سوچ کر کے ماحول بدلے گا تو میری طبیعت پر اچھا اثر پڑے گا مجھے بھیج دیا تھا۔

ممانی نے گھر کی ڈیکوریشن کے لیے ہر ایک چیز میری پسند سے لی تھی۔ ہم تقریباً روز ہی شاپنگ کے لیے نکل جاتے تھے۔ میرے پرانے شوق دوبارہ لوٹ آئے تھے۔ شہیر ماموں کے ساتھ صبح جاتے اور شام کو لوٹتے تھے۔ میری ان سے ملاقات رات کے کھانے پر ہی ہوتی تھی۔ اس دن شہیر آفس سے جلدی آگئے تھے۔ کھانے کے بعد انہوں نے مجھ سے چائے کا کہا اور پھر وہ لان میں واک کرنے لگ گئے۔ میں ان کی اور اپنی چائے لیے لان میں آگئی تھی۔ اب وہ مجھے برے نہیں لگتے تھے اور نہ ہی ان کا فرمائش کرنا۔ میں انہیں اپنا محسن سمجھتی تھی۔

''تھینک یو۔'' انہوں نے شکریہ کہتے اپنا کپ تھاما۔ میں محض مسکرادی تھی۔

''میں چائے کے لیے تھینکس نہیں کررہا ہوں درخشاں! میں تمہارے زندگی کی طرف لوٹ آنے اور میری بات مان لینے کے لیے تھینکس کررہا ہوں۔'' میں ایک بار پھر صرف مسکرا کر رہ گئی تھی۔

''درخشاں! تم پھپھو کی اکلوتی بیٹی ہو۔ بہت محبت کرتی ہیں وہ تم سے اور بہت سی امیدیں بھی وابستہ ہیں ان کی تم سے۔ پلیز ان کا خیال رکھا کرو۔ اب یہ لاپروائیاں چھوڑ دو یار۔ اتنے سال جو محبتیں وہ تم پر لٹاتی رہی ہیں وہ قرض ہیں تم پر جو تم کبھی چکا نہیں سکو گی لیکن کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اب تم ان کا اور انکل کا خیال رکھو۔ انہیں بھی اپنی ذات سے سکون پہنچاؤ۔ تم خود کو ایسا بناؤ کہ انہیں تم پر فخر ہو اپنی ذات کو ان کے لیے باعث فخر بناؤ۔ تم ایسا کرو گی نا؟'' وہ بہت امید سے پوچھ رہا تھا۔ جتنا بے نیاز اور لاپرواہ میں اسے سمجھ رہی تھی اتنا وہ تھا نہیں۔ اس نے میری لاپروائیوں، کاہلی پر مجھے شرمندہ کیے بغیر مجھے

سمجھایا تھا۔ اس دن مجھے لگا وہ بہت الگ ہے۔ سب سے الگ۔ ایک احساس دل رکھنے والا۔ میں خاموشی سے سر ہلا کر مسکرا دی تھی گویا یہ اس بات کا اقرار تھا کہ ہاں میں سمجھ گئی ہوں۔

دوسرے دن مجھے انصر بھائی لینے آ گئے تھے۔ گھر میں سب ہی مجھے یاد کر رہے تھے۔ مجھے ماموں کے گھر آئے مہینہ ہو چکا تھا۔ گو ممانی تو اب بھی مجھے بھیجنا نہیں چاہتی تھیں لیکن اب میرا بھی دل شدت سے سب کو یاد کر رہا تھا۔

ممانی جان نے میرے سنگ بہت سارے گفٹس میرے لاکھ انکار پر بھی کر دیے تھے اور اس وعدے پر کہ میں بہت جلد پھر چکر لگاؤں گی۔ گھر آنے کے بعد میری روٹین مکمل طور پر چینج ہو گئی تھی وہ لاپروائی اور کاہلی۔ سارا سارا دن فیس بک یوز کرنا۔ وہ سب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ کمال کی بات یہ کہ اب مجھے بدر کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ شاید شہیر ٹھیک کہتا تھا وہ محبت نہیں تھی۔ وہ محض میری پسند تھی یا شاید شوق تھا جو بھی تھا اب بہت پیچھے رہ گیا تھا اور میں خوش تھی۔ اب صبح اٹھ کر ناشتہ کرنے کے بعد میں فارغ نہیں رہتی تھی۔ بلکہ صفائی والی کے ساتھ اپنی نگرانی میں صفائی کراتی دادو کے پیر دباتی، ان کی دعا لیتی۔ شام کو روزانہ اب کھانا میں ہی بنانے لگی تھی۔ نیٹ سے مختلف ریسیپی سرچ کر کے انہیں ٹرائی کرنا۔ یہ سب مجھے اچھا لگتا تھا بعد میں سب اس ڈش کی تعریف کرتے تو بہت خوشی ہوتی۔ مجھے دیکھ کر اب بجیلہ بھی شام کو کھانے میں میری مدد کرنے لگی تھی۔ ہماری اب بھی لڑائیاں ہوتی تھیں لیکن میں اب جان چکی تھی کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے اس لیے اب میں چڑتی نہیں تھی۔

''بجیلہ کل انصر بھائی اور حرا بھابی کی شادی کی پہلی سالگرہ ہے کیا خیال ہے ان کو سرپرائز پارٹی نہ دی جائے۔'' میں نے ڈنر کے لیے پیاز کاٹتی بجیلہ کو اچانک مخاطب کیا۔

''ارے ہاں کیوں نہیں۔ اب تو ہماری کوکنگ اتنی اچھی ہو گئی ہے کہ ہم بہترین ڈنر ارینج کر سکتے ہیں۔'' وہ چمکتی آنکھوں سے چہکتے ہوئے بولی۔

''لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تیاریاں ہم ان سے چھپا کے کریں گے کیسے؟'' میں نے سب سے اہم پوائنٹ اسے نوٹ کرا دیا۔

''یار! سمپل ہے۔ حرا بھابی کی بہن اسمارہ سے کتنی دوستی ہے ہماری۔ اس کی ہیلپ لے لیتے ہیں۔'' وہ چٹکی بجاتے بولی۔

''ارے ہاں بس پھر ڈن۔ بریانی، کیک، لزانیہ، رول، یہ سب میں بنالوں گی۔''

''تم ٹرائفل، چاٹ اور چکن کڑاہی بنا لینا۔ انصر بھائی کو بہت پسند ہے۔ باقی چیزیں ہم باہر سے منگوالیں گے۔'' ہم نے منٹوں میں مینو سیٹ کر لیا۔

☆......☆

دوسری صبح بہت حسین تھی۔ روشن، پرسکون، نکھری نکھری۔ بھابی کو انصر بھائی آفس جاتے ہوئے ان کے میکے چھوڑ گئے تھے۔ کیوں کہ اسمارہ کا فون آیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد ہم نے شہیر کو کال کی تھی اور اسے ڈیکوریشن کے لیے جو چیزیں درکار تھیں وہ لانے کا کہا۔

کچھ ہی دیر میں وہ سارا سامان لے کر آ گیا تھا اور اس کے بعد اس کی ہی مدد سے ہم لاؤنج کو سجانے میں لگ گئے۔

تین گھنٹوں کی انتھک محنت کے بعد آخر ہم کامیاب ہو ہی گئے تھے لاؤنج بے انتہا پیارا لگ رہا تھا۔ خوب صورتی سے سجے ہارٹ شیپ بلون جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔

''اچھا اب تم لوگوں کی اجازت ہو تو میں چلوں۔ اس نے لاؤنج پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں آج کے دن آپ کو ہم نے ہائر کیا ہے سو یہ لسٹ لیں اور بازار سے یہ سب لاکے دیں۔'' بجیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور وہ اُف کرتا باہر کی طرف چل پڑا۔

☆......☆

شام تک سب کچھ ریڈی تھا۔ بریانی کو دم دینے کے بعد میں اور بجیلہ بھی تیار ہونے چل دی تھیں۔ شہیر بھی تیار ہو کر آچکا تھا۔ وہ بلیک جینز اور ڈارک بلیو شرٹ میں ہمیشہ کی طرح بہت وجیہہ لگ رہا تھا۔ باقی گھر والے بھی تیار ہو چکے تھے۔ اب بس بھیا بھابی کا انتظار تھا۔

''کیا ہے یار! کہاں رہ گئی ہیں بھابی؟'' میں نے اسمارہ کو کال کر کے پوچھا۔

''بس یار! تیار ہونے میں دیر لگادی کچھ دیر میں پہنچتی ہی ہوں گی۔'' اس نے تسلی دی۔

بجیلہ نے لاؤنج کی ساری لائٹس آف کر دی تھیں۔ شہیر نے لاؤنج کے باہر کی طرف کھلنے والے دروازے پر چمک سے بھرا بلون کچھ یوں سیٹ کیا تھا کہ جیسے ہی بھائی اور بھابی اندر آنے کے لیے دروازہ کھولتے وہ بلون پھٹ جاتا اور ساری افشاں ان پر گر جاتی۔ اور پھر دو منٹ بعد ہی انصر بھائی اور بھابی آگئے۔ سب کچھ جیسے ہم نے پلان کیا تھا ویسے ہی ہوا تھا۔ وہ اتنا اچھا سرپرائز دینے پر بہت خوش نظر آرہے تھے۔

''واہ یار! تم دونوں تو بڑی ذہین اور سگھڑ ہو گئی ہو۔'' انصر بھائی نے میری تعریف کی۔

''بھیا زیادہ ہاتھ اس میں شانی کا ہے اور پلان بھی اس کا ہی تھا۔'' بجیلہ نے فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ میں نے ایک نظر ماما پاپا پر ڈالی۔ ان کے چہروں پر جو سکون اور اطمینان نظر آرہا تھا۔ فخر کا احساس تھا کہ درخشاں ہماری لاڈلی اور اکلوتی بیٹی دیکھو اسے ہمارے لاڈ پیار نے بگاڑا نہیں۔ مجھے یہ سب محسوس کر کے بے حد خوشی ہو رہی تھی اور اس خوشی کا کریڈٹ شہیر کو جاتا تھا۔ وہ ہی تھا جس نے مجھے بالکل بدل دیا تھا۔

''انصر بھائی! پلان بے شک میرا تھا لیکن محنت میری بجیلہ اور شہیر تینوں کی یکساں ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر شہیر کو دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔

وہ انسان جو میرے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ میری ہر کمزوری اسے پتا تھی لیکن اس نے انہیں تماشا نہیں بننے دیا تھا بلکہ مجھے اس قابل بنایا تھا کہ سب مجھ پر فخر کر سکیں۔ میں شاید اس کا یہ احسان کبھی نہیں اتار سکتی تھی۔

☆......☆

آج ماموں ممانی آرہے تھے۔ سب کی تیاریاں دیکھ کر میں حیران رہ گئی تھی کہ آخر اتنا اہتمام کیوں کیا جارہا ہے اور میں نے اس حیرانی کا اظہار بھابی کے سامنے کر بھی دیا تھا۔

''بھابی! آج اتنا اہتمام کیوں کیا جارہا ہے۔ ماموں ممانی ہی آرہے ہیں نا۔''

''ہاں...... آتو ماموں ممانی ہی رہے ہیں لیکن وہ جس مقصد سے آرہے ہیں وہ میری پیاری نند سے جڑا ہے۔'' انہوں نے شرارت سے کہا۔

''رئیلی...... کیا وہ رشتے کے سلسلے میں آرہے ہیں؟'' میں خوشی سے چیخ مارتے بولی۔

''آرام سے لڑکی! مانا خوشی کی بات ہے لیکن آرام سے۔'' وہ مجھے بچوں کی طرح خوش ہوتے دیکھ کر مسکرائی تھیں۔

اور میں یہ سوچتی ہوئی وہاں سے چلی آئی کہ شہیر اور بجیلہ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ممانی بھی اتنی اچھی ہیں۔ بجیلہ بہت خوش رہے گی وہاں میں اس کی خوشی میں بہت خوش تھی۔ آخر بہنوں کی طرح عزیز تھی وہ مجھے شہیر پر بھی غصہ تھا کہ اس نے مجھ سے شیئر نہیں کی یہ بات اور نہ ہی بجیلہ

نے ان کے بارے میں سوچتے پتا ہی نہ لگا کب مجھے نیند آ گئی۔

جب میں سو کر اٹھی تو شام گہری ہو رہی تھی۔ میں نہا کر جب نکلی تو امی کو اپنے بیڈ پر بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''شانی بیٹا! کوئی اچھا سا سوٹ پہن کر تیار ہو کر جلدی سے نیچے آ جاؤ۔ تمہاری ممانی کب سے تمہیں یاد کر رہی ہیں۔''

''او کے امی ابھی آتی ہوں لیکن یہ کپڑے بھی ٹھیک ہیں۔'' میں نے اپنے لان کے سوٹ کی طرف اشارہ کرتے کہا۔

''او کے جیسے تمہاری مرضی لیکن دیر نہ کرنا۔'' وہ شاید عجلت میں تھیں تب ہی بنا کچھ کہے چلی گئیں۔

میں بہت خوشی خوشی محبت سے ممانی سے ملی۔ آخر میری ممانی سے بنتی بھی تو بہت تھی۔ کچھ ہی دیر میں عفت بی چائے لے کر آئیں تو میں نے سامنے بیٹھی بجیلہ کو اشارہ کیا کہ چائے سرو کرے ماموں ممانی کو۔ لیکن وہ بنا اثر لیے وہیں جم کر بیٹھی رہی مجبوراً میں نے اس کی کم عقلی پر ماتم کرتے خود ہی سب کو چائے سرو کی۔ کھانے کے دوران بھی میں ہی سب بجھ انہیں سرو کرتی رہی ایک ایک چیز کے لیے اصرار کرتی رہی۔ اس کی دو وجہ تھیں ایک تو یہ کہ وہ بجیلہ کی ہونے والی ساس تھیں۔ دوسرا یہ کہ میں اپنے ماموں اور ممانی سے محبت بھی بہت کرتی تھی۔ کھانے کے بعد وہ ہمیشہ کی طرح مجھے پیار کرتے رخصت ہوئی تھیں۔ میں گندے برتن کچن میں رکھ کر اور فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر میں میرے فیورٹ ڈرامے کی آخری قسط آنی تھی۔ اس لیے میں نے ٹی وی آن کر لیا تھا۔

ابھی مجھے ٹی وی دیکھتے آدھا گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ بجیلہ مجھے میسج دے کر گئی کہ سب مجھے دادو کے کمرے میں بلا رہے ہیں۔ میں وہاں پہنچی تو تایا تائی، انصر بھائی، بھابی اور سب کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی سوچنے لگی کہ میں نے آج کون سی غلطی کی ہے لیکن سوچنے پر بھی مجھے کوئی غلطی یاد نہ آئی۔

آ، شانی، ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔'' دادو نے اپنے محبت بھرے انداز میں مجھے پکارا تو میں حیران ہوتی ان کے پاس بیٹھ گئی۔ بھابی کے چہرے پر بجی دبی دبی شرارتی مسکراہٹ مجھے مزید الجھن میں مبتلا کر گئی تھی۔

''جانتی ہے آج تیرے ماموں ممانی کیوں آئے تھے؟'' دادو نے تجسس پھیلایا۔

''جی وہ بجیلہ کے رشتے کی بات کرنے آئے تھے۔'' میری بات پر سب نے ہی قہقہہ لگایا تھا۔ دادی کے گھور کے دیکھنے پر سب کی ہنسی کو بریک لگے۔

''نہیں بیٹا! وہ ہم سے تجھے مانگنے آئے تھے اور شہیر ہمیں تیری ہی طرح عزیز ہے۔ اتنا اچھا اور نیک بچہ ہے سب سے بڑھ کر اس کی خود کی خواہش ہے۔ تیرے ماموں ممانی بھی اتنا چاہتے ہیں تجھے ہم نے تو فوراً ہاں کر دی اور اگلے مہینے کی شادی کی تاریخ بھی رکھ دی۔ بول صحیح کیا نا ہم نے؟'' وہ بڑی چاہ سے مجھے گلے لگائے پوچھ رہی تھیں اور میں تو جیسے ساکت ہو گئی تھی اور اگلے ہی پل وہاں سے بھاگ آئی تھی۔ بنا یہ سوچے کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے مجھے اب کوئی پروا نہ تھی۔

☆......☆

''وہ کیسے میرا پرپوزل بھیج سکتا ہے، سب جانتا تو ہے وہ میرے بارے میں۔ وہ آخر سمجھتا کیا ہے خود کو۔ مجھے اپنے احسانوں تلے دبانا چاہتا ہے جب وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا تو اس نے میرے لیے رشتہ کیوں بھجوایا۔'' مجھے اس پر شدید ترین غصہ آ رہا تھا۔ اس نے مجھے آخر سمجھا کیا تھا۔ آخر کس لیے مجھ

پر ترس کھا رہا تھا۔ ساری رات میری سوچ سوچ کر گزر گئی اور صبح میں اس سے لڑنے اس کے گھر پہنچ گئی تھی۔ مجھے اس سے اپنے سوالوں کے جواب چاہیے تھے۔ چوکیدار نے مجھے دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا تھا۔

ملازمہ سے پتا چلا کہ ممانی جان گھر پر نہیں ہیں۔ میں نے سوچا چلو اچھا ہی ہے۔ میں دندناتی ہوئی سیدھی شہیر کے کمرے میں گئی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ میں نے بالکونی میں چیک کیا وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ شاید وہ آفس جا چکا تھا۔ میں مایوسی سے پلٹنے ہی لگی تھی کہ میری توجہ اس کے بیڈ پر رکھی سرخ کلر کی خوب صورت سی ڈائری پر پڑی۔ اس کے درمیان میں پین یوں رکھا تھا جیسے لکھتے لکھتے کسی کو اچانک جانا پڑا ہو۔ میں نے تجسس کے ہاتھوں وہ ڈائری اٹھالی تھی تو یہ ایک غیر اخلاقی حرکت لیکن......

میں جیسے جیسے ڈائری پڑھتی جا رہی تھی ویسے ویسے حیران ہوتی جا رہی تھی۔ اس ڈائری کا تو لفظ لفظ میرے نام سے سجا تھا۔

ہماری پہلی ملاقات جب میں اس سے بہت روڈ انداز میں ملی تھی۔ بالکل جنگلی بلی کی طرح۔ تو میں اسے پہلی ہی نظر میں بہت اچھی لگی تھی۔ اتنی اچھی کہ اس نے مجھے دل میں بسا لیا۔ تو جسے میں احسان سمجھ رہی تھی وہ محبت تھی۔ مجھے نہ جانے کیوں بہت خوشی ہو رہی تھی۔ میں باقی کی ڈائری ادھوری چھوڑ کر وہاں سے واپس چلی آئی تھی۔ اب مجھے اپنے خوش نصیب ہونے میں کوئی شک نہ تھا اور نہ ہی اس رشتے پر اعتراض۔

☆......☆

آج میں شہیر کی دلہن بنی اس کے بیڈروم میں سجی بیٹھی تھی۔ میرا پور پور اس کی محبت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ میں اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ مجھے آج اس سے وہ اظہار محبت سننا تھا جو اس نے مجھ سے کبھی نہیں کیا تھا۔

اور پھر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور وہ آ گئے تھے۔

''درخشاں! تم سے محبت کیوں ہوئی یہ تو میں نہیں جانتا لیکن تمہاری محبت قطرہ قطرہ میرے دل میں وارد ہوئی، کبھی تمہارے جھگڑتے انداز نے مجھے دیوانہ کیا تو کبھی تمہاری مسکان نے مجھے اپنا بنایا۔ کبھی تمہارے آنسوؤں نے بے قرار کیا تو کبھی تمہاری شرارت نے لیکن اس سب کو چھوڑ کے دیکھا جائے تو میں تمہیں بتاؤں تم مجھے کیوں اچھی لگتی ہو؟'' انہوں نے بولتے بولتے میری آنکھوں میں دیکھا۔

''تمہارا سب کی خوشیوں کے لیے جینا، ان کا خیال رکھنا ان کی پروا کرنا، تمہارا حساس انداز، تمہاری ہر ادا مجھے اچھی لگی۔

''تو کیا آپ کو اس بات سے کوئی پرابلم نہیں کہ ماضی میں میری زندگی میں کوئی اور تھا۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''نہیں شانی! تمہارے حال اور مستقبل سے مجھے مطلب ہے اور رہی ماضی کی بات تو غلطیاں تو سب سے ہوتی ہیں لیکن ان غلطیوں کو زندگی کا حصہ نہیں بناتے۔ تم بالکل ویسی ہی ہو جیسی شریک حیات میں چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے نصیب پر فخر ہے کہ تم میرے نصیب میں ہو۔ تم اس قابل ہو کہ تمہیں چاہا جائے۔ اور رہی بات تمہارے کل کی تو میں بس اتنا کہوں گا لڑکیاں بہت نادان ہوتی ہیں، کبھی کبھی وہ محض پسندیدگی کو بھی محبت سمجھ لیتی ہیں۔

خیر گزری باتوں میں، میں یہ پل ضائع نہیں کر سکتا۔ اس لیے تم بھی بھول جاؤ پچھلی باتوں کو اور...... وہ شرارت سے بات ادھوری چھوڑ کر مجھے اپنے حصار میں لے چکے تھے۔

☆......☆......

سمیحہ عبید

افسانہ

حصارِ محبت

وہ کمرے میں یہاں سے وہاں چکراتی پھر رہی تھی۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے یہ سلسلہ جاری تھا۔

بیٹھے بٹھائے ہی یہ مصیبت سر پر آپڑی تھی، کم سے کم اس کے لیے تو مصیبت ہی تھی اور اچھی خاصی بڑی



مصیبت تھی۔

سب کچھ اچھا بھلا چل رہا تھا مگر ایک ذرا سی بے صبری اس کی اور اتنا بڑا ایسا یہ ہو گیا تھا۔

''بھلا کیا ضرورت تھی اتنا بے صبرا پن دکھانے کی۔'' گزرنے آدھے گھنٹے میں وہ یہ بات کوئی دس مرتبہ بول چکی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹہ پہلے عائزہ بجو اس کے کمرے میں آئی تھیں اور آتے ہی اس کے سر پر بم پھوڑا تھا۔

''یہ لو آج شام کو یہ پہن کر تیار رہنا۔'' ان کا ردیہ پچھلے دو دنوں کی طرح اس وقت بھی خاصا روکھا تھا اس کے ساتھ ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھا جو اس کی طرف بڑھا رکھا تھا۔

''یہ کیا ہے اور شام کو کیا ہے؟'' اس نے ناسمجھی سے ان کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''اس میں تمہارے لیے کرتا شلوار ہے اور آج شام کو لڑکے والے آرہے ہیں تم سے ملنے۔'' وہ ہنوز اسی انداز میں بولیں۔

''کون سے لڑکے والے، مجھ سے کیوں ملنا ہے



بھلا؟'' وہ ہونق بنی پوچھ رہی تھی۔

''کیا بے وقوفوں والے سوال ہیں۔ رشتہ پکا کرنے سے پہلے رسماً ایک بار ملنا تو ہے ہی نا، بے شک جاننے والے ہیں پر پھر بھی رسماً ایک بار بیٹھ کر بات چیت تو کریں گے نا۔'' عائزہ بجو اس کے بے وقوفانہ سوالوں پر چڑ کر بولی تھیں۔

''بجو! آپ لوگوں نے تو ہتھیلی پر سرسوں ہی جما لیا ہے اور یہ جاننے والے کون ٹپک پڑے ہیں جو میرے متمنی ہیں۔'' اسے امی اور بجو سے اتنی جلد بازی کی امید بالکل بھی نہ تھی۔

''شکر کرو میں نے اور امی نے ابو جی اور سمیر کو تمہاری شکایت نہیں کر دی ورنہ جو کچھ ہوا ہے نا اگر ان کو کانوں کان خبر ہو جاتی نا تو اب تک مار کھا کھا کر ادھ موئی ہوتیں تم۔'' عائزہ بجو نے ابو جی اور سمیر بھائی کا ڈراوا دیا جو ہمیشہ کی طرح کارگر ثابت ہوا اور وہ جو اتنی دیر سے بڑھ بڑھ کر سوال و جواب کر رہی تھی چپ ہو گئی۔

''شام کو فرحت آنٹی اور ان کے میاں اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ آئیں تیار ہو جانا۔'' فرحت آنٹی امی کی بچپن کی سہیلی تھیں، بالکل بہنوں جیسا رشتہ تھا جب کہ ان کے میاں حسن علی اور مبشر احمد (ابو جی) میں بھی خاصا دوستانہ تھا مگر روزمرہ زندگی کی وجہ سے آنا جانا بہت کم تھا لیکن ٹیلی فونک رابطہ رہتا تھا۔ بجو کے بتانے پر وہ حیران ہوئی۔ بھلا وہ لوگ کیوں آ رہے تھے۔

''اب وہ لوگ کیوں آ رہے ہیں؟'' مزید خاموش رہنا مشکل تھا اس اطلاع کے بعد۔

''وہیں رشتہ ہو رہا ہے تمہارا پاگل لڑکی۔'' انہوں نے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے بتایا۔

''کیا؟'' وہ چیخ ہی تو پڑی تھی۔

''کیا احمقانہ حرکت ہے۔'' انہیں اس کے یوں چلانے پر غصہ آ گیا۔

''آپ کہیں یہ تو نہیں کہنا چاہتی ہیں نا کہ آپ لوگ میرا رشتہ فرحت آنٹی کے اس کھڑوس بیٹے سے کرنا چاہ رہے ہیں جس کے مسکرانے پر بھی شاید کوئی پابندی ہے۔ ماتھے پر سلوٹیں اتنی کہ گننا محال آپ لوگ کہیں یہ ظلم تو نہیں کرنے جا رہے، نا میرے ساتھ۔'' وہ بے یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں، ہم بالکل یہی کرنے جا رہے ہیں تمہارا رشتہ عباد حسن سے ہی طے ہونے جا رہا ہے اور یہ ظلم نہیں، ہمدردی و فکر ہے تمہارے لیے کہ تم ہمیں بہت عزیز ہو اور یہ بات تمہیں ابھی سمجھ نہیں آئے گی کیونکہ تم ابھی سمجھنا چاہتی ہی نہیں ہو۔ اس دنیا میں لوگوں کے کتنے اور کیسے کیسے روپ ہیں تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے ہر شہد آگیں لہجہ اپنے اندر تمہارے لیے محبت و خلوص کا ہی جذبہ رکھتا ہو یہ ضروری نہیں ہے اور نہ ہی وہ لوگ تمہارے دشمن ہوں گے جو تم سے سختی سے بات کریں۔ لوگوں کو پہچاننے کا ہنر سیکھو ورنہ آج تو ہم لوگ تھے جو تمہیں سنبھال رہے ہیں۔ صحیح غلط میں فرق سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ہمیشہ ہی ایسا ہو یہ ضروری نہیں ہے۔'' عائزہ بجو نے اسے پھر ایک بار وہی بات سمجھانے کی کوشش کی جو بات وہ واقعی ابھی سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

''بہرحال! تم یہ پہن کر تیار ہو جانا شام تک اور ہاں مجھے اور امی کو تمہارا کسی قسم کا کوئی فضول ڈرامہ یا ضد نہیں چاہیے ورنہ پچھلی بار تو میں نے امی کو روک لیا تھا ابو جی کو کچھ بھی بتانے سے اس بار نہیں رکوں گی، یہ یاد رکھنا۔'' وہ جاتے جاتے اسے تنبیہہ کر گئی تھیں اور جانتی تھیں کہ یہ تنبیہہ بہت اثر رکھتی ہے۔

سب کہہ کر وہ تو چلی گئی تھیں اور وہ تب سے اب تک یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی کہ اب آگے کرے تو کرے کیا۔

اس کی زندگی میں سب کچھ اچھا بھلا چل رہا تھا (پھر وہی بات کہ کم سے کم اس کے لیے اچھا بھلا ہی

تھا) کہ اچانک دو دن پہلے یہ مصیبت اس پر آن پڑی تھی جو سراسر اس کی بے صبری کا نتیجہ تھی۔
ہوا یہ تھا کہ صبح سے گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے جس کی وجہ سے سارا دن اس کی عاطف سے بات نہیں ہو پائی تھی۔ شام کو جیسے ہی مہمان گئے اس کے لیے مزید صبر کرنا ناممکن ہو گیا۔ روزانہ یا تو وہ دوپہر میں بات کرتی تھی عاطف سے جب امی سو رہی ہوتیں، ابو جی اور سمیر بھائی آفس گئے ہوتے یا پھر رات میں سب کے سونے کے بعد وہ عاطف کو فون کرتی مگر اس دن دوپہر میں بات نہ ہونے پر اتنا بے صبرا پن دکھایا کہ مہمانوں کے جاتے ہی وہ کمرے کی طرف لپکی اور فوراً عاطف کو فون ملایا اور امی جو اس کے پیچھے آئی تھیں اسے کہنے کے برتن وغیرہ کون سمیٹے گا۔ اسے یوں کسی لڑکے سے باتیں کرتا سن کر دنگ رہ گئیں اور امی کو دیکھ کر اس کا جو رنگ فق ہوا وہ الگ۔
امی نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ تھپڑوں سے لال کر دیا ان کے آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔
''یہ سب کیا کر رہی تھیں تم۔'' امی صدمے سے چور تھیں۔
جب مار مار کر اور اسے کوس کوس کر تھک گئیں تو عائزہ بجو کو فون کر کے ساری بات ان کے گوش گزار کر دی ساتھ ہی انہیں جلدی آنے کو کہا۔ عائزہ بجو ایک گھنٹے کے اندر اندر گھر پہنچ چکی تھیں۔ ان کے شوہر طارق بھائی انہیں چھوڑ کر اپنے کسی کام سے چلے گئے اور پھر عائزہ بجو سے بھی خوب کھری کھری سننے کو ملی تھیں۔
''تم جانتی ہو کتنا آوارہ لڑکا ہے وہ۔'' ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بھی اس کی خوب ٹھکائی کر دیں۔
''بجو! ایک بار مل لیں نا آپ اس سے۔'' وہ منمنائی۔
''دماغ ٹھکانے پر ہے تمہارا، جب تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ کس قسم کا لڑکا ہے تو ملنے کا کیا جواز ہے اور مجھے تو وہ تمہاری دوست، کشف، وہ بھی انتہائی بری لگتی ہے کتنی بار دبے دبے لفظوں میں تمہیں اس سے دوستی ختم کرنے کا کہہ چکی ہوں۔ کہا کہ اس کا بھائی افسوس ہو رہا ہے مجھے کہ بہت پہلے ہی تم پر سختی کر کے یہ دوستی کیوں نہ ختم کروا دی میں نے۔''
انہیں سچ میں اس بات کا بہت افسوس ہو رہا تھا۔
''بجو! کبھی کبھی آنکھوں دیکھا سچ نہیں بھی ہوتا وہ واقعی بہت اچھا لڑکا ہے۔'' وہ ایک بار پھر منمنائی تھی۔
''لگاؤں رکھ کے تھپڑ تمہارے منہ پر یہ بڑی بڑی باتیں وہاں کی جاتی ہیں جہاں عقل و شعور ہو، جو تمہارے پاس تو قطعی نہیں یا ہے بھی تو اس کو استعمال میں لانے سے تم بالکل ناواقف ہو۔ ہم تم سے بڑے ہیں تم سے زیادہ دنیا دیکھ رکھی ہے، تجربات تم سے زیادہ ہیں ہمارے تمہاری طرح لاابالی نہیں ہیں۔
میری ایک بات کان کھول کر سن لو اور سمجھ لو اگر آج کے بعد تم نے اس آوارہ مزاج لڑکے یا اس کی بہن سے کوئی رابطہ بھی رکھنے کی کوشش کی تو میں یا امی اب کی بار خود تمہیں کچھ نہیں کہیں گے بلکہ اگلی بار میں خود ابو جی اور سمیر کو سب بتاؤں گی۔ اس بار میں نے امی کو جیسے روکا ہے میں ہی جانتی ہوں مگر اگلی بار نہیں رکوں گی یاد رکھنا یہ بات۔'' انہوں نے اسے وارن کیا۔
جو کچھ بھی ہوا تھا۔ امی وہ سب ابو جی کو بھی بتانے والی تھیں مگر بجو نے آ کر انہیں روک لیا کہ وہ خود اسے سمجھا لیں گی۔
''بجو! آپ لوگ ظلم کر رہے ہیں یہ۔'' وہ دبے دبے لفظوں میں پھر احتجاج کر بیٹھی اور اس کا یہ

احتجاج بجو کا پارہ چڑھا گیا۔
”ظلم کی سگی لگتی، زبان کھینچ لوں گی اب میں تمہاری، ظلم ہم کر رہے ہیں یا تم خود اپنے اوپر ظلم کرنے پر تلی ہو۔ اندھی ہو جو اس آوارہ لڑکے کی حرکتیں تمہیں دکھائی نہیں دیتیں یا بھوسا بھرا ہے دماغ میں کہ اس کے عزائم سمجھ نہیں آرہے تمہیں۔ ایک دو بار محض ایک دو بار سرسری طور پر دیکھا ہے اسے تب بھی اس کے حلیے، اس کی باتوں سے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کیسا اوباش فطرت لڑکا ہے۔ میں کب سے امی کو کہہ رہی ہوں کہ بس اب شادی کر دیں اس کی بی اے کر چکی ہے اب بیاہ دیں مگر امی بھی جانے کیوں تمہارے ابھی نہیں، ابھی نہیں پر چپ سادھ کر بیٹھ گئی ہیں۔ کہتی ہوں امی سے کہ بس اب کریں اس کا رشتہ پکا اور رخصت کریں تمہیں اب بس اپنے گھر کی ہو جاؤ تاکہ ہماری بھی ذمہ داری پوری ہو اور تمہیں بھی پھر کچھ عقل آئے۔“ بجو کہہ کر امی کے پاس چلی گئیں جب کہ شادی کی بات پر وہ سر تھام کر رہ گئی اور پھر جتنی جلدی شادی کی بات آگے بڑھی اتنی جلدی کی اسے قطعی توقع نہ تھی اور یہ شادی کا مسئلہ ان دو دنوں میں دوسری مصیبت تھی اس کے سر پر۔

☆......☆

کشف سے اس کی دوستی فرسٹ ایئر میں ہوئی تھی۔ وہ کافی بولڈ لڑکی تھی۔ کشف نے ہی اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ دوستی ہوئی تو آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے گھر بھی آنا جانا شروع ہو گیا۔ وہ خود تو کم ہی جاتی کیونکہ امی کو اس کا کشف کے گھر جانا پسند نہ تھا جب کہ کشف کا اکثر ہی چکر لگتا رہتا تھا۔

شروع شروع میں کشف نے سمیر بھائی سے بہت فری ہونے کی کوشش کی تھی۔ بار بار بنا بات ان کو مخاطب کرتی بھائی کہنا تو حرام تھا اس پر ہمیشہ نام لے کر ہی بات کرتی، پہلے تو سمیر بھائی نے نظر انداز کر کے اپنا رویہ اس کے ساتھ بھی ویسا ہی رکھا جیسا خود اس کے یا بجو کے ساتھ ہوتا تھا مگر جب وہ ضرورت سے زیادہ فری ہونے لگی تو انہوں نے بری طرح جھڑک دیا۔ امی اور بجو کو بھی اس کے انداز بہت برے لگتے تھے۔ بھائی نے امی سے کہہ کر اسے کشف سے دوستی ختم کرنے کو کہا مگر اس کو تو دنیا میں سب سے اچھی دوست کے روپ میں ایک کشف ہی نظر آتی تھی۔ اس بات کے بعد کشف نے ان کے گھر آنا چھوڑ دیا تھا لیکن باہر ان کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اسے کشف کے بڑے پن پر رشک آتا۔ سمیر بھائی کے ایسے رویے کے باوجود کشف نے کبھی اسے طعنہ نہ دیا تھا۔ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی جب کبھی کشف اپنے گھر آنے کے لیے اس کے بہت پیچھے پڑتی تو وہ امی سے ضد کر کے چلی ہی جاتی اور چونکہ امی کشف اور سمیر بھائی کی تکرار سے واقف نہ تھیں اس لیے بات کبھی کبھی مان لیتی تھیں۔

عاطف، کشف کا بھائی اس سے بات کرنے، دوستی کرنے کی کوشش میں رہتا، شروع شروع میں تو وہ حتیٰ الامکان اسے نظر انداز کرتی رہی، بچنے کی کوشش کرتی رہی مگر آخر کار اس کی باتوں میں الجھ گئی۔ پہلے کبھی کبھی پھر روز روز اور پھر دن میں کئی کئی بار فون پر باتیں ہونے لگیں۔ وہ جیسے عاطف کی چکنی چپڑی باتوں پر پوری طرح ایمان لے آئی تھی۔ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اسے بے حد پسند کرتا ہے اور یہی یقین اس کی آنکھوں کی ایسی پٹی بنا کہ پھر اسے عاطف کا اصلی روپ نظر آنا ہی بند ہو گیا۔ حالانکہ کہیں نہ کہیں شاید وہ خود بھی عاطف کی حقیقت جانتی تھی مگر جب انسان سمجھنے پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی جان بوجھ کر حقیقت سے نظریں چرا لے تو بھلا وہ سچ دیکھے اور سمجھے بھی تو کیسے؟

یہی مسئلہ تھا اس کے ساتھ بھی کہ وہ حقیقت

سامنے ہوتے ہوئے بھی اس کی طرف سے آنکھیں موند ہے ہوئے تھی۔

اس کا موبائل اب امی کے قبضے میں تھا وہ چاہ کر بھی فون کر کے عاطف کو ساری صورت حال نہیں بتا پا رہی تھی کہ اب وہی کچھ کرے۔

☆......☆

اس کا بی اے کا رزلٹ آچکا تھا جس روز فرحت آنٹی وغیرہ آئے اس کے دو روز بعد اسے کالج جانا تھا اپنا رزلٹ کارڈ لینے۔

فرحت آنٹی کے گھر والوں کی طرف سے مکمل رضا مندی دی جا چکی تھی جب کہ ادھر سے بھی آج کل میں 'ہاں' ہو جانی تھی۔

چونکہ موبائل امی لے چکی تھیں تو اسے معلوم نہ ہو سکا کہ کشف کالج کس وقت جائے گی۔ اب اسے اپنے حساب سے ہی کالج جانا تھا۔ ہاں کل رات وہ چپکے سے گھر کے لینڈ لائن سے عاطف کو فون کر کے صورت حال بتا چکی تھی۔ ساری بات کے دوران عاطف صرف ایک ہی بات کہتا رہا کہ

''تم کچھ کرو نا، سمجھاؤ نا اپنے گھر والوں کو۔''

اسے عاطف کے لہجے میں کوئی خاص پریشانی اور فکر محسوس نہیں ہو رہی تھی مگر یہاں بھی وہ سب نظر انداز کیے اس کے لفظوں پر ہی یقین کیے ہوئے تھی۔

صبح وہ پوائنٹ سے کالج آگئی جس وقت کالج پہنچی گیارہ بج رہے تھے۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے ہمت کر کے امی سے موبائل مانگا تو انہوں نے نہایت سرد لہجے میں انکار کر دیا۔ اس کی دوبارہ کچھ بولنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

''خبردار! اگر اس کشف سے ٹاکرا ہونے پر تم پھر سے دوستیاں گانٹھ کر بیٹھیں اب کے تمہارے باپ اور بھائی سے ٹانگیں تڑوا دوں گی تمہاری۔'' نکلتے نکلتے وہ اسے سختی سے تنبیہہ کرنا بھولی نہیں تھیں۔

کالج آکر اسے فوراً ہی رزلٹ کارڈ مل گیا تھا جب کہ اس کا خیال تھا ایک ڈیڑھ گھنٹہ تو ضرور ہی لگ جائے گا۔ وہ واپسی کا سوچ ہی رہی تھی جب اچانک اس کے دماغ میں کوندا سا لپکا تھا۔

''کیوں ناں وہ کشف کی طرف چلی جائے۔ عاطف کو پوری طرح صورت حال سے واقف کروانا بھی تو ضروری تھا۔ پرسوں رات تو بس جلدی جلدی میں اصل وجہ نہ بتا پائی تھی اب کیوں نہ جا کر تفصیلاً اس سے بات کر کے کوئی راستہ نکالا جائے۔'' اس سوچ کے آتے ہی وہ فوراً کالج کا گیٹ پار کر گئی۔ بس میں اسے مسلسل اندر ہی اندر یہ بات ستاتی رہی کہ یوں گھر والوں سے اجازت لیے بغیر ان سے چھپ کر کشف کے گھر جانا، وہ ٹھیک نہیں کر رہی مگر اپنے دل و دماغ میں ہوتی اس تحریک سے نظریں چرائے، کان بند کیے وہ بس کی سیٹ پر جا بیٹھی۔

کشف کے گھر کا گیٹ ہمیشہ کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ ٹی وی لاؤنج کا دروازہ کھول کر کشف کے کمرے کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی جب بائیں جانب بنے ڈرائنگ روم کے دروازے کے پیچھے سے اپنا نام سن کر ٹھٹک کر وہیں رک گئی۔ یہ غالباً عاطف کا دوست زبیر تھا۔ وہ پہلے بھی کئی بار اسے یہاں دیکھ چکی تھی۔

''کیا بنا اس نخریلو بی بی کا۔'' زبیر پوچھ رہا تھا۔

''توبہ ہے یار! عجیب مخلوق ہے، مجھے تو لگا تھا اس کو بہلانا پھسلانا کافی آسان رہے گا مگر نہ جی یہ تو حنا سے بھی زیادہ ڈھیٹ چیز نکلی فون پر جتنی مرضی باتیں کروا لو مگر جو کہہ دو کہ چلو باہر چلتے ہیں۔ ساتھ لنچ کرتے ہیں، موی دیکھتے ہیں یا پارک میں چلتے ہیں محترمہ کا وہی جواب، نہیں یہ مناسب نہیں ہے۔ اچھا نہیں لگتا حد ہے بھئی بینڈ وین کی بھی اور خاص

طور پر اس کے بھائی نے جو میری بہن کی بے عزتی کی تھی۔ کشف نے بولا تھا مجھے کہ بدلہ لیے بغیر چھوڑنا نہیں ہے اس بہن جی کو مگر وہ تو گلے کا ہار ہی بن گئی ہے بدلہ کیا خاک لوں۔'' عاطف ایسے بول رہا تھا۔ جیسے کوئی کڑوا بادام چبا رہا ہو جب کہ باہر کھڑی ارینہ مبشر کسی تیز آندھی کی زد میں تھی۔ اندر کمرے میں زبیر کا قہقہہ گونجا تھا۔

''تو یار! تم کو پہلے ہی منع کیا تھا کہ اپنے وہ ٹائپ کی نہیں ہے پر تم کو تو یہ تجربہ بھی کرنا تھا خیر چلو اب چھڑواؤ جان۔'' زبیر بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''پرسوں آیا تھا فون، عاطف میرے گھر والے میری شادی کروا رہے ہیں، انہیں سب معلوم ہو گیا ہے تم پلیز جلدی اپنے گھر والوں کو رشتے کے لیے بھیجو۔ ناں سینس۔'' عاطف اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے بول رہا تھا۔ زبیر جو مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر رہا تھا۔ ایک بار پھر قہقہہ لگا بیٹھا جب کہ وہ الٹے پاؤں واپس بھاگتی ہوئی اس گھر سے نکلی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا سڑک پر ہی بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اس لیے نہیں کہ عاطف نے اسے دھوکا دیا تھا بلکہ رونا اس بات کا آ رہا تھا کہ وہ اتنے عرصے سے اندھی بنی رہی تھی۔ اپنوں سے بڑھ کر ایک آوارہ لڑکے پر یقین کرتی رہی تھی۔ گھر والوں کے اتنا سمجھانے کے باوجود آج وہ اس گرے ہوئے لڑکے سے ملنے یہاں آ گئی تھی مگر شاید اللہ اس کے سامنے سچ لانا چاہتا تھا کہ وہ خود اپنے کانوں سے سچ سنے تاکہ شک کی کہیں کوئی گنجائش ہی نہ رہے اور سچ جان کر وہ اب زمین میں گڑھتی جا رہی تھی۔ بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے وہ بس پر سوار ہو کر گھر پہنچی تھی اور شام تک خود کو سنبھالنے کے بعد اس نے امی کے پاس جا کر پورے دل سے معافی مانگی تھی اور وہ بھی آخر ماں تھیں، آنکھوں میں ندامت دیکھ کر ان کا بھی دل پسیج گیا تھا اور جب وہ خود اپنے کیے پر اتنی شرمندہ تھی تو ماں بھلا کیسے نہ معاف کرتیں۔

☆......☆

وہ اپنا پور پور سجائے عباد حسن کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس کو اپنی تمام غلطیوں کا شدت سے احساس ہوا تو پھر ماں باپ کے فیصلے پر اعتراض کرنے کی ہمت ہی نہ ہوئی حالانکہ عباد حسن کے بارے میں اس کی رائے اب بھی وہی تھی کہ وہ بہت سخت مزاج اور کھڑوس سا ہے جب کہ وہ شروع سے شوخ و چنچل مزاج تھی۔ اب جو یہ ساتھ جڑا تو وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ جانے اس کے ساتھ کیسا رویہ ہو گا عباد حسن کا۔ اس کا دل مسلسل یہ سوچ سوچ کر گھبرا رہا تھا۔

کمرے کا دروازہ ہلکے سے کھٹکے سے کھلا اور پھر بند ہوا تھا۔ عباد حسن کمرے میں داخل ہو چکا تھا، وہ سرعت سے سیدھی ہو کر بیٹھی دل تھا کہ پوری رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

''السلام علیکم!'' عباد حسن اس کے عین سامنے بیڈ پر براجمان ہو چکا تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس کا حلق تک خشک ہو گیا۔

''یہ لیجیے آپ کا تحفہ۔'' عباد نے چھوٹا سا کیس کھول کر اس کے سامنے کیا جس میں بڑی خوب صورت انگوٹھی تھی۔

''لیں نا۔'' وہ یونہی بیٹھی رہی تو عباد بولا تھا۔

''ج......جی......'' اس نے ہڑبڑا کر کہتے ہوئے کیس تھام لیا۔ اس کی ہڑبڑاہٹ پر عباد حسن کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

''ارے میں کوئی آدم خور ہوں جو آپ اس قدر ڈر رہی ہیں، گھبرا رہی ہیں۔'' وہ پرمزاج انداز میں بولا تو اس نے حیرانگی سے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے بارے میں اس کی

رائے تھی کہ اس کے شاید مسکرانے پر بھی ٹیکس لگتا ہے اور اس وقت وہی شخص قہقہے لگا رہا تھا۔ حیرانگی تو بجا تھی۔

''بہت ہینڈسم ہوں نا؟'' اس کا یوں یک ٹک دیکھنا عباد حسن نے اپنے ہی مطلب میں ڈھالا۔

''نن......نہیں۔'' وہ سٹپٹا کر نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے بولی۔

''مطلب میں ہینڈسم نہیں ہوں؟'' وہ ذرا سخت لہجے میں بولا تو اس کی دھڑکنیں رکنے کے در پر ہو گئیں۔

''نن......نہیں......میرا مطلب ہاں......مطلب ہے......'' وہ گھبرا کر عجیب بے ربط انداز میں بولنے لگی جس پر عباد کا قہقہہ ایک بار پھر گونج اٹھا۔

''اوہ مائی گاڈ! یو آر سو کیوٹ مائی ڈیئر انوسینٹ وائف۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر خود سے قریب کرتے ہوئے بولا تو اریبہ کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے۔

''میں......میں......وہ......'' کچھ بولنے کی کوشش میں وہ بس اتنا ہی بول پائی تھی۔ عباد کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

''ڈیئر وائف! اب یہ میں وہ......وہ میں چھوڑیئے مجھے یہ بتائیں کہ آپ کا یہ گلہ کیسے دور ہوگا کہ آپ کے سرتاج کھڑوس ہیں، ان کے ہنسنے پر پابندی ہے اور تو اور ان کے ماتھے کی سلوٹیں بھی گننا محال ہیں۔'' عباد حسن بھرپور شرارت آنکھوں میں لیے اس سے پوچھ رہا تھا جب کہ وہ آنکھیں پھاڑے اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

''بجو یہ ٹھیک نہیں کیا آپ نے۔'' وہ دل ہی دل میں بجو سے مخاطب تھی۔ عباد حسن نے جھک کر اس کی آنکھیں چوم لیں۔ وہ ہڑبڑا کر اپنی سوچوں سے نکلی۔

''جانِ عباد! اصل میں تمہارا اور میرا آمنا سامنا گن کر تین یا چار بار ہی ہوا ہوگا وہ بھی دس سے بیس منٹ کے لیے اور اتفاق سے ہر بار میں کسی نہ کسی بات کو لے کر پریشان تھا جس کی وجہ سے چہرے کے تاثرات ایسے تھے ورنہ میں اور سنجیدہ مزاج......توبہ کرو یار اور اب تو آپ آگئی ہیں ہماری زندگی میں، بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ آپ کے شوہر کی شرارتوں سے تو سبھی پناہ مانگتے ہیں اور ہم نے سنا ہے شرارتی آپ بھی بہت ہیں۔ خیر اندازہ تو ہو ہی گیا تھا ان تین، چار ملاقاتوں میں بھی پر پھر عائزہ بجو کے بتانے پر کنفرم بھی ہو گیا اور ہاں، ایک اور بات یہ جو آپ کے سامنے بندہ بیٹھا ہے نا۔ یہ آج آپ کا نہیں ہوا یہ اسی روز آپ کا ہو گیا تھا جس روز پہلی بار آپ کو دیکھا تھا حالانکہ اس روز بھی ایک ٹینشن سوار تھی سر پر مگر آپ کو دیکھنے کے بعد پھر ٹینشن سے بڑھ کر ایک حسینہ سوار ہو گئی اور پھر ٹینشن تو اتر گئی مگر وہ حسینہ اور اس کا جادو آج تک سر پر سوار ہے اور اب تو اللہ پاک سے دعا ہے کہ یہ جادو تاعمر یونہی سوار رہے۔'' عباد نے کہتے ہوئے محبت سے اس کی پیشانی چوم لی تو اس نے بھی طمانیت سے آنکھیں موند کر سر عباد حسن کے کندھے پر ٹکا دیا اور اس وقت وہ دل کی گہرائیوں سے اپنے رب کی اور اس کے بعد اپنے ماں، باپ، بجو اور بھائی کی شکر گزار تھی کہ انہوں نے اسے غلط راستے پر اتنی دور نہیں نکلنے دیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے بھٹک جائے اور اتنا اچھا اور محبت کرنے والا ہمسفر اس کے لیے چنا تھا وہ خدا کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔ عباد حسن نے بڑی چاہت سے اس کے گرد اپنے مضبوط بازوؤں کا حصار باندھ دیا تھا۔

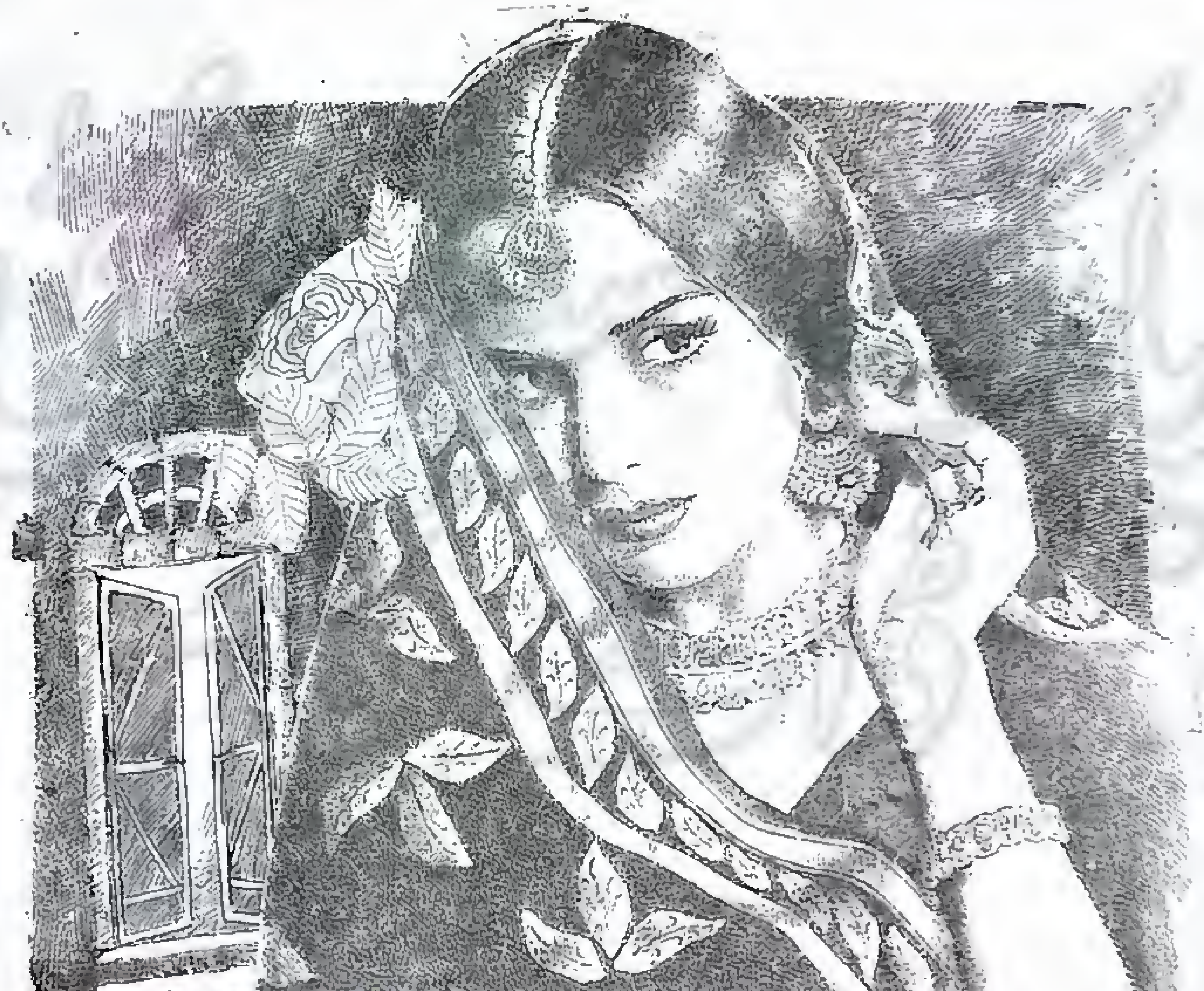
میرے سپنوں کو صدا یونہی مہکتا رکھنا
میں نے تھاما ہے تیرا ہاتھ بڑے مان کے ساتھ

......☆......

عائشہ انصاری

افسانہ

کیسا مسیحا



فیکٹری سے واپس آتے ہی وہ چار پائی پر گر سی گئی۔ درد سے کمر دوہری ہوگئی تھی۔ مگر اماں آتے ہی کچن میں کھانا بنانے چلی گئیں۔ ابا کمرے میں لیٹے وقفے وقفے سے کھانس رہے تھے وہ بے چارے آئے دن بیمار رہتے تو کام سے چھٹیاں کرنی پڑتی تھیں اور تنخواہ کٹ کر ملتی جس سے گھر کا خرچ پورا نہ ہوتا۔ اماں نے ابا سے اجازت لے کر فیکٹری میں کام کرنا شروع کر دیا اور کومل کو بھی ساتھ لے جاتی تو پیسے زیادہ مل جاتے۔ یوں کھینچ تان کر گھر اور پڑھائی کے خرچے پورے کیے جاتے۔ صائم اور فائق کو اچھے اسکولز میں داخل کرایا گیا تھا تاکہ وہ بن کر قابل ہو جائیں۔ کومل نویں جماعت میں تھی۔ اسکول سے آکر فیکٹری چلی جاتی تو کھڑے رہ کر کام کرنے سے اس کی ٹانگوں اور کمر میں درد ہونے لگا تھا۔

''کومل بیٹی! اٹھ جاؤ اور کمرے میں کپڑا بچھا کر برتن رکھو تمہارے بھائی ٹیوشن سے آتے ہی ہوں گے۔'' اماں نے اسے کچن سے آواز دی۔

''جی اماں!'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اٹھ گئی۔ وہ بالکل اماں جیسی تھی ہمدرد، صابر اور ہمت والی۔

''شاباش میری بیٹی! بس کچھ دن ٹھہر جا پیسے جمع ہو جائیں تو تمہیں سرکاری اسپتال سے دوائی لا دوں گی۔ دور بھی اتنا ہے کرایہ بھی بہت لگتا ہے۔''

☆......☆

''لیڈی ڈاکٹر کہاں ہوتی ہیں؟'' ریسپشن سے پوچھ کر وہ دونوں ایک سمت چل دیں۔ کافی دیر بعد ان کی باری آئی تھی مگر ڈاکٹرز کو چائے پینے کا خیال آ گیا۔ مریضوں کی پرواہ کیے بغیر وہ سب چائے کے ساتھ لوازمات سے انصاف فرمارہے تھے لیکن باہر بیٹھے مریضوں کو وہ انصاف سے چیک اب کرتے ہیں یا نہیں؟ اس بات سے انہیں کوئی غرض نہ تھی۔ غرض صرف تنخواہ سے تھی اپنی مرضی سے وقت کے بعد اور وقت سے پہلے اسپتال سے آنا جانا اور آئے دن کم تنخواہ کا بہانہ بنا کر ہڑتال کر دینا۔ اس بات سے بے پرواہ کہ ان کے ہاتھوں کتنے مریض شفایاب ہونے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ہزاروں لوگوں کی آہ بھی ان پر اثر نہ کرتی۔ یہ کیسا مسیحا ہیں؟ مسیحا تو ہر وقت احسان کرنے کو تیار ہوتا ہے؟ اگر مسیحائی نہ کرے تو کون کرے گا؟

تقریباً آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد ان کو اندر بلا لیا گیا۔ کمرہ یخ ٹھنڈا تھا ان کے جسم نے جھرجھری لی۔ باہر کا موسم سخت گرم تھا۔

''مریض کون ہے یہاں بیٹھیے۔'' ایک ڈاکٹر نے کہا جو گلابی اور شاداب رنگت کی خاتون تھی۔ جہاں کوئی فکر نظر نہیں آ رہی تھی۔ ان چہروں کو کیا پتہ کہ کون فاقے کر کے پیسے جمع کر کے یہاں پہنچا ہے؟

''میری کمر اور ٹانگوں میں درد ہے کچھ دن سے اور......'' کومل نے اتنا ہی کہا تھا کہ ڈاکٹر نے دوائی لکھ دی اور پرچی اسے پکڑا دی۔

''یہ دوائی تین دن کھانی ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''تین دن بعد پھر آنا ہے کیا؟'' اس نے پرچی دیکھ کر کہا۔

''آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اسی سے ٹھیک ہو جاؤ گی۔ نرس اور کتنے مریض ہیں؟'' ڈاکٹر صاحبہ بتا کر نرس سے مخاطب ہوئی تو وہ باہر آ گئیں۔

''اماں! ڈاکٹر نے ٹھیک سے سنا بھی نہیں نہ چیک کیا۔'' اس نے معصومیت سے کہا۔

''بیٹا! وہ اشارے سے ہی ہماری سمجھ لیتے ہیں ان کو سب پتہ ہوتا ہے۔'' وہ دونوں بس میں بیٹھ رہی تھیں۔

☆......☆

رات وہ دوائی کھا کر وہ سو گئی تھی مگر رات کے کسی پہر اس کا دل گھبرانے لگا وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی کہ اس کا سر چکرایا وہ فوراً زمین پر بیٹھ گئی۔ وہ اماں کو آوازیں دے رہی تھی مگر اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی اس کا دل

خراب ہونے لگا تو سنک کی طرف دوڑی۔ اماں کو الٹیوں کی آواز سے جھاگ آئی تو کومل کو سنک پر کھڑا دیکھا اس کی طرف لپکی۔

''ہائے میری بچی کیا ہوا تمہیں؟'' اماں نے اس کو سہارا دیا۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر پلٹی اماں سے چارپائی تک لائی تھیں۔

''لیٹ جا بیٹی! میں تمہارے لیے سفوف کا قہوہ بنا کر لاتی ہوں۔'' ساری رات یوں ہی گزر گئی۔ دوائی بہت تیز تھی جس سے کومل کے معدے پر برا اثر پڑا تھا۔

☆......☆

''اماں! دیکھیں ناماموں جان آئے ہیں۔'' صائم اور فائق ماموں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ بھائی کو دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوئی تھیں۔ کام کی وجہ سے وہ کم ہی ان کے ہاں آتے تھے مگر فون کرتے رہتے۔ اماں کو فکر لگ گئی کہ بھائی کو کیا کھلائیں۔ وہ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر کچن کی طرف بڑھنے لگیں۔

''آپا یہ کچھ سامان ہے کچن میں لے جائیں۔'' شاپرز انہیں تھماتے ہوئے کہا۔

''اس کی کیا ضرورت تھی۔'' اماں بولیں۔

''آپا! بھائی ہوں آپ کا اتنا حق تو ہے۔'' وہ مسکرائے اماں نے کچن میں آ کر شاپرز کھولے۔ کچھ کھانے تھے اور کچھ میں راشن۔

''بے شک اللہ دلوں کے حال جانتا ہے۔'' اماں مسروری اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں۔ پھر بھائی جاتے جاتے ان کے ہاتھ میں چند ہزار تھما گئے انکار کے باوجود بھائی زبردستی دے گئے۔

''اللہ تو ہی مشکل کو حل کرنے والا ہے۔ اب میں اپنی کومل کا علاج اچھے اسپتال سے کرواؤں گی پیسے دیکھ کر ڈاکٹر اچھے سے علاج کرے گا۔'' وہ ایک صابر عورت، اچھی بیوی اور عظیم ماں تھیں جو آخری وقت تک اللہ کے احسان کا انتظار کرتیں مگر شکوہ زبان پر نہ لاتیں۔

......☆......

افسانہ

ہمارے بابا

شہر خموشاں کی طرف جاتی کچی سڑک پر سیاہ پجارو کے ٹائر چرچرائے تھے اور گاڑی ایک جھٹکے سے قبرستان کے گیٹ کے پاس رکی تھی۔
''بہت ہی خراب سڑک ہے یہاں کی''۔ موسیٰ



[illegible]

[illegible] بال کا ایک دن دیتے
[illegible] نہیں ہوا تھا، وہ اس کے
[illegible] واقف تھا۔
[illegible] بات کر لوں قبر کے
[illegible] ہو گیا تھا جبکہ وہ
[illegible] طرح سے جاتے ہوئے
[illegible] بات بڑھ گئی۔
[illegible] خاموشی اس کی افسردگی کو
[illegible] آہستہ آہستہ جاتی مطلوب قبر



تک پہنچ گئی، ایک پل کے لئے اس کی نگاہیں جم سی گئی تھیں اور بے یقینی کی کیفیت ایک بار پھر غالب آ گئی تھی، کہنے کو پانچ برس کا عرصہ بیت گیا تھا اور وہ جب بھی آتی یونہی بے یقینی سے قبر کو تکتی اسے یقین ہی نہ آتا وہ اسے چھوڑ کر گہری نیند جا سوئے ہیں۔ اتنا رنج تو اس نے ماں کی موت کا بھی نہیں اٹھایا تھا لیکن بابا وہ تو اس کی زندگی کا اثاثہ تھے۔ ان کی قبر پر برگد کا گھنا درخت سایہ فگن تھا ہوا کے زوروں پر جھومتے پتے یوں لگتے تھے جیسے ہوا کی لوری دے رہے ہوں، وہ جب بھی آتی تھی برگد کے گھنے درخت کو بھی یونہی حیرت سے تکتی تھی۔ بڑی عجیب بات تھی بابا کو پودوں سے عشق تھا جیسے، وہ ان کی دیکھ بھال ایسی محبت سے کرتے تھے جیسے کوئی ماں اپنے نومولود بچے کی کرتی ہو اور آج انہیں قبر بھی ملی تھی تو ایک سایہ دار درخت کے نیچے جبکہ پتوں کا جھکاؤ بھی قبر کے اوپر تھا، یوں لگتا تھا جیسے اپنے سائے میں چھپائے ہوئے ہوں۔

سہ پہر کا وقت تھا مگر قبرستان کی خاموشی ایسی تھی کہ روح کو گھائل کر دے، درخت پر پرندوں کی چہچہاہٹ بھی دم توڑ دیتی تھی اس خاموشی کے آگے وہ کچی زمین پر بیٹھ گئی تھی اور ہولے سے بابا کی قبر پر ہاتھ پھیرا تھا جیسے ان کے وجود کو محسوس کر رہی ہو، آنسو بے اختیار رخساروں سے بہہ گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد دن کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا تھا جب اس نے یاد نہ کیا ہو، اور وہ کیسے یاد نہ کرتی ان کے بغیر وہ ادھوری تھی، کوئی بھی کامیابی محرک کے بغیر نہیں ملتی اور اس کی زندگی کا محرک بابا ہی تو تھے جبھی وہ ہر مشکل مرحلہ طے کرتی چلی گئی تھی۔ بلاشبہ زندگی بدل گئی تھی، کچھ بھی پہلے جیسا نہ رہا تھا مگر ان کی یاد کسی سائے کی طرح اس کے وجود سے چمٹ گئی تھی۔

☆.........☆.........☆

''اٹھ جا بھولے کب تک سوگ مناتا رہے گا''۔ صحن میں بھابی نے کپڑوں کی بالٹی پٹخی تھی اور کپڑوں کو زوردار طریقے سے جھاڑتے ہوئے تار پر پھیلانے لگی، ساتھ ہی ساتھ بڑبڑاہٹ جاری تھی وہ جو صحن کے کنارے بچھے تخت پر لیٹے ہوئے آنسو بہائے جا رہا تھا بھابی کی پاٹ دار آواز پر ایک دم سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

''غضب خدا کا دو ماہ گزر گئے پر تیرا سوگ تو کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا، جانے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا''۔ قطار کے ساتھ تار پر کپڑے پھیلتے گئے ساتھ ہی بھابی کی قینچی بھی تیزی اختیار کر گئی، جب تک وہ کپڑے پھیلاتی رہیں زبان چلتی رہی اور وہ بت بنا سنتا رہا، ابھی تو اس نے ٹھیک طرح سے بچپن کی سرحدوں کو بھی پار نہ کیا تھا کہ اماں ساتھ چھوڑ گئیں، ابا تو خیر اس کی پیدائش کے دو سال بعد ہی ساتھ چھوڑ گئے تھے لیکن اماں، اماں کے لمس کو تو اس نے ابھی محسوس کرنا شروع کیا تھا ٹھیک سے اور پھر اماں سے اس کی انسیت بھی بہت تھی، ہر وقت اماں کے گھٹنے سے جڑا رہتا تھا، اماں تخت پر بیٹھی تسبیح کے دانے گنتی رہتی تھیں اور وہ بھی سارا وقت ان سے چمٹے ان کی گود میں سر دیئے دنیا جہاں کی باتیں کرتا رہتا، اماں کی موت حیرت انگیز طور پر اس کی زندگی پر اثر انداز ہوئی تھی، گھر کے ہر کونے سے ان کی خوشبو محسوس ہوتی تھی اور صحن میں بچھا تخت گویا وہ تو لگتا تھا اماں ابھی بھی وہاں براجمان ہیں، ان کی یاد جتنی شدت اختیار کرتی اس کے آنسو بھی ویسے ہی رفتار پکڑ لیتے تھے۔ لیکن بھابی کی اب بس ہو گئی تھی، اس کا یوں فارغ رہنا انہیں کھلنے لگا تھا اس لئے آج اسے آڑے ہاتھوں لینے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔

''اسکول سے تو تیرا نام کٹ ہی چکا ہے اور یوں ٹسوے بہا کر زندگی گزرنی بھی نہیں ہے اس لئے اب میں تجھے یوں روتے نہ دیکھوں، سیدھی طرح اٹھ جا اور میرا کچھ ہاتھ بٹا''۔ اچھی طرح دھنائی کرنے کے بعد وہ اپنے مقصد پر آ ئیں، اس کی گردن ہنوز جھکی ہوئی تھی اور آنسو آنکھوں کے کناروں پر جمے ہوئے تھے۔

''ببلو کی چھٹی کا وقت ہو رہا ہے جا کر اسے لے آ اور آتے ہوئے دو کلو آلو بھی لیتے آنا''۔ وہ اس کے ہاتھ میں سو کا نوٹ تھماتے ہوئے اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ وہ اپنے غموں اور آنسوؤں کی پوٹلی کو دل کے صندوق میں بند کر کے اٹھ گیا تھا۔

''اور جلدی کرنا یہ نہ ہو کسی اور ہی کاموں میں لگ جائے''۔ صحن سے جب اپنی سائیکل جانے کے لئے نکالنے لگا تب بھابی نے کچن کی کھڑکی سے ہانک لگائی جو صحن کی طرف کھلتی تھی، وہ اثبات میں گردن ہلاتا باہر نکل گیا تھا۔

☆.........☆.........☆

زندگی نے ایک نئی کروٹ لے لی تھی زندگی کا یہ آغاز نجانے اچھا تھا یا برا، پر اس کے لئے کچھ خاص ثابت نہیں ہوا تھا بلکہ یوں کہنا بہتر تھا کانٹوں بھرا سفر شروع ہو گیا تھا۔ صرف بارہ سال کی عمر میں زندگی کی بھاری ذمہ داریاں اس پر لاد دی گئی تھیں۔ صبح ہی مرغے کی بانگ کے ساتھ اس کی صبح کا بھی آغاز ہو جاتا تھا چونکہ بھابی بھی جلدی اٹھتی تھیں تو یہ بات اس پر بھی لازم تھی، سب سے پہلا کام دودھ والے سے دودھ لینے کا شروع ہوتا تھا۔ بھابی ناشتہ بناتی تھی اور وہ جھاڑو تھام کر صحن کی صفائی شروع کر دیتا، جب تک بھابی ناشتہ بنا کر فارغ ہوتیں وہ بھی صحن کو صاف کر چکا ہوتا۔ پھر ناشتہ اکٹھے کیا جاتا بھائی ناشتے کے بعد فیکٹری کے لئے روانہ ہو جاتے، ساتھ چار سالہ ببلو کو اسکول بھی چھوڑ جاتے، اس کا اسکول کے لئے جانا بالکل ممنوع قرار دے دیا گیا تھا بقول بھابی کے کہ اسکول جا کے اس نے شیطانیاں ہی کرنی ہیں اس لئے گھر میں ہی ٹکا رہے۔ گھر میں بھابی کا حکم حرف آخر ہی ہوتا تھا اس لئے چوں چراں کی ہمت تھی ہی نہیں۔ وہ اسکول جانے کا جنون کی حد تک شوق رکھتا تھا لیکن اب سب بس شوق تک محدود ہو گیا تھا۔ پھر باقی کا سارا دن بھابی کے ساتھ گھر کے کام کاج میں ہی مصروف رہتا، کچھ ہی عرصے میں وہ ہر کام میں تاک ہو گیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ بھابی کا آرام بڑھتا جا رہا تھا اور اس کا کام، بھولا واقعی بھولا ہی ثابت ہوا، گھر کے کام کم تھے کہ آس پڑوس کے کام بھی خود پر لاد لئے تھے۔ کبھی پڑوس کی دیوار سے جھانک کر جمیلہ سبزی منگوانے کا کہتی تو کبھی گھر کے سودا سلف کے لئے پکارا جاتا، دیکھتے ہی دیکھتے اردگرد کی عورتوں نے بھی ایسے کام اسے تھما دیئے تھے اور وہ بھی اف کئے بنا خود پر لادتا چلا گیا۔ نہ سر پر ماں تھی نہ باپ جو اس کی فکر میں ہلکان ہوتے، اس لئے ذمہ داریاں تھیں کہ بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔

''اے بھولے جا ذرا دو سگریٹ کے پیکٹ بھی لیتے آنا''۔ ابھی ابھی وہ گھر کا سودا سلف لے کر لوٹ رہا تھا راستے میں دوستوں کے ساتھ تاش کھیلتے اسلم بھائی نے اسے روک کر رعب سے کہا تھا۔ اثبات میں گردن ہلاتا دوبارہ لوٹ گیا تھا، یوں لگتا تھا وہ کوئی گیند ہے جو صرف دوسروں کی ٹھوکروں پر ہے اس کا بھی دن دوسروں کی ٹھوکروں پر ہی گزرتا تھا راستے میں پتھر کو وہ اپنے پاؤں کی ٹھوکروں سے آگے بڑھاتے ہوئے بے دردی سے سوچ رہا تھا۔

وقت گزر رہا تھا اور اس کی سوچ بھی بڑھنا شروع ہو گئی تھی، وہ عمر کے اس دوراہے پر پہنچ رہا تھا جب طبیعت میں عجیب سا جنون پیدا ہو جاتا ہے وہ پندرہ برس کا ہو گیا تھا، طبیعت میں ایک انتشار سا ابھر رہا تھا وہ اب باغی سا ہونے لگا تھا۔ دل چاہتا تھا جو اس کے منہ لگتا ہے اسے وس سنا دے، جو کام کہتا ہے اس کی زبان کھینچ لے۔ اسے خود نہیں معلوم تھا وہ کیوں ایسا چڑچڑا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے اندر کی آگ باہر نکال دینا چاہتا تھا مگر پھر بھی چپ رہتا، گھٹتا رہتا، وہ بزدل تھا جبھی زبان بھی ساتھ نہ دیتی تھی۔ بھابی کے آگے تو وہ گونگا ہی ہو جاتا تھا اور بھابی اس کی جھکی گردن اور فرمانبرداری پر اندر تک سرشار ہو جاتی تھی۔

چھٹی کے وقت اسکول سے باہر آتے بچوں کو

دیکھ کر وہ رک سا گیا تھا۔ ہنستے کھلکھلاتے بچے گھروں کی طرف رواں دواں تھے، یونیفارم میں ملبوس کندھوں پر بیگ لٹکائے وہ اسے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ وہ یک ٹک دیکھے گیا، ہر ایک بچے کو یہاں تک کے پورا اسکول خالی ہو گیا مگر وہ سیر نہ ہوا، اس کے دل میں ہوک سی اٹھ رہی تھی اور بھابی پر بے پناہ غصہ آ رہا تھا جس نے اسے پڑھائی سے دور کر دیا تھا۔ اماں کا خواب تھا وہ افسر بنے اور اس خواب کو پورا کرنے کا اس نے بہت ہی کم عمر میں عہد کر لیا تھا مگر سب بے سود تھا، کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ اسکول کے باہر اب سناٹا چھا گیا تھا وہ بھی جیسے ہوش میں آ گیا تھا تمام سوچوں اور خواہشوں کو پس پشت ڈال کر واپسی کی راہ لی تھی۔ اس نے اپنے مطلوبہ پتھر کو دیکھا جو نجانے کہاں کھو گیا تھا بالکل اس کی خواہشوں کی طرح جسے بھابی نے واقعی ٹھوکر مار کر اڑا دیا تھا، اس نے کسی دوسرے پتھر کو ٹھوکر مار کر آگے بڑھانا شروع کر دیا، اپنے اندر کی گھٹن اس پر نکالتا وہ گھر کی جانب بڑھ گیا تھا۔

☆............☆............☆

ڈھلتی شام کا وقت تھا ڈوبتی شام کے ملگجے سائے ہر سو پھیل گئے تھے، پرندوں کی چہچہاہٹ بھی گہرے سایوں میں جیسے گم ہونے لگی تھی شفق پر پھیلی نارنجی روشنیاں اب اندھیروں میں تبدیل ہونے لگی تھیں، آسمان پر اڑتے پرندوں کا غول اپنے گھونسلوں کی طرف رواں دواں تھا، وہ بغور انہیں تک رہا تھا، پودوں میں کھاد ڈالتے ڈالتے وہ ایک پل کے لئے بھول ہی گیا وہ کیا کام کر رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک پرندوں کے غول کو وہ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، اس وقت اسے ان پر بڑا رشک آ رہا تھا سارے دن کی تھکاوٹ سے چور وہ کتنے مست و مگن اور پر سکون سے اپنے آشیانے کی طرف رواں تھے جہاں جا کر انہوں نے اپنی ساری تھکن کو اس آشیانے کے حوالے کر دینا تھا اور ایک پر سکون نیند سو جانا تھا، پر اس کے نصیب میں یہ آشیانہ بھی نہ تھا، اسے خاک کا بستر منظور تھا اگر اسے کوئی یہ یقین دلا دیتا اب اسے کوئی پریشان نہیں کرے گا، اس کے خوابوں کے بیچ کوئی حائل نہیں ہو گا، سارا دن تو وہ کاموں میں مصروف رہتا خواب کوئی کیا خاک بنتا، سیاہ رات میں چاند کی چاندنی کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے خوابوں کا سیاق و سباق ہی کرتا رہتا تھا جس کا جواب رنجشوں میں ہی ملتا۔

سیاہ رات میں آسمان پر چمکتے چاند ستارے اماں کی بے حد یاد دلاتے تھے، وہ دن بھلے تھے جب اماں کی گود میں سر رکھے پریوں کی کہانیاں سنی تھیں، اسے صرف پریاں پسند تھیں کبھی بھی راجا، رانی، بادشاہ، ملک یا جانوروں کی کہانیوں میں اسے کبھی قطعی دلچسپی محسوس نہ ہوئی تھی، چاندنی رات میں پریوں کی کہانیاں سننا سب سے زیادہ بھاتا تھا اسے، وہ کہانیاں سنتے سنتے اتنا محو ہو جاتا تھا کہ سیاہ آسمان پر اپنے پر پھیلائے ستارے والی چھڑی کو تھامے پری خوبصورتی سے آسمان کا طواف کر رہی ہوتی تھیں، اماں کہتی تھیں پریاں چھوٹے بچوں کی خواہشوں کو ضرور پورا کرتی ہیں۔ اسے یاد تھا اچھے سے اور اماں کی فوتگی کے بعد اس نے چاندنی راتوں میں کتنی ہی بار بلایا تھا پر وہ نہ آئیں، وہ رویا بھی تب بھی نہ آئیں، وہ سوچ سوچ کر مزید کڑھ جاتا اب کون ہوگا جو خواہشوں کو پورا کرے گا، اس نے کتنی ہی راتیں یہ سوچ سوچ کر گزاری تھیں، پر اب جب وہ بڑا ہو رہا تھا بے حد افسوس ہو رہا تھا اپنی سوچ پر، کتنا بدھو تھا وہ کہانیوں کو حقیقت سمجھ بیٹھا تھا، پر یہ پرندے، یہ تو حقیقی تھے اور بے حد پر سکون بھی تو پھر اس کے حصے میں کیوں نہ تھا یہ سکون، اس نے شکوہ کیا خود سے اور جب سوچتے سوچتے تھک گیا تو واپس اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ پودوں کو کھاد ڈال کر اچھے سے صاف کر کے پانی ڈال کر تھکے قدموں کے ساتھ اندر روانہ ہو گیا۔

☆............☆............☆

بچپن رخصت ہو گیا تو جوانی میں قدم رکھ دیا، پر زندگی کا معمول آج بھی وہی تھا، اس کی زندگی کی گاڑی سالوں سے ایک ہی جگہ جم گئی تھی، پر اب بڑے بھائی کو فکر لاحق ہونے لگی تھی جوان جہان وجود گھر کے کاموں میں خاکستر ہو رہا تھا، آخر کو اس دن کے لئے منہ میں نوالے تھوڑا ہی ڈالے تھے۔ اب وصولی کا وقت تھا جب یہ بات انہوں نے بھابی کے گوش گزار کی تو ان کی تو گویا جان پر بن آئی، آخر کو گھر کا سارا کام اس پر لادا ہوا تھا اور اگر اب اسے نوکری کے لئے نکال دیا تو سارا کام کون کرتا، بیٹی بھی کوئی نہ تھی لیکن شوہر کو منع بھی نہیں کر سکتی تھیں اس لئے سوچ بچار اس بات پر شروع ہو گئی کہ اسے کون سے کام پر لگایا جائے کہ جس میں فائدہ ہی فائدہ ہو، بڑے بھائی نے تو مختلف نوکریاں تلاش کر لی تھیں، کہیں چوکیدار تو کہیں گھر کی ملازمت تو کہیں فیکٹری میں مزدور لیکن بھابی ہر نوکری مسترد کرتی جا رہی تھیں کیونکہ اس میں تو اس کا سارا وقت گھر سے باہر گزر جاتا تھا، بڑی سوچ بچار کے بعد انہوں نے اس کے لئے پیشہ ڈھونڈ ہی لیا۔

''مالی کی نوکری تلاش کر دو، بھولا اس کام میں ماہر بھی بہت ہے''۔

''پر۔۔۔'' بڑے بھائی کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

''پر ور کچھ نہیں بس یہی ٹھیک ہے''۔ بھابی نے فیصلے پر حتمی مہر لگا دی، بڑے بھائی کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ اس کی کوئی معقول آمدنی نہ ہوتی تھی لیکن بیوی کے فیصلے کے آگے ان کی چلتی بھی نہ تھی اس لئے تلاش جاری کر دی اور کچھ ہی عرصے بعد انہوں نے ایک سرکاری اسکول میں مالی کی نوکری تلاش کر لی، اس نوکری سے وہ کافی مطمئن تھے کیونکہ تنخواہ اگر زیادہ نہ تھی تو ایسی گئی گزری بھی نہ تھی، نہ ہونے سے تو بہتر تھی، بھابی بھی مطمئن تھیں کیونکہ نوکری کے اوقات کار کا دورانیہ کم تھا اور گھر کے کام باآسانی اسی کے سپرد تھے، اب بھی بھولا، بھولا ہی رہا، نہ پہلے کچھ کہا نہ اب اس لئے جس کام پر لگا دیا تھا خاموشی سے لگ گیا تھا۔

☆..........☆..........☆

''اے نادرہ! یہ بھولا کہاں ہے؟'' جمیلہ حسب معمول ٹوہ لینے کے لئے دیوار سے چپکی ہوئی تھی۔ ایک ہفتے سے جب بھی وہ کسی کام سے بھولے کو بلاتی تو خبر ملتی وہ گھر پر ہی نہیں ہے۔ اسے تو گویا کھد بد لگ گئی تھی۔ نادرہ نے پالک کاٹتے ہوئے تیکھے چتون کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں تجھے کیا کام ہے؟''

''اصل میں کئی دنوں سے نظر نہیں آ رہا تو پوچھ رہی ہوں''۔ اس نے فوراً میٹھا لہجہ بنا کر وضاحت دی۔

''سرکاری اسکول میں مالی لگ گیا ہے''۔ وہ سرسری سے لہجے میں بولی، آگے سے وہ جھٹکا کھا کر رہ گئی۔

''اچھا تو نے بتایا نہیں''۔ وہ برا منا کر بولی۔

''کیوں اس میں بتانے والی کیا بات ہے''۔ وہ پھر پالک کاٹنے میں لگ گئی، اس کے شکوے کو کسی خاطر میں نہیں لائی تھی، آگے سے وہ برا سا منہ بنا کر رہ گئی۔

''اچھا چل میں چلتی ہوں پھر''۔ نادرہ کا بگڑا منہ دیکھ کر وہ ہٹ گئی، مایوس سی آگے سے وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

☆..........☆..........☆

جب سے بھولے کی نوکری کا پتہ چلا تھا جمیلہ اس کے آگے پیچھے ہو ہو کر نہ تھک رہی تھی۔ بھابی سے یہ بات چھپی نہ رہی، وہ خاموشی سے صرف ابھی بھانپ رہی تھی، بے فکری یوں تھی کہ بھولا مکمل ان کی مٹھی میں تھا۔

''بیٹا بھولے ذرا بات تو سن''۔ جمیلہ آج دروازے پر ہی جمی کھڑی اس کی راہ تک رہی تھی''۔ اسے آتا دیکھا تو فوراً الرٹ ہو گئی۔

''ہاں خالہ بولو''۔ وہ ہمیشہ کی طرح مودبانہ بولا۔

''بیٹا اندر بیٹھ کے بات کرتے ہیں''۔ اس نے فوراً

اسے اندر آنے کا رستہ دیا تو وہ بھی چاروناچار آ گیا۔
''ثانیہ جلدی سے ٹھنڈا بنا لا، بھولا آیا ہے''۔ اسے صحن میں چارپائی پر بٹھاتے ہوئے انہوں نے ہانک لگائی تھی۔
''ارے نہیں خالہ اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے''۔ وہ فوراً بولا۔
''ارے بیٹا تکلف کیسا تم تو میرے بیٹے کی طرح ہو پھر بے تکلفی کیسی، ویسے بھی اب تو تم عید کا چاند ہی ہو گئے ہو، ذرا جو اپنی جھلک دکھا دو''۔ وہ کرسی پر اس کے سامنے ہی بیٹھتے ہوئے محبت سے بھرپور لہجے میں شکوہ کرتے ہوئے بولیں۔
''نہیں خالہ فرصت نہیں ملتی اب کام سے''۔ اس نے وضاحت دی۔
''ہاں یہ تو ہے تم بتاؤ نوکری ٹھیک چل رہی ہے تمہاری''۔
''شکر ہے خدا کا بہت خالہ بالکل ٹھیک چل رہی ہے''۔
''اچھا خالہ کیا بات تھی، خیریت ہے ناں''۔ وہ اصل مسئلے کی طرف آیا۔
''ہاں ہاں سب خیریت ہے بس تم سے یونہی بات کرنے کا جی چاہ رہا تھا، کافی دن ہو گئے تھے ناں تمہیں دیکھا بھی نہیں، مجھے تو فکر ہونے لگی تھی''۔ وہ متانت سے بولیں۔
''اے ثانیہ آ بھی جا''۔ ساتھ ہی انہوں نے ایک بار پھر ہانک لگائی، اس سے پہلے وہ جانے کی اجازت لیتا۔ ثانیہ نک سک سے تیار ہوئی فوراً ٹرے میں ناشتے کے لوازمات سجائے حاضر ہو گئی تھی، آگے سے وہ شرمندہ سا ہو گیا، یہ زندگی میں پہلا موقع تھا جو اسے اتنی عزت بخشی جا رہی تھی ورنہ تو ہمیشہ اسے کاموں کے لئے ہی یاد کیا جاتا تھا۔
''ارے خالہ تم نے بہت تکلف کیا ہے''۔
''خبردار جو تم نے اب تکلف کا کہا، چلو چپ چاپ کھاؤ، یہ سموسے بھی لو میری ثانیہ نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں''۔ وہ مصنوعی محبت لہجے میں سموئے بولیں اور وہ جھجکتا شرماتا کھانے لگا، اس بات سے بے خبر کہ خالہ کیوں اتنی محبت لٹا رہی ہیں، ثانیہ شرماتی لجاتی آگے پیچھے کیوں ہو رہی ہے، پر بھابی کو سب سمجھ آ رہا تھا روز بروز جمیلہ کا گھلنا ملنا بڑھتا جا رہا تھا، پہلے تو وہ پرسکون تھی لیکن جب سے ثانیہ کے چکر ان کے گھر لگنا شروع ہوئے تھے وہ فکر میں پڑ گئی تھی، وہ جوان تھی بیشک عام سی تھی لیکن جوانی کا رنگ اس کے چہرے پر نمایاں تھا اور مرد کو ڈگمگانے میں دیر نہیں لگتی، اس نے فوراً سوچ کے گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے تھے۔ بھولا بیشک زیادہ نہیں کماتا تھا لیکن مفت کا غلام اتنی آسانی سے دستیاب بھی نہیں ہوتا تھا۔
اب مسئلہ یہ تھا کہ ایسا کیا کرنا چاہئے کہ وہ کہیں ہاتھ سے نکل ہی نہ جائے اور حل صرف اس کی شادی نکلا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ سنگین مسئلہ ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو بھولے کی ہی طرح ہو، جسے وہ خود چلا سکیں اور پھر آخر بہت تلاش کے بعد انہوں نے لڑکی چھانٹ ہی لی، اپنی رشتے کی ایک خالہ کی بیٹی جسے سب پگلی کہا کرتے تھے، وہ ذہنی طور پر کچھ کمزور سی تھی اور یہ بات کم از کم اس کے لئے بہت فائدہ مند تھی۔
پھر اس نے گھر میں بھی یہ اعلان کر دیا کہ اس نے بھولے کی بات پکی کر دی ہے۔ بھولا آج بھی کچھ نہ بولا تھا، اس کی خواہشوں کی تجوری کے تالے کی چابی تو بھابی کے پاس تھی تو پھر اف کیسے کرتا، البتہ یہ خبر جمیلہ کے خواب پر اوس جما گئی تھی، اس نے ہمیشہ بھابی پر رشک کیا تھا کہ کس طرح وہ بھولے کو استعمال کرتی تھی اور اسے داماد بنانے کا مطلب تھا اپنی سلطنت اس پر قائم کرنا مگر جتنی تیزی بھابی نے دکھائی تھی وہ جتنا کرتی اتنا کم تھا۔

☆..........☆..........☆

پگلی اس کی زندگی میں شامل ہو گئی مگر زندگی میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہ ہوئی، اپنے آپ میں گم

رہنے والی گم صم سی اس کی خاموشی کو کیا سمجھتی، بس ایک رشتہ تھا جو نبھ رہا تھا البتہ بھابی کے بہت مزے ہو گئے تھے، وہ اسے دن بھر کاموں میں جتائے رکھتی جبکہ بھولے پر باہر کے کاموں کی ذمہ داری لاد دی گئی تھی، اب وہ اسکول کے علاوہ گھروں میں جا کر بھی کام کرتا تھا، کمائی کا آدھا حصہ بھائی بھاوج کے پاس جانا لازمی تھا۔ بگی کی تو کوئی فرمائش نہیں تھی مگر آنے والے وقت کے لئے اسے فکر لاحق ہونے لگی تھی۔ اب وہ گھر بار والا ہو گیا تھا اور اپنے لئے بچانا بھی ضروری تھا مگر یہ صرف اس کی سوچ تک محدود تھا، بھابی آنے بہانے اس سے پیسے نکلوا لیتی تھی اس لئے ہمیشہ کی طرح اس نے اپنی اس خواہش کو بھی مار دیا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے پندرہ برس کی عمر میں اس بات کو سمجھا پریوں کا کوئی وجود نہیں، اماں اسے صرف خیالی کہانیاں سناتی رہی تھیں کیونکہ جب اس نے اپنے غموں کو دور کرنے کے لئے انہیں دل سے بلایا تو کوئی نہیں آیا پھر سمجھ آ گیا پریاں تو ہوتی ہی نہیں ہیں، لیکن آج جب وہ ایک جوان مرد تھا تو اس بات کو تسلیم کر رہا تھا پریاں ہوتی ہیں، واقعی ہوتی ہیں، اپنے مضبوط ہاتھوں میں اس نے ننھے سے نازک وجود کو بڑی احتیاط سے اٹھایا ہوا تھا اور یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ چاند کی طرح گول چہرے پر گلابیاں بکھری ہوئی تھیں اس کے ننھے منے باریک نقش یوں لگتے تھے جیسے کسی مصور نے پنسل کی نوک سے بنا دیئے ہوں اور جب اس کے نام رکھنے کی باری آئی تو اس نے بے اختیار پری کہا تھا، اس کی آنکھوں کے کنارے نم تھے اور لبوں پر تبسم سجا تھا، اس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ وہ اب تک بے یقین تھا کہ وہ باپ بن گیا ہے، خدا نے اسے بہت حسین تحفہ عطا کیا تھا وہ سجدے میں جھک کر جتنا شکر بجا لا رہا تھا اسے کم ہی لگتا تھا، اماں کے گزر جانے کے بعد جو وہ صحیح معنوں میں خوش ہوا تھا تو اس ننھے وجود کو ہاتھوں میں لے کر ہوا تھا، یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے ستاروں کی بارش ہو رہی ہو، جس کی چہچہاہٹ ہر طرف بکھر گئی تھی۔

☆......☆......☆

پری کی پرورش وہ خود کر رہا تھا اس لئے اس کا ہر کام کرنا اچھا لگتا تھا، وہ باپ تھا مگر ماں کی طرح راتوں کو اس کے لئے جاگتا تھا اسے نہلا دھلا کر کپڑے پہنانا، گود میں کھلانا، کون سا کام نہیں تھا جو وہ نہیں کرتا تھا، وہ بھی بڑی ذہین تھی اس کی گود کی خوشبو کو فوراً محسوس کر لیتی تھی۔ اس کا تو اب باہر کسی کام میں دل ہی نہ لگتا بس دل ایک ہی خواہش کرتا کسی طرح وہ گھر پہنچ جائے اور اسے اپنی گود میں بھر لے، لیکن اسے محنت کرنی تھی بہت سخت، اب ایک ایسا محرک تھا اس کی زندگی میں جو اسے زیادہ سے زیادہ محنت پر اکساتا تھا، اپنے ادھورے خواب پری کی صورت میں مکمل کرنے تھے، جو خواہش اس کی ادھوری رہ گئی تھی اپنی پری کی نہیں رہنے دینی تھی، وہ اسے بہت اونچے مقام پر دیکھنا چاہتا تھا جس کا وہ کبھی خود کے لئے گمان کرتا تھا۔

☆......☆......☆

پری پانچویں برس میں لگی تو اسے اس کے اسکول داخل کروانے کی فکر لگ گئی تھی مگر بھابی بیچ میں آ گئی تھی۔

''بیٹی ہے کل کو بیاہنا ہے پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں، گھر کے کام کاج سکھاؤ یہی کام آئیں گے''۔ یہ کہہ کر انہوں نے سختی سے آرڈر جھاڑا تھا اور ان کے حکم کا مطلب حرف آخر ہی ہوتا تھا اور بھابی کو اس بات کا زعم بھی تھا مگر آج ایسا نہ ہوا تھا، بھابی کی بات سن کر اس کے اعصاب تن گئے تھے اور غصے سے آنکھیں جیسے سرخ پڑ گئی تھیں۔

''پری اسکول جائے گی اور اسے کوئی نہیں روک سکتا، آپ بھی نہیں''۔ وہ ہر لفظ چباتے ہوئے بولا اور غصے بھری نگاہ بھابی پر ڈالتے ہوئے نکل گیا۔ اس کے لہجے میں اتنی تلخی اور آنکھوں میں ایسی سختی تھی کہ وہ کچھ

بول ہی نہ پائیں، ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ ان کی زبان چپ سی ہوگئی تھی اور پھر ہوا بھی یہی۔ پری کا اس نے بے خوف ہوکر ایڈمشن کروایا، اس کی ایک ایک کتاب پر بہت محنت سے اس نے کور چڑھائے، سلیقے سے انہیں بیگ میں رکھا، اسکول جانے کے لئے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیا۔ پری سب بغور دیکھ رہی تھی، باپ کے چہرے سے پھوٹتی خوشی کو بخوبی محسوس کررہی تھی، بابا نے اسے ڈھیروں نصیحتیں کی تھیں ننھے ذہن میں کچھ سمایا تھا کہ نہیں لیکن ایک بات کا اس نے خود سے عہد کرلیا تھا کے وہ ہر وہ کام کرے گی جس سے بابا کو خوشی ملے، بابا اسے بہت عزیز تھے وہ اس سے بہت محبت کرتے تھے یہ بات اس نے کم عمری میں ہی سمجھ لی تھی اور ان کی خوشی پوری کرنا اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب تھا۔

☆............☆............☆

ڈھلتی شام کے وقت پنچھیوں کی چہچہاہٹ بڑھ گئی تھی نارنجی روشنیوں نے ماحول میں بسیرا کرلیا تھا، شام کی ٹھنڈ اتری تو حبس میں بھی کمی آگئی جیسے۔ زندگی کا کارواں رواں دواں تھا آج بھی ہر چیز اپنی ہی جگہ قائم تھی بس کچھ طور طریقے بدل گئے تھے، بھابی اپنی دوپہر کی نیند مکمل کر کے کمرے سے باہر آئیں تو سامنے ہی پودوں میں کھاد اور مٹی ڈالتے بھولے کو دیکھا جس کے پاس پری بیٹھی بڑی توجہ سے سب دیکھ رہی تھی۔ یہ لڑکی انہیں کھٹکنے لگی تھی، بھولا جو کبھی ان کے آگے سر نہیں اٹھاتا تھا اس کے لئے تو کچھ بھی برداشت نہیں کرتا تھا، اب وہ لاکھ کوششوں کے باوجود اس بچی پر حاوی نہ ہو پارہی تھیں، بھولے کے دل میں اس کی محبت سینے کی طرح تھی جسے ختم کرنا ناممکن کام تھا لیکن وہ پھر بھی ابھی تک چپ تھیں اس لئے کہ بھولا آج بھی ان کے کام کرنے میں کوتاہی نہیں برتتا تھا۔ اندیشے تھے صرف مستقبل کے لیکن خود کو وہ یوں تسلی دے دیتی تھیں کہ آخر کو ہے تو بیٹی ہی، اگلے گھر بیاہ جائے گی تو کیا کرلے گی۔ بھولا ان کا غلام تھا اور رہنا تھا، وہ اپنی فاتحانہ سوچ پر مسکرائی تھیں اور اندر کی جانب پلٹ گئیں۔

پری بابا کی ہر ایک حرکت نوٹ کررہی تھی کہ کس طرح وہ پودوں کی صفائی کر کے مٹی اور کھاد ڈال رہا تھا بیشک شام کا وقت تھا مگر موسم گرم تھا جس کی وجہ سے بھولا پسینے میں شرابور ہوگیا تھا، بابا کو یوں محنت کرتا دیکھ کر اسے ہول اٹھ رہے تھے، فکر سے کبھی ان کے ماتھے کا پسینہ پونچھتی کبھی ٹھنڈا پانی پلاتی، بیٹی کی اس محبت پر وہ نہال ہو جاتا اور محبت سے اس کے ماتھے پر بوسا دیتا۔

''بابا آپ مجھے کرنے دیں ناں''۔ اس کی ضد ہنوز برقرار تھی، وہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور نفی میں سر ہلادیا۔

''بالکل بھی نہیں''۔ اس نے صاف کہا، آگے سے وہ منہ بسور کررہ گئی۔ وہ چاہتی تھی وہ کسی بھی طرح اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر آرام کرلیں، وہ چپ چاپ دیکھتی رہی اور اپنی عقل کے مطابق سوچتی رہی۔

''بابا''۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''ہم م م م...'' وہ کام میں ہنوز مصروف بولا۔

''بابا آپ کی کیا خواہش ہے میں بڑے ہوکر کیا بنوں''۔ اس کی بات پر اُس کے ہاتھ کام کرتے کرتے رک گئے، اس نے اس کی جانب دیکھا جس کی ذہین روشن آنکھیں پوری توجہ سے اس پر مرکوز تھیں، وہ دھیما سا مسکرایا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''میں چاہتا ہوں تم بہت پڑھو، میں تمہیں افسر کی کرسی پر بیٹھا دیکھنا چاہتا ہوں، بس یہی میری خواہش ہے''۔ اس کا لہجہ مستحکم اور پرجوش تھا اور لبوں پر وہ خواہش ابھر آئی تھی جس کا خواب اماں نے اس کے لئے دیکھا تھا اور آج اس نے اپنی بیٹی کے لئے دیکھا تھا۔ اس کے دل میں بابا کی بات منجمد ہوگئی تھی اور اس کے ارادے مزید مضبوط ہو گئے تھے، بابا کی آنکھوں میں اس تصور کی جو چمک اس نے دیکھی تھی اسے ہر حال میں پورا کرنے کا خود سے عہد کرلیا تھا۔

☆............☆............☆

وہ مکمل طور پر پڑھائی میں جت گئی، یوں لگتا تھا جیسے زندگی میں صرف ایک ہی مقصد ہو۔ بھولا اسے یوں محنت کرتا دیکھ کر خوش ہوتا تھا اور ہر طرح اس کا خیال رکھتا تھا۔

زندگی کا وقت بند مٹھی میں ریت کی طرح پھسلتا چلا جا رہا تھا، محسوس کرنے کو سب کچھ ویسا ہی لگتا تھا مگر سب ویسا نہیں تھا۔ زندگی بہت تیز ہے وہ کبھی نہیں تھمتی، بس فرق اتنا ہے ہماری زندگیوں کے بدلتے حالات ہمیں محسوس کرواتے ہیں کہ ہاں زندگی بدل گئی ہے، وقت بدل گیا ہے اور سب کچھ ایک ماضی کا قصہ بن جاتا ہے۔

بھابی نے اپنے اکلوتے لاڈلے بیٹے کی شادی بھی بڑے ارمانوں سے کر دی تھی، دیکھنے میں تو لڑکی کیا خوب ہیرا ہی تلاش کی تھی، گوری چٹی لمبی دھان پان سی خوبصورت نقوش والی ماں باپ کی اکلوتی لاڈلی، دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے اور داد دیئے بنا رہ نہ پائے، مگر وہ زیادہ عرصہ ٹک نہ پائی، نازوں پلی دلاری کو بھابی کا مزاج ذرا نہ بھایا تھا۔ بلاوجہ کی روک ٹوک، اس لئے دو ماہ بعد ہی سامان باندھا اور دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی ہو گئی۔ شوہر تو پہلے ہی دن اس کے قدموں میں بچھ سا گیا تھا اس لئے فوراً اس کے ساتھ ہو لیا، بھابی کی تو جان پر بن آئی، اونچی ناک رکھنے والی بھابی فوراً اس کے قدموں میں گر گئیں، منت سماجت کی، منایا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی، وہ تو پہلے ہی موقع کی تلاش میں تھی اور اب تو بھابی نے موقع خود اسے دے دیا، وہ ناک چڑھائے میاں کے ساتھ یہ جا وہ جا ہو گئی، بھابی پیچھے سے روتی بلکتی ہی رہ گئی، زمانے بھر نے تماشا دیکھا، لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

پری صحن میں درخت کی ٹہنی سے بندھے جھولے پر بیٹھی یہ سارا منظر چپ چاپ دیکھ رہی تھی کہ کس طرح روتی بلکتی بھابی کو اس کے ماں باپ تسلیاں دے رہے ہیں، وہ دس برس کی ہو گئی تھی اور جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا ہمیشہ بھابی کو اس کے ماں باپ پر صرف ظلم کرتے ہی دیکھا تھا، اسے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت روتی بلکتی اس عورت سے تھی جس کا انجام آج اس کے سامنے تھا اور حیرت اسے اپنے ماں باپ پر تھی جو اتنا ظلم برداشت کرنے کے باوجود کیسے اسے سمیٹ رہے تھے۔

☆..........☆..........☆

وقت مزید کچھ آگے سرکا تھا جس نے اپنے پیچھے غموں کے کچھ نشان بھی چھوڑ دیئے تھے، بھابی پہلے سے یکسر تبدیل ہو گئی تھیں، ایک چپ تھی جس نے ان کے گرد احاطہ کر لیا تھا، پگلی بھی گہری نیند جا سوئی تھی، وہ بیشک ماں کے زیادہ قریب نہ تھی پر تھی تو وہ ماں، روتی بھی بلکی بھی مگر بھولے نے اسے سمیٹ لیا تھا۔ غموں کے یہ نشان چھوڑتا وقت تیزی سے سرکنے لگا اور جو اس نے خود سے عہد کیا تھا وہ اس پر گامزن رہی۔ اسکول کا مرحلہ پار کر کے وہ کالج میں آئی اور کالج سے یونیورسٹی وہ اپنی تعلیمی کارکردگی کی کامیابیاں سمیٹتی رہی۔ اس کی ہر کارکردگی پر بھولے کا سر فخر سے مزید اونچا ہو جاتا، اور وہ بابا کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھ کر مطمئن ہو جاتی، یوں لگتا جیسے اس کے خواب کو تعبیر مل گئی ہو۔

وہ سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے افسر کی سیٹ پر آ بیٹھی تھی وہ اپنی اس کامیابی کو کبھی بھی محنت سے تشبیہ نہ دیتی تھی آج جہاں وہ تھی تو بابا کی محبت ایسا محرک تھی جو اسے آگے بڑھاتا چلی گئی، بابا کی آنکھیں اس کی شان و شوکت دیکھ کر خوشی سے نم ہو جاتیں، اور وہ بڑی سادگی سے مسکرا کر انہیں دیکھتی، جو خواب تھے وہ پورے ہو گئے تھے۔ اسے اپنی اس شان و شوکت کی خوشی نہیں تھی جتنا وہ مسرور اس بات پر تھی کہ اس نے بابا کی آنکھوں میں زندگی کو دیکھا تھا لبوں پر جاندار مسکراہٹ کو دیکھا تھا، ہمیشہ چپ

چپ سے رہنے والے اب جیسے جینے لگے تھے۔
اسے یاد تھا اس کی اتنی کامیابیوں پر بابا ہمیشہ مسکرا کر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ کر صرف دعا دیتے تھے۔ انہوں نے زندگی میں اس سے صرف ایک بار خواہش کا اظہار کیا تھا، اس کے علاوہ کبھی کچھ نہ کہا مگر جب وہ بابا کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر حکومت کی طرف سے دیئے گئے گھر لے کر گئی تب بابا نے گھر کو دیکھ کر اسے کہا تھا۔
''اماں ٹھیک کہتی تھیں پریاں واقعی ہوتی ہیں''۔
اور وہ بابا کی اس بات پر نا سمجھی سے مسکرا کر بولی تھی۔
''کیا مطلب بابا؟'' اور وہ اسے کیا جواب دیتے جس بات پر وہ روئے شکوہ کیا خدا نے اسے حقیقت بنا دیا تھا، پری سچ مچ ان کی زندگی میں پری بن کر ہی آئی تھی۔

☆............☆............☆

بابا اپنا آخری فرض ادا کر کے اسے اس کے گھر کا کر کے گہری نیند جا سوئے، موت حقیقت ہے مگر وہ اس کا سامنا نہ کر پائی، وہ تنہا تھی اپنے گرد اس نے لوگوں کا جم غفیر جمع نہ کیا تھا کبھی، اس کے ماں باپ، دوست، استاد سب بابا ہی تھے، ایسے میں ان کا ساتھ چھوٹ جانا اس کے لئے کسی جھٹکے سے کم نہ تھا۔ وہ زندگی کے کاموں میں لگ تو گئی تھی مگر بابا کی کمی اسے ہر لمحہ ستاتی تھی اور آج کا دن، آج تو اسے کسی چیز کا ہوش نہ ہوتا تھا، وہ زندگی کی اس حقیقت سے انکاری نہیں تھی مگر اس کے لئے یہ سب مشکل تھا۔
''پری... پری...'' موسیٰ نے اس کا کندھا ہلایا، موسیٰ کی آواز پر وہ جیسے ہوش میں آئی تھی، کب روتی روتی بابا کی قبر پر اس نے سر ٹکا دیا اسے خبر ہی نہ ہوئی، ماضی کی سوچوں کا اژدھام یکدم ٹوٹا تھا۔
''آر یو اوکے؟'' وہ پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے نرمی سے بولا اور اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔
''میں گورکن کو لے آیا ہوں یہ قبر پر پانی ڈال کر پتوں کی تہہ جھاڑ دے تو ہم فاتحہ پڑھتیں۔
''ٹھیک ہے ناں''۔ اس نے تائید چاہی اس کی۔
''ہم مم م...'' وہ مختصر بولی اور اٹھ گئی۔ گورکن اپنا کام کر کے چلا گیا تو موسیٰ نے اگر بتیاں جلا دیں، وہ دونوں ہاتھ باندھے فاتحہ پڑھنے لگے، اس کی بند آنکھوں کے پیچھے بابا کا پرسکون مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہوا تھا اور اس کے آنسو چپکے سے رخساروں پر ڈھلک گئے تھے، وہ کتنی ہی دیر دل سے ان کے لئے دعا کرتی رہی۔
''چلیں''۔ موسیٰ منہ پر ہاتھ پھیر کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی اور واپسی کی راہ کی طرف مڑ گئی۔ جاتے جاتے بھی اس نے بابا کی قبر اور اس برگد کے درخت کو بغور دیکھا تھا جس کے پتے اب ڈھلتی شام کے ساتھ مزید جھک گئے تھے۔
گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ایک الوداعی نگاہ اس نے شہر خموشاں پر ڈالی جو رات کے اندھیرے میں مزید پراسرار ہو گیا، اس نے تھکے ہوئے انداز سے بیک سیٹ سے سر ٹکا دیا اور آنکھیں موند لی تھیں۔
''پیارے بابا آپ نے مجھے کامیاب بنانے کی بہت محنت کی، اور آج دنیا کی مادی اور قیمتی چیزوں سے میں آراستہ بھی ہوں، شاید یہی خواب دیکھا تھا آپ نے میرے لئے مگر میں نے یہ نہیں چاہا تھا، ان سب میں اگر کچھ قیمتی ہے تو وہ محبت ہے جو انسان کو زندہ رہنے کی خواہش پر بھی اکساتی ہے اور واپسی کی راہ پر بھی اکساتی ہے اور مجھے بھی یہ اعتراف ہے کہ خدا نے مجھے آپ کی صورت میں بہت قیمتی تحفہ عطا کیا اور میں آپ کو مرتے دم تک یاد کرتی رہوں گی''۔ اس نے خود سے خود کلامی کرتے ہوئے بابا کی روح کو سندیسہ پہنچا دیا تھا۔

☆............☆............☆

حورینہ سعد

افسانہ

رُت بھری شام



وہ ایک نارمل سی لڑکی تھی۔ کوئی اس میں خاص بات بھی نہ تھی۔ پڑھائی لکھائی میں بھی وہ نارمل تھی۔ دوسرے بہن بھائی خوبصورت تھے۔ وہ ہر کام میں ان سے بہت پیچھے تھی۔ ماں باپ بھی اسے اگنور کرتے۔ کئی سال وہ اپنی زندگی کے جدوجہد میں گزار چکی تھی۔ کئی رشتے آئے اور واپس چلے گئے۔ اماں اسے طعنے دینے لگیں۔

''جو رشتہ آتا ہے چھوٹی کا آتا ہے جب کہ تم بڑی ہو۔ ہمیں شرمندگی ہوتی ہے تم سامنے مت آیا کرو۔''

''ٹھیک ہے امی آئندہ میں اس بات کا خیال رکھوں گی آپ بول دیا کریں ناں کہ میں آپ کی کام والی ہوں۔'' وہ اپنی ماں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

''جب بھی تم بات کرو گی ناں بس طنز بھری کرو گی۔ اب میں اپنی سگی اولاد کو یہ کہہ دوں کہ یہ نوکرانی ہے۔ شرم کرو ریے۔''

''ٹھیک ہے میں اپنا بندوبست کر لیتی ہوں۔ ہر شخص اس گھر میں نفرت کرتا ہے میری جو بھی شکل ہے وہ اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ کسی کو پسند ہو یا نہ ہو۔ سو واٹ۔'' وہ غصے سے بولی تو ماں جاتے جاتے پلٹ کر بولیں۔

''تم اپنا لہجہ درست کرو بھائیوں سے بھی تم ہمیشہ بدتمیزی سے بات کرتی ہو۔''

''تو بھائی کیا کم ہیں، یاد نہیں صبح صبح میں کالج جا رہی تھی بھائی نے کس طرح مجھے قینچی کھینچ کر ماری۔ امی میرے پیر سے خون بہہ رہا تھا۔ سب لڑکیاں پوچھ رہی تھیں۔ میں نے کہہ دیا کہ میرے بھائی نے شرارت میں قینچی ماری تھی۔ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔'' وہ چپ ہوئی۔

''تو میں کیا کروں جب تمہارے بھائی نہیں پسند کرتے کہ تم گھر سے نکل کر تعلیم حاصل کرو۔''

''تو اماں میں کیا کروں شادی کے انتظار میں گھر میں بیٹھی رہوں کہ شادی ہوگی۔ ایسا کچھ نہیں ہے ماں مجھے پڑھنے دو مجھے گھر سے نکلنے دو ورنہ میں یہ زندگی کیسے گزاروں گی۔ آپ تو یہی چاہتی ہیں ناں۔'' وہ ماں کو پلٹ کر دیکھنے لگی۔

''کیا چاہتی ہوں میں؟'' وہ پلٹ کر بولیں۔

''یہی اماں کہ میں گھر میں بیٹھوں گھر کے کام کروں۔ بھائی آئے تو میں چھپ جاؤں۔ مہمان آئیں تو میں اپنی شکل نہ دکھاؤں۔'' وہ رکی اور پھر بولی۔

''اماں! میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں پڑھوں لکھوں اور ایک نارمل زندگی گزاروں، کھا پی کر پاؤں پسار کر سو جاؤ یہ زندگی نہیں ہے۔ آپ نے میری دونوں بہنوں کو پڑھائی سے اٹھا لیا اور اب بس یہی کہ شادیاں کرنی ہیں، کریں آپ مگر مجھے کیوں گھسیٹتی ہیں اس معاملے میں۔'' اس نے اپنے لمبے بالوں کو کوئی بل دے کر کیچر سے لپیٹ دیا۔ ہلکی ہلکی اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ تبھی آسمان پر بڑی زور سے بجلی کڑکی اور رم جھم رم جھم شروع ہو گئی۔ وہ پلٹ کر بالکونی پر نکل آئی۔ اندھیرا ہر طرف چھا گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پانچ بجے رات اتر آئی ہو۔ گہرے سیاہ بادلوں میں ایک چمکتی ہوئی روشنی کو دیکھ کر وہ اپنے رب سے بولی۔

''اے رب! تو نے میری شکل جیسی بھی بنائی ہے مجھے کوئی شکایت کوئی گلہ نہیں۔ تقدیر بھی تو نے لکھی ہوگی لیکن میں لاعلم ہوں۔ بس یا رب! جو کچھ ہے تو مجھے علم کی روشنی ضرور عطا کرنا، آمین۔'' بجلی پھر زور سے کڑکی تھی۔

''اب کیا ہو گیا۔ کیا مرنے کی سوچ رہی ہو۔'' اس کی چھوٹی بہن قریب چلی آئی۔

''ہر وقت تم مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر گھومتی پھرتی ہو۔ اللہ سے گلہ کرو کہ اس نے تمہیں ایسا کیوں بنایا ہے۔'' رابعہ بولی۔

''نہیں میں اللہ سے گلہ نہیں کرتی اس کی مرضی

وہ مجھے جس حال میں رکھے۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ گلہ اور شکایت ہے تو مجھے اپنوں سے جو ہر وقت مجھ پر تیر برساتے ہیں گلہ ہے تو اپنے بھائیوں سے جو میری پڑھائی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔'' وہ آنسو پونچھ کر بولی۔

''اچھا اچھا زیادہ مظلوم بننے کی کوشش مت کرو۔ گھر میں تمہاری وجہ سے سوگواری رہتی ہے۔'' چھوٹی بہن رابعہ بولی۔

''یہ بات میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم لوگ مجھے پسند نہیں کرتیں۔ میرا رزلٹ آ گیا ہے۔ کوئی اخبار لانے والا نہیں کس سے کہوں بھائی سے کہوں؟ باپ میرا موجود نہیں ظاہر ہے میں خود جاؤں گی لینے۔'' دوسرے دن اسے رزلٹ کی خوش خبری مل گئی تھی کہ وہ فرسٹ ڈویژن سے بی کام میں پاس ہو گئی ہے۔ پہلی بار اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی ماں سے اجازت مانگی تھی۔

''اماں! میں اسکول میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔'' بہنوں نے سنا تو ہنس کر منہ پھیر لیا۔ اماں بھی کچھ نہ بولیں۔

''پلیز اماں! بھائی سے اجازت لے دیں۔'' بھائی بھی یہ سن کر ہنس پڑے۔

''اچھا...... ! یہ اتنے بڑے اسکول میں جاب کرنے کا سوچ رہی ہے۔''

''اچھا ہے بیٹا! یہ گھر سے چلی جایا کرے گی۔'' اماں بولیں۔

''ارے اماں! اتنا بڑا وہ اسکول ہے آپ کو پتا ہے اس اسکول کی فیس کتنی ہے نام کیا ہے وہ اسکول ٹاپ ٹین میں ہے جہاں کے محترمہ خواب دیکھ رہی ہیں۔''

''بچے تو ان کی شکل دیکھ کر ہی ڈر جائیں گے۔'' رابعہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ خیر پھر تھوڑی ضد بحث کے بعد اسے اجازت مل ہی گئی۔

☆......☆

آج اسکول میں اس کا پہلا دن تھا۔ وہ صبح سے تیاری میں لگ گئی۔

اس نے یوں تو کئی شیمپو استعمال کیے تھے لیکن آج وہ کوئی خاص شیمپو استعمال کرنا چاہتی تھی۔ کئی میگزین اٹھا کر اس نے شیمپو کے اشتہارات کو غور سے دیکھا۔ پھر ایک جگہ نظر ٹھہری گئی۔

''مضبوط بال، مضبوط رشتے۔ بیسٹ ایور لائف بوائے شیمپو کے ساتھ۔''

وہ خاموشی سے نکل کر گئی اور دکان دار سے لائف بوائے شیمپو لے کر آ گئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اس میں کچھ خاص ہے۔ اس کی خوشبو اسے بے حد پسند آئی۔ شاور لینے کے بعد اس نے اپنے بالوں کو بار بار آئینہ میں دیکھا۔ اس کا چہرہ ہزاروں تلوں سے بھرا ہوا تھا لیکن بال بہت خوب صورت اور سلکی لگ رہے تھے۔ بالوں کی خوشبو سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ پھر وہ اسکول کے لیے نکل گئی۔ یہ اس کا اسکول میں پہلا دن تھا۔ جب وہ اسٹاف کے سامنے آئی۔ سب نے اسے بہت غور سے دیکھا اور پھر نظریں پھیر لیں۔

''ٹھیک ہے آج کل انٹرویو ہو رہے ہیں فی الحال ایک ہفتے کے لیے چھٹی پر گئی ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ نرسری کے بچوں کی دیکھ بھال آپ کریں پھر اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے۔'' تمام ٹیچرز نے میڈم کی طرف دیکھا۔ وہ شکریہ کہہ کر اٹھنا چاہتی تھی۔ تبھی وہاں میڈ چلی آئیں۔

''میڈم! بچہ بہت رو رہا ہے بہت ضد کر رہا ہے۔ آپ اس کے گھر انفارم کر دیں۔'' میڈ نے کہا۔

''چلیں آئیں آپ ہمارے ساتھ۔'' میڈم نے ربیعہ کو کہا۔

''یہ نیو ایڈمیشن ہے نرسری کا بچہ ہے آپ کا ہم

پریلیکٹی ٹیسٹ لیں گے۔'' انہوں نے سسکتے ہوئے عثمان کی طرف اشارہ کیا۔ ریبے نے بڑے غور سے روتے ہوئے عثمان کو دیکھا اور اسے اٹھا کر کندھے سے لگا لیا۔ اردگرد دو تین ٹیچرز موجود تھیں۔ عثمان نے جیسے ہی ریبے کے کندھے پر سر رکھا اور ریبے نے پیار سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا عثمان سسکیاں لیتا ہوا چپ ہو گیا۔ سب ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ریبے بڑے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیر رہی تھی اور وہ چپ ہو کر اس کے کندھے سے لگ گیا۔ میڈم نے ریبے کو غور سے دیکھا۔

''ٹھیک ہے آپ آفس میں آئیں آپ کل سے جوائن کر لیں ہمیں فوری ضرورت ہے آپ کی۔'' وہ حیران ہکا بکا اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھ رہی تھی۔ میڈم نے اسے کافی دیر تک روک کر رکھا۔ گھر سے نکلے ہوئے اسے کافی دیر ہو گئی تھی۔ بھائی پریشان ٹہل رہے تھے۔ اماں بھی پریشان تھیں۔

''پتا نہیں بیٹا! اولیول اسکول کا ذکر کر رہی تھی۔'' اماں بولیں۔

''ہاں ہاں مجھے پتا ہے اماں اتنا ہائی فائی اسکول ہے جس میں وہ گئی ہے۔ بچہ پیدا ہونے سے پہلے وہاں انٹری ہو جاتی ہے۔''

''ہیں ایسے بھی اسکول ہیں۔'' اماں بولیں۔

''ہاں ریبے کو ٹیچر رکھیں گے شکل دیکھی ہے اس نے اپنی۔'' بھائی بولا۔

''وہ ان کے معیار پر پوری اتر ہی نہیں سکتی۔'' رابعہ بولی۔

''وہ تو یہ کہہ کر گئی ہے کہ اماں دعا کرنا۔'' اماں بولیں۔ بھائی نے یہ سن کر منہ پھیر لیا۔ تبھی وہ حواس باختہ اندر داخل ہوئی تھی۔

''ہائے میں مر گئی تو کہاں چلی گئی تھی ریبے۔'' اماں بولیں۔

''وقت دیکھا ہے تم نے۔'' بھائی غرا کر آگے بڑھا۔

وہ گھبرا کر پیچھے ہوئی کہ بھائی کہیں اسے ایک جڑ ہی نہ دے۔

''بھائی..... کل مجھے جاب لیٹر ایشو کر دیا جائے گا اماں پتا ہے میری سیلری کتنی ہے 50 ہزار!'' وہ پسینے پسینے ہوتے ہوئے بولی۔

''کیا.....!'' بھائی رفیع الدین کا چہرہ حواس باختہ ہو گیا اور وہ حیرت سے ریبے کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ گھبراہٹ میں اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر کیچر لگا کر اماں سے لپٹ گئی تھی۔

''اماں! مجھ میں کچھ ایسا خاص ہے کہ ہر روتا ہوا بچہ میرے کندھے سے لگ کر چپ ہو جاتا تھا۔ سب کو اس بات کی حیرت تھی۔''

''ہاں ہر روز تم اپنے سر میں تیل چپڑے رہتی تھیں آج تم نے لائف بوائے شیمپو استعمال کیا تھا ایک ایک بال تمہارا خوشبو اور چمک سے مہک رہا تھا۔ یہی راز ہو گا تمہاری کامیابی کا ورنہ.....'' رابعہ نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور ریبے بھی سوچ میں پڑ گئی۔

''واقعی لائف بوائے شیمپو کی خوشبو اور انفرادیت کی وجہ سے اس کے کندھے پر سر رکھ کر بچوں نے تسکین محسوس کی تھی۔ ریبے کی نظر اپنے چہرے پر نہیں بار بار بالوں پر جا رہی تھی۔ جس نے اس کی شخصیت کو نکھار دیا تھا۔ وہ تھا لائف بوائے شیمپو ایک مہکتی ہوئی رت بھری شام ٹھہر گئی ہو جیسے۔''

......☆......

اقراء چناء

افسانہ

خشک دنوں کے سنگ

اعصابوں میں جان باقی نہ رہی تھی گویا
اعصابوں کا پورا لہو نچوڑ لیا گیا ہو۔ وہ بالکل بے
جان سی ہو گئی تھی، بالکل ایسے کہ جیسے ایک شکست
خوردہ پرندہ آسمان سے گر کر زمین پر اوندھے منہ



آ گرا ہو۔

کسی کو پا کر کھو دینے کا درد بہت تکلیف دہ تھا، محبت کو صرف ایک خواہش کے نام پر پایا تھا۔

اس کے لئے زندگی بہت آسان تھی، بے شمار آسائشات کے ساتھ، نام، رتبہ، عزت، دولت، شہرت، بزنس، فیملی اور ایک بے فکری کی آزادانہ زندگی۔

دولت و شہرت کے زعم نے اسے خود کی ہی نگاہوں میں گرا دیا تھا۔ خود غرضی و لاپروائی میں اس نے بالکل نظر انداز کر دیا تھا کہ اس کی زندگی اب بدل گئی ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی داخل ہو چکا تھا، وہ بھی اس کی اپنی مرضی سے۔ وہ کسی کی ضرورت بن گئی تھی، کسی کے احساسات کی ضرورت، کسی کے دل کی خواہش، وہ اس کا منتظر تھا، اس کی توجہ و محبتوں کا۔

اگر یہ سوچا جائے کہ زندگی کا حاصل تو بے شمار سہولیات سے ہے، اور دولت سے ہر شے خریدی جاسکتی ہے تو یہ ایک سوچ ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دولت سے آرام، آسائش، زندگی گزارنے کی ہر چھوٹی بڑی سہولت تو حاصل کی جا سکتی ہے، مگر محبت خرید کر بھی پائی نہیں جاسکتی کیونکہ محبت بلکہ سچی محبت تو خود پیدا ہوتی ہے کسی کے لئے اور یہ جب پیدا ہو جائے تو اس کی روح کو ختم کرنا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔

ایہا حیدر نے بھی شاید اس محبت کو مذاق سمجھا تھا۔ جسے اس نے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے یا اپنے زعم میں حاصل تو کر لیا تھا، مگر اس کا حق ادا نہ کر پائی تھی۔

اس کی اپنی ہی ایک جداگانہ زندگی تھی، جو بزنس، پارٹیز اور ڈھیر ساری مصروفیات پر محیط تھی۔ وہ یہ حقیقت بھی یکسر بھلا چکی تھی کہ وہ ایک شخص کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھ چکی تھی۔

وہ اپنا گھر ملازموں کے آسرے پر چھوڑ چکی تھی جو اس کے گھر اور اس کے شوہر کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ وہ اس کی ہر ضرورت کو پورا کرتے تھے شاید جو کہ اس کی ذمہ داریاں تھیں۔

جیتے جاگتے انسانوں کو ازل سے ہی اپنے ہم جنسوں کا سہارا درکار ہوتا ہے، کبھی بالکل تنہائی میں جب اپنے ہی سائے سے خوف آنے لگے تو وہ بے بس انسان کسی سائبان کو تلاش کرتا ہے، اکیلا پن کسی بھی مضبوط شے کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔

اس شخص کو بھی جب اس کی ہمدم، اس کا سہارا، اس کی ہم سفر کا سہارا نہ ملا تو اس نے بھی ایک سہارے کے طور پر کسی کو اپنا ہمدرد، ہم آشنا، اپنا ساتھ مان لیا جو کم از کم ہر وقت اس کے ساتھ تھی۔

☆............☆............☆

''اب کیسا فیل ہو رہا ہے؟'' وہ اس کے سر پر متفکر کھڑی تھی۔ اس نے سر پکڑتے ہوئے غنودگی کے عالم میں آنکھیں وا کیں۔ اس کی سوالیہ نگاہیں عفان پر اب بھی مرکوز تھیں۔ وہ خاموش ہی رہا، حالانکہ اس کی حالت صاف ظاہر کر رہی تھی کہ وہ مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوا، وہ کچھ دیر اسے گھورتی رہی۔

''جوس یا سوپ پئیں گے؟'' یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس کا پوری طرح سے خیال رکھے۔ اتنے میں وہ تھوڑا سرک کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا چکا تھا۔

''نہیں! کچھ بھی نہیں چاہئے''۔ وہ تھکے تھکے لہجے میں گویا ہوا۔

''لیکن ڈاکٹر کی ہدایت ہے کہ آپ کچھ لے لیں، اور ڈاکٹر کا کہنا بالکل نہیں ٹالنا چاہئے''۔ سحر ہلکے سے مسکرا کر بولی۔ عفان کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔

''میں آپ کے لئے سوپ بنا لاتی ہوں''۔ اس

کی جانب سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو وہ خود بولتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ عفان نے گہری سانس بھری۔

آج اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بہت بڑی غلطی کر چکا ہے جس کی سزا اسے تنہائیوں کے نام پر مل رہی تھی۔ وہ عفان رحمان، ایک جیتا جاگتا انسان تھا، اسے ایک سائبان کی ضرورت تھی، اسے اپنی ہم سفر کے ساتھ کی ضرورت تھی، جو کہ اپنی مرضی سے اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی اور اسے شامل کر کے اسے ادھورا پن دے گئی تھی۔

اس نے سچے جذبات کے ساتھ اسے اپنایا تھا، اس نے ابیہا حیدر کے ساتھ زندگی گزارنے کے حسین خواب دیکھے تو لیکن ابیہا حیدر تو اسے اپنی خواہشات کے نام پر خرید کر لائی تھی۔ وہ اسے اپنا پابند بنا چکی تھی۔ وہ نہ جی سکتا تھا نہ مر سکتا تھا، وہ کیوں نہیں سمجھ رہی تھی کہ عفان کو اس کی ضرورت تھی نہ کہ اس کے اس دلکش گھر کی جس میں وہ صرف اور صرف خود کو تنہا پاتا تھا، اس نے اپنی سی کوششیں کیں تھیں ابیہا کو احساس دلانے کی لیکن وہ ہٹ دھرم ہی رہی۔

☆.........☆.........☆

اس پر عجیب سی حالت طاری ہو گئی تھی، تلاشنے پر ہر بات میں ہر چیز میں اسے اپنی ہی غلطیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے عفان کو سچے دل سے اپنایا تھا، مگر جلد ہی اس نے اپنی تمام ذمہ داریاں سحر کو سونپ دی تھیں، اس سے بہت بڑی کوتاہی ہو گئی تھی۔ اس نے چند دنوں میں محسوس کیا تھا کہ وہ اس سے زیادہ سحر کے نزدیک جا رہا ہے۔

اسے حیرت تب ہوئی جب اس روز وہ دیر سے رات کو لوٹی اور عفان کو گہری نیند میں پایا، ایسا پہلی بار ہوا تھا، دیر رات کو اس کا گھر لوٹنا معمول تھا، وہ چاہے جتنی بھی لیٹ ہو جاتی وہ مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کرتا تھا۔

وہ یک ٹک خاموشی سے اسے تکتی رہی اور عفان کی یہی خاموشی بہت بے قرار کر گئی تھی۔ وہ پوری رات کروٹیں بدلتی رہی تھی جبکہ وہ بہت سکون بھری گہری نیند سو رہا تھا۔

اس سے اگلے دو دن بھی ایسا ہوا، گویا اس سے عفان کو کوئی غرض ہی نہ ہو۔ وہ ناشتے کی ٹیبل پر بھی اب اس سے کم مخاطب ہوتا تھا۔ وہ اس کے ہر برتاؤ اور عمل پر توجہ دے رہی تھی اور وہ اس کے بے رُخی بھی محسوس کر رہی تھی۔

اس نے اس سنڈے صرف گھر پر گزارنے کا سوچا تھا۔ وہ اپنا پورا وقت عفان کو دینا چاہتی تھی تا کہ وہ اس کی توجہ حاصل کر سکے۔

☆.........☆.........☆

وہ صبح روٹین کے بالکل برخلاف تھی۔ اس نے خوشگواریت سے عفان کے ساتھ ناشتہ کیا۔ اس کے بعد وہ اسے لان میں لے آئی۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے کیاریوں میں لہلہاتے ہوئے پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔

وہ مختلف موضوعات پر اس سے بات چیت کر رہی تھی۔ ایک بات جو اس نے بہت نوٹ کی، وہ ہر بات میں سحر کا تذکرہ کر رہا تھا۔ وہ ہر چیز میں سحر کو مخاطب کر رہا تھا۔ وہ ہر ضرورت پر سحر کو پکار رہا تھا۔ دیکھنے والا یہی کہتا کہ سحر اس کا ایک خاص حصہ ہے۔ اسے اپنے اندر چبھن محسوس ہو رہی تھی۔

گویا سحر نے ابیہا حیدر کی جگہ لے لی ہو۔ عفان کو ناشتہ کروانا، اس کے کپڑے پریس کرنا، اس کے جوتے صاف کرنا، آفس جاتے وقت یاد سے عفان کی ہر ضرورت کی ہر چیز دینا، اسے ٹائم پر لنچ اور ڈنر کروانا، وقت پر اسے چائے یا کافی

پیش کرنا، اس کے آرام کا خیال رکھنا، یہ سب تو بیوی کے فرائض تھے جو کہ وہ یہ سحر کے ہاتھوں میں سونپ چکی تھی۔

ان سب چیزوں کی وہ خود ذمہ دار تھی۔ اگر سحر کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو وہ بھی یہی سب کرتا کیونکہ وہ یہ سب بطور ایک ملازم کرتا۔

سحر اس کی زندگی میں گزشتہ تین ماہ سے داخل ہوئی تھی صرف ایک ملازمہ کی حیثیت سے، وہ ایک پڑھی لکھی، خوش اخلاق اور خوش شکل لڑکی تھی اور وہ اپنے کام کے بارے میں بہت ایماندار بھی تھی۔

ایبہا حیدر نے اس کی ایمانداری سے ہی متاثر ہو کر اسے گھر کی ہر عام و خاص ذمہ داری کے لئے مقرر کر لیا تھا اور وہ اس کی توقع کے عین مطابق بھی نکلی تھی، اسے سحر کے کسی کام سے کبھی شکایت نہ ملی۔

یہ ایک حیثیت کا لفظ ہی تھا جو کہ ہر انسان کو دوسرے انسان سے مختلف کر دیتا ہے۔ معاشرے نے ہر انسان کو حیثیت کے نام پر بانٹ دیا ہے، جس کی حیثیت بڑی، اس کا رتبہ اس کا نام بڑا، اور جس کی حیثیت چھوٹی وہ ہر لحاظ سے چھوٹا۔

اور یہ ''حیثیت'' ہی تھی جس نے ایبہا حیدر اور سحر میں زمین و آسمان کا فرق واضح کر دیا تھا۔ ایبہا حیدر اپنی حیثیت کے مطابق وہ مقام حاصل نہ کر پائی کہ جو سحر نے کر لیا، اور سحر اپنی حیثیت کے مطابق وہ مقام حاصل نہ کر پائی جو کہ ایبہا حیدر کو حاصل تھا۔

اسے اندر ہی اندر گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ شکست کھا گئی تھی اپنی ایک ملازمہ سے۔ اسے سخت غصہ آ رہا تھا، اور وہ غصے کا مظاہرہ بہت سختی سے کرنا چاہتی تھی مگر خود کے اس عمل کو وہ مسلسل روک رہی تھی، اسے آئینے کے عکس میں اپنی ہی کوتاہیاں نظر آ رہی تھیں۔

عفان کے لئے اب بھی اس کے دل میں بہت کچھ تھا۔ وہ اس کی تقسیم بالکل بھی نہیں چاہتی تھی، چاہے کسی بھی طرح۔

عفان کی باتوں میں، اس کے کسی بھی ذکر میں ایبہا حیدر کہیں بھی نہیں تھی، جو اس کی شریک حیات تھی، اس سب کے لئے وہ خود قصوروار تھی۔

اس نے جانے کتنی راتیں جاگ کر گزاریں، جانے کتنے دن بے سکونی کے گزارے۔ اسے ایک پل کا بھی سکون میسر نہیں آ رہا تھا۔ دولت، شہرت، رتبہ یہ سب اسے بے معنی چیزیں لگ رہی تھیں۔ ان سے کہیں بڑھ کر اس کے لئے عفان تھا۔ اس کا سکون عفان سے تھا اور وہ تب عفان کی یادوں میں اس کے لہجے میں گھل سکتی تھی جب وہ خود اس کی جانب قدم بڑھائے۔

اس نے دو راہوں میں سے ایک راہ چن لی، جس کی منزل صرف اور صرف عفان کی جانب تھی۔

اسے سحر کی جگہ لینی تھی۔ عفان کے ہر کام کو خود انجام دینا تھا۔ اس کی ہر ضرورت کو خود پورا کرنا تھا، یقیناً اسے وہ جگہ پانے کے لئے بہت وقت درکار تھا۔

اسے مکمل طور پر خود کو عفان کے لئے ایک اچھی بیوی کے روپ میں ڈھالنا تھا جب وہ پوری اس رنگ میں رنگ جاتی تبھی تو وہ عفان کے ذکر میں شمار ہو سکے گی۔

اس نے سچے دل سے کچھ پانے کا ارادہ کیا تھا اور یقیناً پختہ ارادے ضرور اپنی منزل تلاش کر لیتے ہیں۔

☆.........☆.........☆

علیشبہ احمد

افسانہ

اندازِ محبت

''روکیوں رہی ہو؟ محبت تھی اس سے۔ تو محبت کرتے وقت یاد رکھنا تھا کہ یکطرفہ محبت ہے یہ دن تو دیکھنا ہی تھا''۔ وریشہ نے نظر اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھی سجل کو دکھ سے دیکھا۔



"محبت کچھ دیکھ کر ہوتی ہے کیا؟" وریشہ نے سوال کیا۔

"پلیز وریشہ! بند کرو اپنا یہ پاگل پن، اس لیے کہتے ہیں محبت شادی کے بعد ہی کرنی چاہیے اور یہ وقتی اٹریکشن ہے بس" تجل بولی۔

"وقتی اٹریکشن کچھ وقت کے لیے ہوتی ہے پر میں تو پچھلے ایک سال سے اس سے محبت کرتی ہوں"۔ وریشہ نے تجل کی آدھی بات نظر انداز کر دی تھی۔ وہی بات جو اکثر محبت میں اندھے لوگوں کو سمجھ نہیں آتی۔

"تمہارا دماغ خراب ہے" تجل چڑ کر بولی۔

"اور تمہارا دل... پتھر دل ہو تم"۔ وریشہ نے بھی چڑ کر جواب دیا۔

"دیکھو وریشہ! ضروری نہیں جو چیز خوبصورت ہو یا جو چیز ہمیں پسند آ جائے، وہ ہمارے لیے بہتر بھی ہو، اللہ جو کرتا ہے ہماری بہتری کے لیے کرتا ہے۔ سو پلیز ڈونٹ کرائے۔ تم آج بلاول کے لیے رو رہی ہو آنسو بہا رہی ہو، ہو سکتا ہے تمہارے نصیب میں کچھ بہترین ہو اور تم خوامخواہ اس بلاول کے لیے ضد کر رہی ہو؟" تجل کچھ دھیمی پڑی۔



سجل کو بلاول کبھی بھی کچھ خاص پسند نہیں تھا، وہ ان کا دور پرے کا رشتہ دار اور پڑوسی تھا اسی لئے وہ اکثر ان کے گھر آتا تھا۔ سجل کو اس کے کردار اس کی حرکتوں کے بارے میں اچھی طرح پتہ تھا اس لئے وہ اس سے دور ہی رہتی تھی۔ سجل اکثر اسے بلاول کی حرکتوں کا بتاتی رہتی تھی اور وریشہ یقین نہیں کرتی تھی۔ شاید محبت کے بارے میں جو مشہور ہے کہ یہ اندھی ہوتی ہے، سچ ہی ہے کہ انسان جب محبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے اپنے محبوب کے عیب بالکل نظر نہیں آتے اور یہی حال وریشہ کا تھا۔

سجل کی بات کے جواب میں وریشہ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

''اللہ اسے ہدایت دے''۔ سجل نے اپنی بڑی بہن کے لئے دل سے دعا مانگی۔

☆..........☆..........☆

موسم اپنے اندر بے حد خوبصورتی سموئے ہوئے تھا، ہلکی ہلکی چلتی ہوا اور گہرے سیاہ بادلوں نے پورے ماحول کو شام سے پہلے ہی شام کا رنگ دے کر انتہائی خوبصورت بنا دیا تھا۔ صاف وشفاف صحن میں کن من گرتے بارش کے قطرے سب ہی کچھ بہت اچھا تھا، مگر وہ دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھی اپنے ہی خیالوں میں بہت دور پہنچی ہوئی تھی۔ ایک ماہ پہلے تک وہ ہر پل اس کو خیالوں میں سوچ کر کتنی خوش ہوا کرتی تھی اور اب اس کا خیال ہی تکلیف کا باعث بنتا تھا۔ اس کے خیال آنا شروع ہوئے تو شروع سے لے کر اس دن تک ہر خیال، ہر بات یاد آتی اور وہ اپنے آس پاس کی دنیا کو بھلا بیٹھتی تھی، ابھی بھی تو وہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا، کتنے آرام سے آ کر وہ اس کا خوبصورت نازک دل توڑ گیا تھا۔

''وریشہ...'' کس انداز سے پکارا تھا اسے۔ وہ فولڈر پر نومیریکل حل کرتی چونکی اور بکس سائیڈ پر رکھ کر اس کے پاس تخت پر چلی آئی جہاں ہمیشہ اماں بیٹھا کرتی تھیں اور آج وہ بیٹھا تھا، اماں اس کے لئے چائے بنانے اندر گئیں تھیں شاید۔

''ہاں بولو؟'' وریشہ نے مخاطب کرنے کی وجہ دریافت کی۔ ان دونوں میں خاصی فرینک نیس تھی۔

''مجھے محبت ہو گئی ہے''۔ اس نے آرام سے بتایا۔

''کس سے؟'' وریشہ نے اعتماد سے پوچھا جیسے پُریقین ہو کہ یہ وہی تو ہے۔

''کرن سے''۔ بلاول کے چہرے کی مسکراہٹ دیدنی تھی لیکن اس قدر خوشی سے اپنے دل کی بات شیئر کرتا وہ وریشہ کا معصوم دل توڑ گیا تھا۔

''کرن...'' وریشہ نے زیر لب دہرایا۔

''ہاں کرن''۔ بلاول نے اس کی سرگوشی سن لی تھی۔

''کیوں کیا تمہیں اچھی نہیں لگتی وہ؟'' بلاول اس سے جیسا ری ایکشن ایکسپیکٹ کر رہا تھا وہاں ویسا کچھ نہیں تھا وہ تو افسردہ سی ہو گئی تھی۔

''ہاں اچھی ہے تمہاری چوائس''۔ وریشہ نے بمشکل یہ الفاظ ادا کیے تھے۔

''وریشہ... وریشہ''۔ سجل کے زور زور سے اسے پکارنے پر وریشہ اپنے خیالوں کو جھٹکتی اندر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب تم شاید صرف خیال بن کے ہی رہو گے''۔ ایک اداس نظر شام کے اس سہانے منظر پر ڈال کر وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☆..........☆..........☆

''تم پڑھتی کیوں نہیں ہو؟ ایگزامز سر پر آ چکے ہیں''۔ سجل نے کمبل ٹھیک کر کے لیٹتی وریشہ کو مخاطب کیا۔ اسے سونے کے لئے لیٹتے دیکھ کر سجل کو تاؤ آیا تھا۔

''پڑھا نہیں جاتا''۔ بے بسی تھی وریشہ کے انداز میں۔

''پڑھو گی تو پڑھا جائے گا ناں، اس فضول آدمی کو ذہن سے نکال کر''۔ سجل گھور کر بولی۔

''وہ ذہن سے ہی نہیں نکلتا، کیا محبت یونہی بے بس کر دیتی ہے''۔ وریشہ نے چھت کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''محبت بے بس نہیں ذلیل کرتی ہے اور عام انسان سے

محبت یکطرفہ ہو یا دو طرفہ وہ ذلیل ہی کرتی ہے"۔ سجل بولی۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو محبت ذلیل کرتی ہے، اتنے لوگ دنیا میں محبت کرتے ہیں اور اتنے لوگ لومیرج بھی کرتے ہیں"۔ وریشہ کو اعتراض تھا سجل کی بات پر۔

"تو کیا نہیں کرتی محبت ذلیل؟ ہاں کر لیتے ہیں لوگ پسند کی شادی اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟" سجل کا انداز سوالیہ تھا، وریشہ خاموش رہی سجل پھر بولی۔

"مرد دستبردار ہو جاتا ہے اور دنیا والوں کے طعنے کوسنے عورت کو اکیلے سننے پڑتے ہیں، اگر لڑکیاں موبائل پر چھپ چھپ کر کسی سے بات کرتی ہیں اور کسی کو پتہ چل جائے تو ذلت، اگر عورت محبت کے پیچھے گھر سے بھاگ جاتی ہے تب بھی وہی ذلیل ہوتی ہے، محبت میں ذلیل ہمیشہ عورت ہوتی ہے کبھی کسی صورت تو کبھی کسی صورت"۔

"کیا ہر محبت ذلیل کرتی ہے یونہی اور کرتی رہے گی؟"

"نہیں ہر محبت ذلیل نہیں کرتی پر یہ جو شادی سے پہلے کی محبت ہوتی ہے ناں یہ ذلیل کرتی ہے اور بنت حوا کو محبت صرف اپنے محرم سے کرنی چاہئے نامحرم کی محبت بنت حوا کو جچتی نہیں ہے"۔ سجل اسے سمجھانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وریشہ محبت کے چکر میں اپنا آپ تباہ کر لے۔

"کیا کوئی محبت ایسی نہیں ہے جو سرخرو کر دے"۔ وریشہ نے ایک ٹرانس کی کیفیت میں سوال کیا جیسے جانتی ہی نہ ہو۔

"ہے ناں اللہ کی محبت، اللہ سے محبت کرو دنیا حسین ہو جائے گی اور آخرت اور بھی حسین"۔

"دنیا کی محبتیں روند ڈالتی ہیں وریشہ ان سے کچھ نہیں ملتا"۔ ایک دکھ تھا جو سجل کی آواز میں اپنی بہن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اترا تھا اور وہ کروٹ موڑ کر آنکھیں موند گئی تھی اس سے زیادہ وہ وریشہ کو کچھ نہیں سمجھا سکتی تھی، اب جو سمجھنا تھا اسے خود سمجھنا تھا۔

☆☆☆......☆☆☆......☆☆☆

"رضیہ آئی تھی آج"۔ سفینہ نے چارپائی پر بیٹھی مٹر چھیلتی سجل اور وریشہ کو مخاطب کیا۔

"چچی آئی تھیں تو کیا ہوا؟" چچی آئی تھیں یہ بات تو انہیں بھی معلوم تھی۔

"وہ اشعر کے لئے تمہیں مانگ رہی تھی"۔ سفینہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

"کیا اشعر بھائی کے لئے، واہ جی واہ"۔ سجل خوشی سے اچھل ہی پڑی اور بھاگ کر سفینہ کے تخت پر پہنچ گئی۔

"پھر آپ نے کیا کہا امی؟" وریشہ نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"یہی کہ تمہارے ابا سے پوچھوں گی پھر بتاؤں گی، ویسے تو وہ بھی ہاں ہی بولیں گے، اتنا قابل جو ہے اشعر بچہ"۔ سفینہ مسکرائیں۔

"واقعی امی اشعر بھائی اتنے اچھے، اوپر سے ڈاکٹر، وریشہ کتنی لکی ہو تم"۔ سجل چہکی۔

"تو میری بیٹی کون سا کسی سے کم ہے"۔ ان کے لہجے میں ممتا تھی۔

"اچھا یہ بلاول نہیں آیا اتنے دنوں سے"۔ سجل کچھ بولنے کے لئے لب کھول ہی رہی تھی کہ سفینہ بیگم پھر بولیں۔

"اچھا ہے آئے بھی ناں"۔ سجل جل کر بولی۔

"کیوں؟" اس کے انداز بلاول کے معاملے میں ہمیشہ ایسے ہی ہوتے تھے اس لئے سفینہ بیگم نے عام سے لہجے میں استفسار کیا۔

"دور پرے کے رشتہ داروں کو دور پرے ہی رہنا چاہئے اور آپ کو بھی خیال رکھنا چاہئے اماں جوان بیٹیاں ہیں آپ کے گھر میں"۔ سجل بول رہی تھی، سفینہ بیگم نے کوئی اعتراض نہیں کیا کیونکہ ان کی بیٹی بالکل صحیح بول رہی تھی، جوان بیٹیوں کی ماؤں کو اتنا دھیان تو رکھنا چاہئے۔

☆☆☆......☆☆☆......☆☆☆

وریشہ اور اشعر کا رشتہ سب کی مرضی سے طے ہو چکا

تھا اور سب خوش تھے بس وریشہ تھوڑی بے چین تھی لیکن اس نے کسی قسم کا احتجاج نہیں کیا تھا، کرتی بھی تو کس بنا پر، وہ سب کچھ اللہ پر چھوڑ چکی تھی اور اللہ جو بھی کرتا ہے انسان کے حق میں بہتر کرتا ہے یہ وہ جانتی تھی۔

"یہ لو مٹھائی جاؤ اپنے پڑوسیوں کے گھر دے آؤ، امی نے دی ہے میں تو نہیں دینے جا رہی"۔ سجل نے پلیٹ وریشہ کے ہاتھ میں تھمائی۔ وہ بلاول کے گھر جانا پسند نہیں کرتی تھی لیکن جب سب کے گھر وریشہ کی منگنی کی مٹھائی گئی تھی تو ان کے گھر بھی بھیجنا لازم تھا یہ سفینہ کا حکم تھا اس لئے سجل اب وریشہ کے سر تھی کہ وہ جائے۔

"میں"۔ وریشہ کشمکش میں تھی۔

"ہاں تم..."

"اگر نہیں جانا تو رہنے دو مٹھائی ہی نہیں دیتے"۔ سجل نے بات ہی ختم کی۔

"نہیں میں جاتی ہوں"۔ وریشہ نے کچھ سوچ کر ہامی بھری اور دوپٹہ صحیح کرتی باہر نکل آئی۔ بلاول کے گھر کا دروازہ کھلا تھا وہ آہستہ سے دروازہ دھکیلتی اندر آ گئی۔ سامنے کوئی نظر نہیں آیا تو وہ ڈرائنگ روم کی جانب مڑی وہاں سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔

"یار کرن کا کیا ہوا؟" کسی نے سوال کیا تھا شاید۔

"چھوڑ دیا"۔ بلاول کی آواز سن کر وریشہ کا ہینڈل موڑتا ہاتھ وہیں رک گیا۔

"کیوں...؟" حیرانی سے پوچھا گیا۔

"بس یار دل بھر گیا تھا"۔ بلاول کی بیزار آواز سنائی دی۔

"تجھے تو محبت ہو گئی تھی اس سے۔ اچھل اچھل کے بتا رہا تھا"۔ وہ جو کوئی بھی تھا حیران تھا۔

"مجھے بھی یہی لگا تھا لیکن یار دن رات ایک ہی لڑکی سے باتیں، ملاقاتیں کر کے میرا تو دل بھر گیا"۔ ایک آنسو وریشہ کے گال پر لڑھکا۔ اس انسان کی محبت میں وہ مری جا رہی تھی۔ اس انسان کی محبت میں اس نے کسی چیز کا خیال نہیں کیا تھا نہ گھر والوں کا نہ پڑھائی کا نہ آخرت کا۔

"تو اب..." دوسری طرف شاید حیرانی کم ہو گئی تھی۔

"اب نئی تلاش جاری ہے"۔ بلاول ہنس کر بولا۔

"آہا، پتا تھا تو بلاول خان ہے اور کسی ایک لڑکی پر ٹکنا تو تیری فطرت میں ہے ہی نہیں"۔ بلاول پھر ہنسا فخریہ ہنسی۔

"وہ جو تیری پڑوسن ہے اسے پھنسا لے"۔ سامنے والے نے مشورے سے نوازا۔

"واہ کیا آئیڈیا دیا ہے اسے پھنسانا کون سا مشکل کام ہے، وہ تو ویسے ہی میرے اردگرد منڈلاتی ہے"۔ اور بلاول صحیح تو کہہ رہا تھا۔ وہ اس کی باتوں میں آ جاتی، وہ تو محبت کرتی تھی اس سے لیکن شاید وہ نہیں جانتی تھی ہر انسان محبت کے لائق نہیں ہوتا جیسے بلاول۔

"ویسے اس کی ایک چھوٹی بہن بھی ہے سجل"۔ وریشہ چونکی، بلاول کی آواز میں سجل کا ذکر کرتے ذرا نرمی تھی۔

"اچھا تو تیرا اس پر دل آیا ہے"۔ کمینگی برقرار تھی۔

"نہیں یار وہ پوری مولانی ٹائپ ہے، باتوں میں آنے والی نہیں لگتی اور ویسے بھی تو نے وہ بات نہیں سنی، پردے والی تو صرف بیوی اور بہنیں اچھی لگتی ہیں گرل فرینڈز نہیں"۔ بلاول کمینگی کی انتہا پر تھا۔

"یہ بھی تو نے صحیح کہا"۔ دوسری طرف بھی کوئی اسی جیسا موجود تھا۔

وریشہ اس سے زیادہ سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے مٹھائی کی پلیٹ سامنے میز پر رکھی اور واپسی کے لئے مڑ گئی۔

وہ اللہ کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا، اللہ نے اسے کسی بڑے نقصان سے بچا لیا تھا۔ اللہ نے اسے بلاول کا کریہہ چہرہ دکھا کر اسے برباد ہونے سے بچا لیا تھا، وہ جس کی محبت میں مری جا رہی تھی وہ شکاری تھا اور بس جال میں پھنسانا جانتا تھا۔ ایسے انسان محبت نہیں کرتے صرف شکار ہی کرتے ہیں۔ وریشہ اس وقت سجل کی ہر بات کو صحیح مان رہی تھی جس کا اقرار اس نے سجل کے سمجھانے پر بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اقرار وہ آج کرنا چاہتی تھی خود سے۔ سجل کہتی تھی محبت عورت کو ذلیل کرتی ہے اور وہ بالکل صحیح کہتی تھی۔ اگر محبت کا وقت اور انداز غلط ہو۔

☆......☆......☆

نظرِ بد کی حقیقت

نظرِ بد کے بارے میں فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

آپ نے فرمایا : اَلْعَیْنُ حَقٌّ

ترجمہ: نظر کا لگ جانا برحق ہے (صحیح بخاری)

- حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم نظرِ بد سے بچنے کیلئے تعویذ استعمال کیا کریں۔ (بخاری، مسلم)
- حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھر ایک لڑکی کو دیکھا جس کا چہرہ زرد تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا اس کے لئے دعا تعویذ کراؤ اسے نظرِ بد لگی ہے۔ (بخاری، مسلم)
- حضرت عوف بن مالک الاشجعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم لوگ زمانۂ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کرتے تھے (اسلام لانے کے بعد ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ان کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے تعویذات مجھے پیش کرو، اگر ان میں شرک نہ ہو تو ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ (مسلم)

علاج

- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظرِ بد سے بچنے کے لئے دعائیہ کلمات بھی اپنی امت کو بتلائے۔ مثلاً فرمایا کہ جب تمہیں کوئی چیز اچھی لگے تو بَارَكَ اللهُ کہو۔ (مشکوٰۃ)
- جس کی نظر لگے، اس کو کہا جائے کہ غسل کرے اور اس کے غسل کا پانی اس شخص کے سر اور جسم پر ڈالا جائے جس کو نظر لگی ہو۔ (مشکوٰۃ)
- مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (سورۃ کہف) پڑھنا قرآن سے ثابت ہے۔
- سورۃ الفلق اور سورۃ الناس بھی نظر کے لئے بطور دم پڑھنا چاہیئے۔ (صحیح ترمذی)

شازیہ مصطفیٰ عمران

سلسلے وار ناول

دوسری قسط

زندگی پھول ہے محبت خوشبو

''بشریٰ کچھ شرم لحاظ بھی ہے اس لڑکی کو کیسے شہزیل شہزیل کہتی رہتی ہے۔'' رحمت بی بی نے اپنی بہو کو ہی لتاڑا۔
''ارے اماں! بچپن سے اس نے نام ہی لیا ہے عادت نہیں ہے اس کی بھائی کہنے کی۔'' منیب احمد گویا ہوئے۔



"لیکن بیٹا! یہ لڑکی ذات ہے دوسرے گھر جانا ہوتا ہے کچھ تمیز اور شعور بھی ہوتا ہے۔"

"اماں آپ فکر نہیں کریں میں اسے سمجھا دوں گی بچپنا ابھی اس کا گیا نہیں ہے۔" بشریٰ، رحمت بی بی کے غصے کو سمجھ رہی تھیں۔

"ابھی شادی کر دو اس کی سب بچپنا چلا جائے گا۔" شہزیل نے نیچے کی بحث سنی وہ اتر کے آ رہا تھا پھر وہ چونک کے رک گیا۔ بات پایا کی ہی ہو رہی تھی۔

بشریٰ لب بھینچ کر رہ گئی تھیں۔

"گھر میں اور بھی تو لڑکیاں ہیں وہ بھی تو دب کے رہتی ہیں مگر اس کا تو باوا آدم ہی نرالہ ہے۔" رحمت بی بی اس کے پیچھے پڑ گئی تھیں۔

"اماں! آپ غصہ نہیں ہوں میں سمجھا دوں گا۔" منیب احمد نے بات کو سنبھالا وہ بزرگ تھیں ان کی کسی بات سے کوئی اختلاف کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔



شہزیل سمجھ گیا تھا۔ دادی جان ماہا ہی پر غصہ ہو رہی تھیں وہ ہر وقت اس کے پیچھے جو لگی رہتی تھی اس نے بھی سوچ لیا تھا وہ محتاط رہے گا جتنا ممکن ہو وہ ماہا سے دور رہے گا۔ وہ نہیں چاہتا تھا اس کی وجہ سے گھر میں کوئی بات ہو اور وہ ان سب کے اعتماد کو ٹھیس بھی نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ ماہا میں ضرورت سے زیادہ لاابالی پن اور بچپنا تھا یہ تو شہزیل کو بھی پسند نہیں تھا۔

☆......☆

دونوں نے پھر یونیورسٹی جوائن کر لی تھی۔ نیل فر کا حالانکہ ایگزام دینے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا مگر شکیل احمد کا حکم تھا وہ اپنا ماسٹرز ضرور پورا کرے۔

''انکل! بہت ناراض ہوں گے تم پڑھائی سے بھاگ رہی ہو۔'' شہوار اسائنمنٹ بنا رہی تھی وہ رات دن پڑھائی میں لگی رہتی تھی جب کہ نیل فر کا دل ہی اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔

''پڑھ کے کرنا کیا ہے اور زندگی بھی میری کیا ہے اسی گھر میں ساری زندگی گزارنا امی کے بعد سے تو کسی چیز میں دل ہی نہیں لگتا۔'' وہ بہت اداس اور دلگرفتہ رہنے لگی تھی۔

''تم نے خود کو بور بنا لیا ہے ایسا تم نے خود کیا اور تمہیں انکل ساری زندگی تو رہنے نہیں دیں گے ایک دن تو تمہاری شادی بھی کریں گے۔'' شہوار نے اس کی صورت دیکھی جو بہت اداس تھی۔

''مجھے شادی کرنی ہی نہیں ہے شادی کر کے کرنا بھی کیا ہے۔''

''یہ باتیں تو تم مجھ سے کرو نہیں اور تمہاری افلاطونی منطق سے میرے سر میں درد ہونے لگا ہے۔''

''میرے پاس بیٹھتی کیوں ہو ڈرائنگ روم میں جا کے پڑھا کرو۔''

''نیل فر! ہوش کر لو تمہارے بھی ایگزام ہیں اور یہ اسائنمنٹ مجھے ہی نہیں تمہیں بھی بنانا ہے۔'' شہوار اسے اکثر سخت سست سنانے لگی تھی۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ لیٹنے کا قصد کرنے لگی۔

''انکل! آئیں گے تو میں تمہاری شکایت لگاؤں گی۔''

''شوق سے لگانا۔'' وہ بھی جیسے تہیہ کیے ہوئے تھی اسے پڑھنا ہی نہیں ہے۔

''نیل فر! کیوں تم ایسا کر رہی ہو۔''

''سنو! تم اپنا کام کرو میں تھوڑی دیر آرام کر لوں۔'' وہ اسے باہر جانے کا راستہ دکھانے لگی۔

''عجیب لڑکی ہو کسی چیز کا شوق ہی نہیں ہے۔'' وہ بھی کھسیا گئی تھی۔

''اچھا ہے نا شوق نہیں ہے ورنہ مصیبت بن جاتی۔'' وہ تمسخرانہ لہجے میں گویا ہوئی۔

''تم سے تو بات کرنا ہی بے کار ہے جا رہی ہوں۔'' شہوار زچ ہی ہو گئی۔ اپنی کتابیں وغیرہ اٹھائے روم سے ہی نکل گئی۔

اور نیل فر دوبارہ سے خیالوں میں سوچوں میں گم ہو گئی اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا خود کو اور اپنی ماں کو ہی دیکھا تھا شکیل احمد ان سے ہفتے کے ہفتے ملنے آتے تھے اس کے لیے بہت کچھ لے کے۔ مگر امی نے ان سے یہ نہیں کہا وہ انہیں اپنے ساتھ رکھیں اتنا تو نیل فر بھی جان گئی تھی، اس کی ماں کا ماضی کیا تھا وہ ایک ڈانسر تھیں۔ اسٹیج پر ڈانس کرتی تھیں یہ سب بھی وہ مجبوری میں کرتی تھیں۔ شکیل احمد ان دنوں ایران گئے ہوئے تھے اور رانی انہیں برے حالوں میں ملی تھیں۔ سوتیلا باپ ان کا سودا کر رہا تھا ان کی عزت بیچ رہا تھا۔ شکیل احمد کو رانی نے اپنی ساری

کہانی سنائی تھی۔ وہ کیسے ان لوگوں کے چنگل سے نکل کے بھاگی تھیں۔ شکیل احمد کو ان پر ترس آگیا اور عزت دے کے ان سے شادی کی اور پاکستان لے آئے۔ اس وقت وہ دو بیٹوں کے پہلے سے ہی باپ تھے رانی کو انہوں نے ڈیفنس، کلفٹن میں فلیٹ میں رکھا تھا۔ رانی کو عزت کی زندگی ملی تو وہ بالکل ہی اللہ کی طرف مائل ہوگئی تھیں اسی دوران ان کی دوستی ایک عورت سے ہوئی جو اسپتال میں نرس تھیں انہیں اپنی بہن بنالیا ان کے شوہر نے انہیں چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی ایک سالہ بیٹی کے ساتھ ان کے ہاں رہنے لگی تھیں۔

☆......☆

ضیاء آفس سے آنے کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کے لیے اپنے روم میں لیٹ گیا تھا۔ فہر کی آمد ہوئی تو وہ اٹھ بیٹھا۔

''روڈ ماسٹر کو آج ٹائم کیسے مل گیا۔'' فہر کے سول انجینئر پر ضیاء اکثر یہی کہتا تھا۔

''ایسے ہی تم سے ملنے کا دل کر رہا تھا۔''

''شکر ہے آپ کا بھی دل کیا ملنے کا۔'' ضیاء اٹھ کے بیٹھ گیا۔

''یہ آپ اور تم کے چکر میں ہم دونوں ٹھیک سے بات ہی نہیں کرتے۔''

''وہ مجھے آپ کا دو سال بڑے ہونے کا خیال آجاتا ہے اس لیے ایسا ہوتا ہے۔'' فہر نے مسخرے پن سے کہا۔

''چل بکواس نہیں کر۔'' وہ ہنسا۔

''آؤ ڈائننگ ہال میں چلتے ہیں میں نے آفس سے آکے کچھ کھایا نہیں ہے بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ دونوں ہی ڈائننگ ہال میں آگئے۔

ثریا نے ان دونوں کے لیے کافی کچھ کھانے کا رکھ دیا تھا۔

''میں ایک کام سے آیا تھا۔'' فہر نے چائے کے سپ لیے اسے پوچھتے ہوئے ہچکچاہٹ بھی ہو رہی تھی مگر اس کے پاس ان دو لڑکیوں کی چیزیں تھیں جو اسے لازمی دینی تھیں۔

''بولو کون سا کام؟'' ضیاء اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''پرسوں تمہارا ڈرائیور دوپہر دو بجے کے ٹائم ڈالمین طارق روڈ پر تھا دو لڑکیاں تھیں گاڑی میں۔''

''یہ تم لڑکیوں کے چکر میں کب سے پڑ گئے۔'' اس نے فہر کو حیرانگی سے دیکھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے اصل میں، میں حیدرآباد سے واپسی پر شاپنگ کے لیے رک گیا۔ وہاں دو لڑکیاں بھی تھیں ایک لڑکی کا سامان گر گیا میں نے آواز بھی دی وہ دونوں تمہارے ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں چلی گئیں۔'' آگے کی کہانی خود سے بنا کر کہا۔

''تم کیا ان لڑکیوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔'' ضیاء اسے چھیڑنے لگا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ جھینپ گیا۔

''اصل میں، میں کنول آپی کے لیے بہت کچھ لایا تھا۔ میرے شاپرز ان کے شاپرز سے بدل گئے اور آپی کو تو غصہ آگیا کہ میں جھوٹ بول رہا تھا۔''

''کیسے غصہ آگیا۔'' ثریا بھی وہیں آگئیں۔

شکیل احمد بھی گھر آگئے تھے۔ ٹیبل پر ایک رونق ہی لگ گئی ضیاء اور فہر دونوں ہی مودب بن کے بیٹھ گئے۔

''ابو پرسوں سلام کہیں شاپنگ سینٹر گیا تھا کسی دو لڑکیوں کو لے کے۔''

''لڑکیوں کو...... گک......کون سی......'' شکیل احمد نے حیرانگی سے پوچھا۔
فہر نے ضیاء کے پاؤں پر اپنا جوتا رکھ دیا۔
''اوئی اماں۔'' وہ تو درد سے بلبلا اٹھا۔
''کیا وحشت ہے۔'' شکیل احمد نے فہما ئشی نگاہوں سے غصہ سے ہی کہا۔
''سوری سوری۔'' فہر سنبھل گیا۔
''آپ چائے تو بنوائیں میں یہ نہیں کھاؤں گا'' انہوں نے ثریا سے کہا وہ ان کی پلیٹ میں رول رکھ رہی تھیں۔
''یہ ضیاء کو بھی ابھی چیخنا تھا۔''
''ہاں تو کیا کہہ رہے تھے؟'' انہوں نے فہر کو ہی مخاطب کیا۔
''ماموں جان میرے شاپرز بدل گئے ہیں آپ کا ڈرائیور دو لڑکیوں کو لے کے آیا تھا میں پوچھ رہا تھا ان کا سامان میرے پاس ہے میں چاہتا ہوں ان کے پاس پہنچ جائے۔'' فہر نے جلدی جلدی اپنا مدعا بیان کیا۔
شکیل احمد نے خود کو نارمل کیا۔
''سلام کی کوئی رشتے دار ہوں گی میں پوچھ کے بتاؤں گا۔''
''ارے سلام ہے، تو ہیں اسے بلا کے پوچھ لیں۔'' ثریا نے جھٹ کہا۔
شکیل احمد نے پہلو بدلا جائے ان کے آگے رکھی تھی وہ گھبرا بھی گئے۔
''پرسوں سلام صبح سے گیا ہوا تھا آفس کے کام سے میں خود پوچھ لوں گا۔'' انہوں نے سنجیدگی سے ذرا تیز لہجے میں کہا۔
ثریا جز بز ہو گئیں فہر اور ضیاء ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔
''چائے لے کے کمرے میں جا رہا ہوں۔'' وہ اٹھ گئے۔
ثریا کو جانے کیوں شکیل احمد مسٹری کی طرح ہی لگنے لگتے تھے ثریا بھی اس کی تقلید میں میں اٹھ گئی تھیں۔
''یار فہر اتنی زور سے تم نے میرے پاؤں پر جوتا رکھا تھا۔''
''یار ضیاء آپ بھی چیخنے لگے۔''
''چپ کرو۔'' اس نے ڈانٹ دیا۔
''چل اٹھ سلام سے میں خود پوچھتا ہوں۔'' وہ فہر کو لے کے باہر نکل گیا۔ سلام کو دیکھا وہ نظر نہیں آیا۔
چوکیدار سے پوچھا۔
''صاحب بڑے صاحب نے اسے کسی کام سے ابھی ابھی بھیجا ہے۔''
''چل فہر اب ابو ہی پوچھ کے بتائیں گے۔'' اس نے فہر کے شانے پر تھپکی دی۔
فہر کا ذہن الجھ رہا تھا۔ ماموں جان چونکے کیوں تھے ایک دم اٹھ کے بھی چلے گئے۔

☆......☆

پوری رات لائٹ غائب رہی۔ یو پی ایس کی چارجنگ ختم ہو گئی تھی۔ جنریٹر ابھی لے نہیں سکے تھے اس کی جاب بھی تو نہیں لگ رہی تھی۔
صحن میں وہ زمین پر بستر بچھائے ہوئے تھے وہ اور حسن سو رہے تھے۔ چارجنگ فین حرا کے آگے لگا تھا۔ امی تو سو ہی نہیں سکی تھیں۔

''امی! کیا لائٹ ابھی بھی نہیں آئی؟'' وہ اٹھ کے بیٹھا۔ امی فجر کی نماز صحن میں ہی پڑھ رہی تھیں۔
''دو دفعہ چیک کے چلی گئی اندر حرا بھی پریشان ہو رہی تھی پنکھا بھی سلو ہو گیا ہے۔'' انہوں نے برآمدے میں جائے نماز بچھائی۔
''اسے بولیے ادھر باہر آ کے لیٹ جائے۔''
''رہنے دو سو رہی ہے تم ایسا کرو نماز پڑھ لو اور اسے بھی اٹھا دو۔'' امی نے سوئے ہوئے حسن کی طرف اشارہ کیا۔
''اسے آپ ہی اٹھائیے گا۔'' وہ سیدھا اندر کی طرف بڑھ گیا۔
''ارے یہ کیا پانی بھی ختم۔'' وہ بیسن کا نل بند کرتے آگے آیا۔
''آنٹی...... آنٹی! آریکہ کی آواز آ رہی تھی۔
حنین نے ناگواری سے اوپر دیکھا وہ کھڑکی سے نیچے ہی دیکھ رہی تھی۔
''تمہیں کسی وقت بھی چین نہیں ہے۔'' صحن میں ایمرجنسی لائٹ کی مدھم روشنی میں آریکہ کا چہرہ چمکتا ہوا نظر آیا۔
''وہ میں پانی لینے آئی تھی ابو کو وضو کرنا ہے۔'' وہ منمنا کے جھجک کے گویا ہوئی حنین کی تذلیل اسے بھولی کب تھی۔
''پانی یہاں بھی ختم ہو گیا ہے۔''
''اگر تھوڑا بہت مل جائے۔''
''ارے اریکہ بیٹا کچن میں بلیو پانی کا ڈرم رکھا ہے اس میں سے پانی لے لو۔'' امی کو اس کی آواز آئی تو وہ جھٹ آ گئیں کیونکہ حنین تو اسے صرف ڈانٹ ڈپٹ ہی کرتا تھا۔
اریکہ تیزی سے کچن میں گئی اور بالٹی میں پانی بھرنے لگی۔ پانی بھر کے وہ بڑی مشکل سے کچن سے بالٹی نکال کے لائی تھی۔
حنین نے ناگواری سے دیکھا کیونکہ امی کی نگاہیں اسے یہ اشارہ کر رہی تھیں بالٹی وہ اوپر چھوڑ آئے۔
''لاؤ مجھے دو تم نے تہیہ کیا ہے ساری زندگی مجھ پر مسلط رہو گی۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا جا رہا تھا اریکہ رک کے کھڑی ہو گئی تاکہ سیڑھیاں وہ آرام سے چڑھ جائے۔
بالٹی وہ صحن میں رکھنے آ گیا تھا اریکہ نے اس کے تنے ہوئے چہرے کو دیکھا۔
''صبح صبح تم پر نگاہ پڑ گئی ہے پتا نہیں کیسا گزرے گا دن۔'' طنز میں کہتا نکل گیا۔
جاب نہ ملنے کی وجہ سے وہ بہت چڑچڑا ہو گیا تھا۔ اریکہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی، اس کی جاب لگ جائے شاید حنین کے مزاج میں تبدیلی آ جائے۔ حنین بھی نماز پڑھ کے اپنے روزگار کے لیے نکلنے لگا۔ انٹرویو کو بھی تیسرا دن تھا۔ ابھی تک کوئی بھی جواب نہیں آیا تھا۔
''یہ لائٹ آئے گی بھی یا نہیں۔'' حرا اٹھ کے باہر آ گئی تھی۔ جب کہ حسن ابھی تک پڑا ہوا سو رہا تھا۔
''اسے کالج نہیں جانا جو پڑا ہوا سو رہا ہے؟''
''کیسے جائے گا لائٹ ہے نہیں، نہانے کے لیے بھی پانی نہیں ہے کیونکہ تم نہا کے آ گئے ہو۔'' امی ٹیبل پر ناشتا لگا رہی تھیں۔
''جاب لگ جائے پھر کچھ کرتا ہوں جنریٹر ہی لے لیا جائے کم از کم پانی تو چڑھ جایا کرے گا۔''

''جنریٹر تو میں کہہ رہی ہوں لے لو، کمیٹی نکلی ہے۔''
''ارے امی! آپ پیسے سنبھال کے رکھیں یہ آپ کے ہیں۔'' حنین اور حرا ناشتا کر رہے تھے۔
''یہ کیا بات کی یہ میرے اکیلے کے پیسے کیسے ہیں میرے بچوں کے ہیں۔'' انہوں نے جھٹ کہا۔
''ابھی آپ کچھ دن رک جائیں۔'' اس نے پھر کہا۔
''وہ تو شکر ہے اوپر کے پورشن کے کرائے سے گزر بسر ہو رہی ہے۔ اس مالک کا احسان ہے۔'' امی ہر وقت شکر ادا کرتی تھیں ان کے شوہر نے گھر بنوا لیا تھا اپنی زندگی میں اوپر کا پورشن کرائے پر دیا ہوا تھا۔ دو دکانیں بھی تھیں وہ بھی کرائے پر دی تھیں ان کا مکان مین روڈ پر تھا اس لیے مکان کی ویلیو اسی وجہ سے تھی۔
''امی میں ایک جگہ اور انٹرویو کے لیے جا رہا ہوں۔ آپ دعا کیجیے گا۔'' وہ ناشتے سے فارغ ہو کے گویا ہوا۔
''بھائی آپ کو ایک مشورہ دوں؟'' حسن کی لگتا تھا نیند پوری ہو گئی تھی وہ بھی ڈائننگ ٹیبل پر آ کے بیٹھا۔
''تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔'' وہ اس کے شرارتی مشوروں سے اچھی طرح واقف تھا۔
''ارے سن تو لیں ایک منٹ آپ کے کام کا ہی ہوگا۔''
حرا ٹیبل سے برتن اٹھاتے اٹھاتے تجسس کے مارے رک گئی۔
اریکہ ان سب کو ڈائننگ ٹیبل پر دیکھ کر رک گئی تھی۔ حسن کی بات جاری تھی۔
''آپ کسی امیر لڑکی سے شادی کر لیں تاکہ ہماری یہ جاب کی پرابلم تو ختم ہو۔''
اریکہ پہلو بدل کے رہ گئی۔ حنین کی چبھتی ہوئی تیکھی نگاہیں جو اس پر پڑ گئی تھیں۔ جانے کیوں وہ اس لڑکی سے اتنا چڑتا تھا۔
''ارے اریکہ باجی رک کیوں گئیں آیئے ناشتہ کریں۔'' حرا نے جھٹ اپنائیت بھرے لہجے سے مخاطب کیا۔
''نہیں شکریہ وہ مجھے ایک بوتل پانی چاہیے تھا۔''
''صبح سے اس پانی کی گردان نے میرے سر میں درد کر دیا ہے اور صبح ہی نظر بھی پڑ گئی ہے پتا نہیں آج بھی انٹرویو اچھا ہوگا یا نہیں۔''
''حنین کیا بدتمیزی ہے کیوں بے چاری کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔'' امی نے اسے سرزنش کی۔
حنین کو اریکہ کی رونے جیسی صورت واضح نظر آ رہی تھی۔
''اس لائٹ کی وجہ سے سارے کام ڈسٹرب ہوئے ہیں بیٹا تم پانی لے جاؤ اور ہاں اس کی باتوں کا برا نہیں ماننا۔'' وہ سر ہلا کے لب بھینچنے لگی۔
حرا نے پانی کی بوتل فلٹر سے بھر کے دے دی تھی۔ حنین بھی نکل گیا تھا۔
حسن پھر برآمدے میں بڑے تخت پر لیٹ گیا۔ اریکہ کو اس گھر کے سارے ہی افراد عزت دیتے تھے بس حنین کا کچھ تیکھا مزاج تھا۔
''حنین احمد! تم جانے کیوں میری سانسوں میں بسنے لگے ہو۔'' وہ پورا دن اسے ہی سوچتی رہی تھی۔ لائٹ دوپہر دو بجے آئی تھی جو بکھرے کام تھے سارے کیے۔

☆......☆

شکیل احمد کو یہ پریشانی ہو گئی تھی کہیں فہر کو نیل فر کے متعلق تو پتا نہیں چل گیا وہ انیس سال سے یہ راز چھپائے پھر رہے تھے۔ وہ موقع ملتے ہی نیل فر سے ملنے چلے آئے تھے۔

''بیٹا! آپ سے اور کچھ تو نہیں پوچھا تھا۔''

''نہیں تو ان کی ٹکر ہوئی تو ہمارا سامان وہیں گر گیا جو شاید ان کے پاس چلا گیا ہے۔'' نیل فر نے ان کے فکر مند چہرے کو بغور دیکھا۔

آخر کب تک وہ اسے چھپاتے رہیں گے کس طرح یہ زندگی اس کی گزرے گی پہلے امی تھیں تو اسے کسی کی فکر نہیں تھی اس کا واحد سہارا صرف اس کی ماں تھی یا پھر اب شہوار اور خالہ تھیں پتا نہیں اس کی یہ زندگی کیسے بے مصرف گزرے گی۔

''خیر تمہارا سامان تو آجائے گا۔'' انہوں نے تسلی دی۔

''آپ سے ایک بات کہوں۔'' اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''ہاں کہو بیٹا!'' شکیل احمد اپنی خوب صورت نازک سی بیٹی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ان کی دعا اور خواہش تھی اس کی شادی اچھے گھرانے میں ہو اور اگر کسی طرح فہر سے ہو جائے تو کتنی خوشی کی بات ہوگی۔ ان کی بیٹی کم از کم ان کے سامنے تو رہے گی اور فہر ایک سمجھدار لائق فائق انجینئر تھا۔

''میری زندگی کیا اسی طرح گزرتی رہے گی آپ سب سے چھپا کے کب تک رکھیں گے۔''

''ہاں یہ تم نے اچھی بات کی۔'' انہوں نے لمبی سانس بھری۔

''کچھ باتوں اور کاموں کا وقت ہوتا ہے تم میرے لیے بہت اہم ہو تمہاری زندگی ایسے نہیں گزرے گی میں تمہیں ایک دن لے بھی جاؤں گا مگر مجھے ابھی اس وقت کا انتظار ہے۔'' انہوں نے مسکرا کے گہری سوچ کے ساتھ اس کے رخسار پر تھپکی دے کے یقین دلایا۔

''ثریا مزاج اور عادت کی بہت اچھی ہے اس نے دونوں بیٹوں کی بہت اچھی تربیت کی ہے اور میرا سب سے زیادہ خیال رکھتی ہے مگر میں یوں اس پر یقین بھی نہیں کر سکتا کیا پتا ری ایکٹ ان کا ٹھیک نہ ہو۔'' شکیل احمد نے بات بالکل صاف کی تھی۔

''آپ مجھ سے ملنے نہیں آیا کریں۔'' نیل فر کی آنکھوں میں نمی در آئی اسے جانے کیوں ہر وقت اپنے اکیلے پن کا احساس رہتا تھا۔

''ایسی بات کیوں کر رہی ہو بیٹا آپ میرے جگر کا ٹکڑا ہو میری اکلوتی بیٹی ہو، دو بیٹے تو اللہ نے دیئے اور ایک بیٹی بھی دے دی۔''

''آپ کو میری وجہ سے کتنی مشکلوں کا بھی تو سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

''کوئی مشکل نہیں ہے تم میرا اپنا خون ہو مجھے کسی سے کوئی ڈر نہیں۔'' وہ اسے ساتھ لگائے گویا ہوئے وہ اس کے اندر کی محرومی کو سمجھ رہے تھے۔

''اچھا یہ بتاؤ میری بیٹی کا پڑھائی سے دل کیوں اچاٹ ہو رہا ہے بیٹا اپنا ماسٹرز تو کمپلیٹ کر لو۔'' شہوار نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔

''آپ سے شہوار نے کہا ہوگا۔''

''بیٹا! وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے کیوں پڑھائی سے بھاگ رہی ہو۔'' وہ حیران بھی تھے۔

''میرا دل نہیں کر رہا بالکل بھی پڑھنے کو۔'' وہ بہت زیادہ اپنی پڑھائی سے بے زار نظر آ رہی تھی۔ شکیل احمد نے جانچتی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔

''بیٹا! اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔''
''کوئی مسئلہ نہیں ہے میں تھک جاتی ہوں۔''
''تم سے میں کہہ رہا ہوں ڈرائیونگ سیکھ لو تم دونوں بہنیں ایک ساتھ چلی جایا کرنا۔'' انہوں نے کہا۔
''گاڑی چلانا کون سکھائے گا؟''
''انسٹی ٹیوٹ جوائن کرلو میں قریبی جگہ میں ایڈمیشن کروا دیتا ہوں۔''
''ابو ابھی تو بالکل بھی نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ کہیں شکیل احمد اسے عملی جامہ پہنا دیں۔ وہ ہنسنے لگے۔
''چلو جیسے تمہاری مرضی مگر میری خوشی تمہاری پڑھائی پوری ہو جائے اس میں ہے۔''
''پڑھ کے کرنا کیا ہے۔'' وہ منہ بنانے لگی۔
''یہ بات بھی ٹھیک ہے کرنا کیا ہے پھر یہ بتاؤ کرنا کیا چاہتی ہو؟''
''ابھی تو صرف آرام۔''
''ٹھیک ہے تم آرام کرو اور ہاں وہ سامان دے دو جو غلطی سے تمہارے پاس آگیا ہے۔'' انہیں یاد آیا۔
''اوکے لے کے آتی ہوں۔'' نیل فر اٹھ گئی۔ شکیل احمد کو کبھی کبھی نیل فر کو ہینڈل کرنا بہت مشکل ہو جاتا تھا اس نے پڑھائی سے دل اچاٹ کا بتایا یہ انہیں بالکل اچھا نہیں لگا تھا وہ اپنی بیٹی کو قابل بنانا چاہتے تھے اس کی ہر خواہش پوری کرنا چاہتے تھے۔
''تمہارا سامان بھی کل تک آجائے گا۔'' وہ شاپرز تھام کے اٹھے اور اسے ڈھیروں پیار کیا۔ نیل فر کو پھر انتظار دے گئے اور جانے کتنے دنوں تک اسے انتظار کرنا تھا۔

☆......☆

کتنے سال گزر گئے تھے اور کوئی دن ایسا نہیں ہوتا ہوگا جو وہاں سے گزرتا نہیں ہوگا جانے کیوں اس نے آس کے دیپ جلا لیے تھے۔ شاید کبھی دوبارہ سے اسے وہ سب مل جائے جہاں وہ ہوا کرتا تھا۔
ابو، امی جان اور بہن بھائی کیسے گزر بسر ہو رہی ہوگی۔ رمعنہ کتنی سمجھ دار تھی اکثر اس کے سوالوں سے وہ بہت بے زار ہو جاتا تھا کیونکہ وہ ہر بات بار بار پوچھتی تھی اس سے بہت چھوٹی تھی چاروں بہن بھائی ایک جگہ ہوتے تھے۔
نمرہ اور اسجد تو بہت چھوٹے سے بچے ہی تھے۔ آج تو وہ دونوں بھی کافی بڑے ہو گئے ہوں گے۔
''آہ..... کاش وہ اتنا جذباتی نہیں ہوتا یا پھر بچپن میں سارے ہی بچے ایسے ہوتے ہیں ہر بات سے بھاگنے اور ڈرنے والے۔''
اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ دو دن سے وہ بہت الجھا الجھا تھا۔ کھانا کھانے وہ دوپہر میں گھر بھی نہیں گیا۔ آفس سے وہ کسی ضروری کام کا عذر پیش کر کے نکل آیا تھا۔ پورا دن خالی سڑکوں پر گاڑی گھماتے ہوئے وہ ذہنی اور جسمانی طور پر تھک گیا تھا۔
منیب احمد کی کال آگئی تھی۔ وہ اس کے لیے فکر مند ہو رہے تھے۔ دس بج رہے تھے۔ اس وقت سب ڈنر کرنے کے بعد اپنے اپنے روم میں ہوتے تھے۔ نوجوان پارٹی لاؤنج میں بیٹھ کے بڑی اسکرین پر اپنے پسندیدہ پروگرام دیکھ رہے ہوتے تھے۔

(جاری ہے)

ردا کی ڈائری

ریما نور رضوان کی ڈائری سے

فیض احمد فیض کی ایک خوب صورت نظم

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کچھ کام
کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق کام سے الجھتا رہا
پھر تنگ آ کر آخر ہم نے
دونوں کو ادھورہ چھوڑ دیا

مہوش جواد کی ڈائری سے

احمد فراز کی غزل

تمنا بزم تھی مشتاق حرف بابت دوست
سو میں نے اور بڑھا دی ذرا حکایت دوست
وفا تو اپنے سے ہوتی ہے دوسرے سے نہیں
سو اس بنا پہ کرے کیا کوئی شکایت دوست
یہ لوگ سرو صنوبر کا ذکر کرتے ہیں
یہ استعارے نہیں حسب قد و قامت دوست
ادھر اُدھر نہ یوں ہی زندگی لٹاتے پھرو
کہ صرف دل ہی نہیں جان بھی ہے امانت دوست
تمام وار کسی ایک مہربان کے نہیں
کوئی ہے بخشش دنیا عنایت دوست
تم ہی بتاؤ کہ طے کس طرح کرو گے فراز
یہ عمر بھر کا سفر اور بے رفاقت دوست

سنبل محسن کی ڈائری سے

محسن نقوی کی نظم

دور کسی ویرانے میں
اک چھوٹی سی بستی تھی
اک پاگل سی لڑکی جہاں دردر پھرتی رہتی تھی
ندیوں کے شفاف پانی سے
وہ ہر پل کھیلتی رہتی تھی
اک خواب پلکوں پر سجائے
جسے کس سے ڈھونڈتی رہتی تھی
وہ ہاتھوں پر چوڑیاں کھنکھاتی
رم جھم، رم جھم ہنستی تھی
تھا کوئی اسے پیارا بہت
وہ سب سے کہتی رہتی تھی
کیا ہو گا وہ سنگ میرے کبھی
اک امید لیے وہ پوچھتی رہتی تھی
اک دن ایسا بھی ہو گیا
ہر سپنا اس کا کھو گیا
وہ راجہ تھا اسے پیارا بہت
وہ دور بہت ہو گیا
وہ بھولی تھی

پاگل تھی
صرف اس کے نام پر جیتی تھی
اس رم جھم ہنسی کی جگہ

اب
پل پل ساون برستے ہیں
ندیوں کے پانی بھی

اب
اس کی ہنسی کو ترستے ہیں

ایم جے قریشی کی ڈائری سے

ڈاکٹر علی شریعتی کی نظم

مجھے ایک عورت کو دیکھ کر
بہت دکھ ہوتا ہے
جب ہمارے معاشرے میں
اس کی ساکھ پر دھبہ لگتا ہے
اور
وہ اپنے مٹانے کے لیے
داڑھی نہیں رکھ سکتی

مہ جبین بلال کی ڈائری سے

پروین شاکر کا کلام

پرل کا نیچرل پنک
ریولان ہینڈ لوشن
الزبتھ آرڈرن کا بلش آن بھی
میڈورا میں پھر نیل پالش کا کوئی نیا شیڈ آیا؟
میرے اس بنفشی دوپٹے سے ملتی ہوئی
رائمل میں لپ اسٹک ملے گی؟
ہاں!
وہ ٹیولپ کا شیمپو بھی دیجیے گا
یاد آیا
کچھ روز پہلے جو ٹیوزر لیا تھا
وہ بالکل ہی بیکار نکلا
دوسرا دیجیے گا
ذرا بل بنا دیجیے
ارے! وہ جو کونے میں اک سینٹ رکھا ہوا ہے
دکھائیں ذرا
یہ خوشبو اس کی پسندیدہ خوشبو رہی ہے
سدا سے اس کے ملبوس سے پھوٹتی تھی
ذرا اس کی قیمت بتا دیں
اس قدر
اچھا یوں کیجیے
باقی چیزیں کبھی اور لے جاؤں گی
آج تو صرف اس سینٹ کو پیک کرا دیجیے

بقاء امروہوی کی ڈائری سے

فیض احمد فیض کی نظم

تیرے غم کو جاں کی تلاش تھی
تیرے جاں نثار چلے گئے
تیری رہ میں کرتے تھے ہر طلب
سرِ رہگزار چلے گئے، تیری کج ادائی سے ہار کے
شبِ انتظار چلی گئی، میرے ضبطِ حال سے روٹھ کر
میرے غمگسار چلے گئے
نہ سوالِ وصل نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
تیرے عہد میں دلِ زار کے
سبھی اختیار چلے گئے
نہ رہا جنونِ وفا یہ رہن یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا
وہ گناہگار چلے گئے
یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ راہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم
سرِ بزمِ یار چلے گئے

اشعار

ریمانور رضوان ــــــــــ کراچی
نہ عروج اچھا ہے نہ زوال اچھا ہے
جس حال میں رکھے خدا وہ حال اچھا ہے

شبانہ ــــــــــ کھاریاں
اس کی نظر کے سنگ سے وہ مثلِ آئینہ
ٹوٹے تو ٹوٹ کر بھی اسے دیکھتے رہے

پرنس محسن علی ــــــــــ کھاریاں
ایک لمحے میں بھرے بازار سونے ہو گئے
ایک چہرہ سب پرانے زخم تازہ کر گیا

سنبل ــــــــــ کھاریاں
یاد آغاز عشق اب تک انہیں جاں و دل حزیں ہے
وہ ایک جھجک سے وہ ایک جھپک سے ہر التفات نظر سے پہلے

کرن جواد ــــــــــ کھاریاں
میری منت میرا تعویز دعا تم ہو
خدا سے کچھ اور مانگوں تو ناشکری ہو گی

عروہ بٹ ــــــــــ کھاریاں
برباد ہو کر یار کے دل میں ملی جگہ
آباد کر گئیں میری بربادیاں مجھے

حسن عارف ــــــــــ کھاریاں
نوازش مجرمان عشق کی جلاد کرتے ہیں
خدا اجر ان کو دے اسیر آزاد کرتے ہیں

عانیہ نیازی ــــــــــ ربوہ
غم اپنے کسی طور عبارت نہیں کرتے
ہم اہل وفا اتنی جسارت نہیں کرتے
ہم لوگ خطا وار محبت سہی لیکن
ہم لوگ وفاؤں کی تجارت نہیں کرتے

صبا سحر ــــــــــ ہارون آباد
کتنی دلکش ہے اس کی خاموشی
ساری باتیں فضول ہوں جیسے

دھنک ناز ــــــــــ کراچی
لینا ہے اس کی یاد سے مجھ کو بھی کچھ نہ کچھ
جیسے سنار راکھ یونہی چھانتا نہیں
دل کے معاملے میں بھلا کوئی کیا کرے
یہ تو بڑے بڑوں کو بھی گردانتا نہیں

یمنیٰ ناصر ــــــــــ اوکاڑہ
ویران راہ گزر کو دیکھا کریں گے ہم
آئے گی تیری یاد تو رویا کریں گے ہم
وہ دن جو تیرے ساتھ گزارے تھے پیار میں
کتنے حسین خواب تھے سوچا کریں گے ہم

نوشین صدیقہ ــــــــــ لاہور
تم نے تو کہہ دیا کہ محبت نہیں ملی
مجھ کو تو یہ بھی کہنے کی فرصت نہیں ملی
پھر اختلاف رائے کی صورت نکل پڑی
اپنی یہاں کسی سے بھی عادت نہیں ملی

امبرین حیدر ــــــــــ اسلام آباد
مجھے لہجوں کے بدلنے سے ہمیشہ خوف آتا ہے
کہ لہجے جب بدلتے ہیں کوئی اپنا نہیں رہتا

نور بانو ــــــــــ کوئٹہ
میرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر وہ حساب آج چکا دیا
جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

حنا ــــــــــ ملتان
جو ہم کلام ہو ہم سے اسی کے ہوتے ہیں
ہم ایک وقت میں ایک آدمی کے ہوتے ہیں

ثناء حیات ــــــــــ کراچی
یہ کناروں سے کھیلنے والے
ڈوب جائیں تو کیا تماشہ ہو
وقت کی چند ساعتیں ساغر
لوٹ آئیں تو کیا تماشہ ہو

اریبہ کامران ــــــــــ لاہور
بہت ہیں خواب مگر خواب ہی سے کیا ہو گا
ہمارے بیچ جو حائل ہے وہ حقیقت ہے
سمجھ رہے تھے مسافر قیام کو منزل
خبر نہیں تھی کہ آگے بھی ایک ہجرت ہے

مریم نواز ــــــــــ فیصل آباد
مجھے چپ لگی ہے مدعا کہتے کہتے
رکے ہیں وہ کیا جانے کیا کہتے کہتے
چلے تم کہاں میں نے تو دم لیا تھا
فسانہ دلِ زار کا کہتے کہتے

درخشاں ضیاء ــــــــــ کراچی
بن کے قطرہ سمندر میں گم ہو جاؤں
جب اپنے آپ سے نکلوں تو تم ہو جاؤں

رامین مرتضیٰ ــــــــــ پشاور
تو آپ میرے ساتھ سفر پہ بضد ہوا
جنگل ہے خوفناک تو طعنے مجھے نہ دے
پتھر بنا دے جسم کو سوچوں کو راکھ کر
لیکن جدائیوں کے زمانے مجھے نہ دے

شمائلہ ملک ــــــــــ کراچی
وہ دل نواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
مرا علاج میرے چارہ گر کے پاس نہیں

حمنیٰ یاسر ــــــــــ گجرات
کسی کچے رنگ کی طرح شاید
اترنے لگے ہیں سب کے دلوں سے ہم

رابعہ منیر ــــــــــ سرگودھا
ہاتھ اٹھاؤں اور تمہارے لیے کچھ نہ مانگوں
تم تو میری ہر دعا میں شامل ہو آمین کی طرح

ماہم ملک ــــــــــ اسلام آباد
تیرے جانے کے بعد کون روکتا ہمیں
جی بھر کے خود کو برباد کیا ہم نے

فاطمہ حیدر ــــــــــ راولپنڈی
سالوں سال تجھے ورد میں رکھا میں نے
میرے ہونٹوں پہ تیرے نام کے چھالے پڑ گئے

سونل ندیم ــــــــــ لاہور
کچھ تجھ کو محبت پہ یقین تھا نہ وفا پر
کچھ دکھ مری تقدیر میں لکھا بھی بہت ہے
بینائی اندھیروں سے بھلا کیسے بچاتا
اک شخص ترے ہجر میں جاگا بھی بہت ہے

نور العین ــــــــــ کراچی
محبت ہار کے جینا بہت دشوار ہوتا ہے
اسے بس اتنا کہہ دینا بھرم توڑا نہیں کرتے

☆

اس ماہ میں

اس ماہ کی تلخ حقیقت

معاشرے میں عورت کے احترام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جھگڑا مردوں کے درمیان ہوتا ہے۔ گالی عورت کو دی جاتی ہے۔
(شکیل احمد آزاد)
ریمان نور رضوان۔ کراچی

اس ماہ کی خوب صورت باتیں

☆ اگر کوئی تم سے جلتا ہے تو بجائے غصہ ہونے کے اس کی جلن کی قدر کرو۔
کیونکہ: یہ وہ لوگ ہیں جو تمہیں خود سے بہتر سمجھتے ہیں۔
☆ کوئی تم سے روٹھ جائے اور پھر وہ خود ہی تم سے ملنے کو ترسے تو اسے کھونا مت۔
کیونکہ: وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے۔
☆ غلطی تسلیم کرنے اور گناہ چھوڑنے میں کبھی دیر مت کرنا۔
کیونکہ: سفر جتنا طویل ہوگا۔ واپسی اتنی ہی مشکل ہو جاتی ہے۔
☆ اچھے رشتے اور زندگی کے ہمسفر جب بھی ناراض ہوں تو انہیں منا لینا چاہیے۔
کیونکہ: تسبیح جب بھی ٹوٹتی ہے تو اس کے دانے چن لیے جاتے ہیں۔

پرنس محسن علی۔ کھاریاں

اس ماہ کی دعا

اے رحمان و رحیم تو میری مدد فرما، تجھ سے بہتر کوئی مددگار نہیں تو میری حفاظت فرما تجھ سے بہتر کوئی محافظ نہیں تو مجھے راستہ دکھا تجھ سے بہتر کوئی رہنما نہیں۔ قیامت کے دن میرا پردہ رکھ کہ تجھ سے بہتر کوئی راز دار نہیں۔ یہ دعا قبول فرما کہ بے شک تجھ سے بہتر کوئی سننے والا نہیں۔

عامر نواز۔ کھاریاں

اس ماہ کی مزاحیہ نظم

پکایا اس نے جب پراٹھا کرارہ
کھاتے ہی جسے ہمیں مل گیا درد کرارہ
عید پر آئی تھی گھر پہنا تھا اس نے شرارہ
بیٹھے تھے ہم وہاں جہاں گر رہا تھا فوارہ
اس نے بتایا SMS آیا تھا تمہارا
ہم نے پوچھا کیا جواب ہے تمہارا
بولی مسکرا کر کیا حال ہے تمہارا
ہم سمجھ گئے اس کا اشارہ کہ
چانٹا کھاؤ گے دوبارہ

مہرین کنول۔ کراچی

اس ماہ باتوں سے خوشبو آئے

☆ انسان دنیا میں تنکے کی طرح بہہ جانے کے لیے پیدا نہیں ہوا بلکہ اسے تو ملاح کی طرح موجوں کا مقابلہ کر کے دریا کے پار اترنے کے

لیے پیدا کیا گیا ہے۔
☆ اپنے آپ کو دوسروں کی ضرورت بناؤ، تم کامیاب رہو گے۔
☆ خاموشی اختیار کر کے دوسروں کی نظروں میں بے وقوف بننا خاموشی توڑ کے بے وقوف بننے سے زیادہ بہتر ہے۔
☆ تم سنجیدہ بنو لیکن تلخ مزاج نہ بنو، بہادر بنو مگر جلد بازی سے بچو، صابر بنو لیکن کمینہ پن اختیار نہ کرو، مستقل مزاج بنو لیکن ضدی نہ بنو۔
☆ پیار ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے آگے ہر دیوار ٹکڑے ہو جاتی ہے۔
☆ ٹھوکر نہیں کھانا تو راستے کے پتھر ہٹاؤ۔
☆ ہر عمل کے اندر اس کا انجام یوں چھپا ہوتا ہے جیسے کسی بیج میں کوئی درخت۔
☆ بارش کا ایک چھوٹا سا قطرہ یوں تو کچھ نہیں لیکن اس کی قدر و قیمت تپتا ہوا صحرا جان سکتا ہے، بپھرا ہوا سمندر نہیں۔

زنیرہ احمد۔ میر پور خاص

اس ماہ کی کرنیں

☆ سورج سے سبق سیکھنا ہے تو اسے ڈوبتے ہوئے دیکھو۔
☆ بات لفظوں کی نہیں لہجے کی ہوتی ہے۔
☆ مصیبت اگر انسان کو دولت مند نہیں تو عقلمند ضرور بنا دیتی ہے۔
☆ عاقل پہلے قلب سے پوچھتا ہے پھر منہ سے بات کرتا ہے۔
☆ اگر انسان سوچنے کی عادت ڈالے تو ہر شے میں اس کے لیے عبرت ہے۔
☆ مستقل مزاجی کانٹوں کو پھول بنا دیتی ہے۔
☆ والدین سے سخت لہجے میں بات کرنا بربادی کو دعوت دیتا ہے۔
☆ تعریف کے قابل وہ شخص ہے جو غرور اور تکبر جیسی لعنت سے پاک ہو۔
☆ جو لوگ تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں وہ باصلاحیت نہیں ہوتے۔

اس ماہ کی خوب صورت بات

''دنیا میں جو رہتا ہے وہ لینے کا خیال فوراً پال لیتا ہے۔ یہی خیال طمع بن کر زہریلا ہو جاتا ہے اور محبت کو ہی مار ڈالتا ہے۔

مصنف: اختر عباس
انتخاب: دھنک ناز۔ کراچی

اس ماہ کی نظم

مجھے اپنا ستارا ڈھونڈنا ہے

ستارا ڈھونڈنا ہے
ستاروں سے بھرے اس آسماں کی وسعتوں میں
مجھے اپنا ستارہ ڈھونڈنا ہے
فلک پر کہکشاں در کہکشاں اک بے کرانی ہے
نہ اس کا نام ہے معلوم نہ کوئی نشانی ہے
بس اتنا یاد ہے مجھ کو
ازل کی صبح جب سارے ستارے
الوداعی گفتگو کرتے ہوئے رستوں پر نکلتے تھے
تو اس کی آنکھ میں اک اور تارا جھلملایا تھا
اسی تارے کی صورت کا
میری بھیگی ہوئی آنکھوں میں اک خواب رہتا ہے
میں اپنے آنسوؤں میں اپنے خوابوں کو سجاتا ہوں
اور اس کی راہ تکتا ہوں
سنا ہے گمشدہ چیزیں، جہاں پر کھوئی ہوتی ہیں
وہیں سے مل بھی جاتی ہیں

سیدہ فرزین حبیب۔ کراچی

اس ماہ کا اقتباس

عبدالحلیم شرر اپنے ناول ''فردوس بریں'' میں لکھتے ہیں کہ شداد نے ایک جنت بنائی تھی۔ اتنی دلفریب ہوش ربا جو ایک دفعہ دیکھ لیتا بار بار دیکھنے آتا۔ کچھ ایسا ہی حال امریکا کی بہشت سنگ و خشت کا ڈالر کا ہے جو آتا ہے یہاں کے طلسمی ماحول کی کشش سے یہیں کا ہو جاتا ہے۔ اہم سوال ہماری آئندہ نسل کا ہے۔ کیا یہ نونہال اپنی مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی حفاظت کر سکیں گے؟ کیا مادری زبان کا حق ان سے ادا ہو سکے گا۔

فرزانہ اسلم۔ کراچی

اس ماہ کی نظم

چلو کسی کے گھر چلتے ہیں
جس کے گھر کے دروازوں پر دربانوں کا راج نہ ہو
جس کے گھر پر یوں جانے میں ہم کو کچھ لاج نہ ہو
جس کے گھر، دیواروں پر اکتاہٹ کا زنگ نہ ہو
جس کی پیشانی چوڑی ہو لیکن سینہ تنگ نہ ہو
جس کی روشن روشن آنکھیں ہم کو دیکھ کر کھل جائیں
اتنی خوشی سے ملے وہ ہم سے
جیسے صدیوں کے بچھڑے دوبارہ اچانک مل جائیں
چلو کسی کے گھر چلتے ہیں

فاطمہ ادریس۔ کھاریاں

اس ماہ کے سنہرے موتی

☆ محبت کی عمارت میں شک کی دراڑ پڑ جائے تو وہ معذرت کے گارے سے بھر تو سکتی ہے مگر نشان باقی رہتا ہے۔

☆ اگر کچھ لوگ ساتھ چھوڑ دیں تو ان لوگوں کو سفر نہیں چھوڑنا چاہیے جنہیں راستہ معلوم ہو۔

☆ نئی بنیادیں وہی لوگ بھر سکتے ہیں جو اس راز سے واقف ہوں کہ پرانی بنیادیں کیوں بیٹھ گئیں۔

☆ کسی شخصیت کو پرکھنا اتنا ہی مشکل کام ہے جتنی وقت کی شناخت۔

☆ غم کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو مگر نیند سے پہلے تک ہے۔

☆ اگر تمہیں زیورات کا شوق ہے تو کان میں سوراخ تو ہوگا۔

☆ دل کی سلیٹ پر لکھنے سے پہلے سوچ لیں کہ نقش مٹائے نہیں مٹتے۔

☆ دل کے البم میں دل لگی کے لیے تصویریں نہ لگائیں بلکہ ایسی تصویر لگائیں جو دل کو لگیں۔

☆ زندگی قیمتی شے ہے اس کے بدلے سب چیزیں ضائع کر دو مگر اس کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو۔

☆ میں نے سورج سے نور اور چاند سے روشنی مانگی مگر مجھے اپنے دل سے جو نور ملا جو روشنی ملی وہ کسی نے نہ دی۔

☆ ہمت بھی عجب پھولے ہوئے غبارے جیسی ہوتی ہے ذرا ناواقف بات کی سوئی چبھی، شکل ہی نہیں۔ حالات و حالت تک بدل دیتی ہے۔

☆ انسانیت ایک مشترکہ دولت ہے جس کی حفاظت انسان کا فرض ہے۔

افشاں علی۔ کراچی

نفرت

نفرت کیا ہے؟
نفرت چار لفظوں پر مشتمل ہے۔
یہ لفظ اپنے اندر کیا معنی رکھتا ہے؟
ن سے ''نرگ''
ف سے ''فاصلے''
ر سے ''روگی''
ت سے ''تباہی''

یعنی یہ لفظ جب کسی کے اندر جنم لیتا ہے تو زنگ بنا دیتا ہے۔ زندگی کو پھر نفرت کرنے والے سے فاصلے قائم ہو جاتے ہیں اور یہ فاصلے روگ بن جاتے ہیں جو تباہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اپنی زندگی کو خوشی کا گہوارہ بنانے کے لیے اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔

ردبینہ نظام۔ کراچی

اس ماہ کی دلچسپ معلومات

فجر کی اذان سب سے پہلے انڈونیشیا میں شروع ہوتی ہے اور پھر ملائیشیا، ڈھاکا، سری لنکا، انڈیا، پاکستان، افغانستان، مسقط، سعودیہ، کویت، دبئی، یمن، عراق، ایران، استنبول، لیبیا، امریکہ تک لگاتار نو گھنٹے فجر کی اذان ہوتے ہونے واپس انڈونیشیا میں پہنچتی ہے۔ جہاں ظہر کی اذان کا وقت ہو جاتا ہے۔

اسی طرح پانچ وقت کی اذان سے پوری زمین پر ایک بھی سیکنڈ ایسا نہیں جب اذان کی آواز نہ آتی ہو۔ سبحان اللہ۔

امینہ رؤف۔ جہلم

اس ماہ کا فلسفہ

خاموشی ان دنوں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ ہر طرف خاموشی ہی خاموشی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کا تصور ذہنوں کو جکڑے ہوئے ہے۔ اس کی داستان سے یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی ریت کے تپتے ٹیلے پر بیٹھا ہو اور بے دردی سے رو رہا ہو۔ خاموشی اس کے اردگرد منڈلا رہی ہو جب اس کے آنسو سسکیوں میں ڈھلتے ہوں تو چپکے سے خاموشی اس سے لپٹ جاتی ہے اور اس کا دامن پکڑ کر رو پڑتی ہے اور اس کے کان میں ایک بہت اہم بات کہتی ہے کہ خاموش انسان خاموشی کی طرح گہرا ہوتا ہے خاموشی اسے خاموش کر دیتی ہے۔

سمیرا انور۔ جھنگ

اس ماہ کے نماز اور سائنسی انکشافات

نماز ایک بہترین ورزش ہے۔ سستی، کاہلی اور پرفتن دور میں نماز ہی ایک چیز ہے جس کو صحیح طور پر پڑھا جائے تو دنیا کے تمام دکھوں کا مداوا بن سکتی ہے۔ نماز کی ورزشیں جہاں بیرونی اعضاء کی خوشنمائی و خوب صورتی کا ذریعہ ہیں وہاں دل، گردے، جگر، دماغ، پھیپھڑے، آنتیں، معدہ ریڑھ کی ہڈی، گردن، سینہ اور تمام قسم کے گلینڈز کی نشوونما کرتی ہے۔

آدمی ساری رات سویا رہتا ہے جس کی وجہ سے اعضاء سست ہو جاتے ہیں۔ جسم کا دوران خون سست ہو جاتا ہے۔ اب اس جسم کو ایسی ورزش کی ضرورت ہے جو جسم کو دوبارہ چست کر دے، تو فجر کی نماز رکھ دی گئی اس کے بعد پھر بندہ طویل کام کاج کے بعد پریشان ہوتا ہے تو ظہر کی نماز کا حکم دیا گیا تاکہ بندہ سارے خیالات کو بھلا کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھک جائے۔ پھر عصر کی نماز کا حکم ہوتا ہے تاکہ بندہ کسی بھی طریقے سے اپنے رب کی یاد میں رہے۔ غافل نہ ہو اور یہی کیفیت مغرب کی بھی ہے۔ پھر عشاء کی نماز کا وقت ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ رکعتیں ہیں تاکہ آدمی جو کھانا کھاتا ہے وہ اس کی برکت سے ہضم ہو جائے کیونکہ جو کھانا جسم میں ہضم نہیں ہوتا وہ طرح طرح کی بیماریوں کا باعث بنتا ہے۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

......☆......

خوشبو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اگر تم اتنی غلطیاں کرو کہ تمہاری غلطیاں آسمان تک پہنچ جائیں پھر توبہ کرو تو (پھر بھی) اللہ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔'' (ترمذی)

سنہری معلومات

❁ پیارے نبی حضرت محمدؐ کے دادا کا نام عبدالمطلب تھا۔

❁ پیارے نبیؐ کی دادی کا نام فاطمہ بنت اسد تھا۔

❁ پیارے نبیؐ کے والد کا نام حضرت عبداللہ تھا۔

❁ پیارے نبیؐ کی والدہ کا نام حضرت آمنہ تھا۔

❁ پیارے نبیؐ کا تعلق قبیلہ قریش سے تھا۔

❁ پیارے نبیؐ کے دادا قبیلہ قریش کے سردار تھے۔

❁ حضرت عبداللہ انتقال سے پہلے تجارت کے لیے شام کے سفر پر روانہ ہوئے۔

❁ سفر سے واپسی پر حضرت عبداللہ مدینہ منورہ کے قریب بیمار ہو گئے تھے۔

❁ پیارے نبیؐ کی نبوت پر سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ نے اسلام قبول کیا۔

ملک عامر نواز۔ کھاریاں

جمعہ کے دن کی فضیلت، احادیث کی روشنی میں

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہتر دن کے آفتاب نے اس پر طلوع کیا جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے اور اسی میں جنت میں داخل کیے گئے اور اسی میں جنت سے اترانے کا حکم ہوا اور قیامت جمعہ ہی کے دن قائم ہو گی۔ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کسی مسلمان کو جمعہ کے دن مغفرت کیے بغیر نہ چھوڑے گا۔ (طبرانی)

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمان جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات میں وفات پائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے فتنہ قبر سے بچائے گا۔ (احمد ترمذی)

حضرت انسؓ سے روایت ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ کی رات روشن رات ہے اور جمعہ کا دن چمک دار دن ہے۔ (بیہقی)

حضرت سعد بن معاذؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ کا دن تمام دنوں کا سردار ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے بڑا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیدالاضحیٰ وعید

الفطر سے بڑا ہے۔اس میں پانچ خصلتیں ہیں۔
1۔ اللہ نے حضرت آدمؑ کو اسی دن پیدا کیا۔2۔اسی دن زمین پر اتارا۔3۔ اسی دن وفات دی۔4۔اس دن ایک ساعت ایسی ہے کہ بندہ اس وقت جس چیز کا سوال کرے وہ اسے دے گا۔ جب تک حرام کا سوال نہ کرے۔5۔ اور اسی دن قیامت قائم ہو گی کوئی مقرب فرشتہ آسمان وزمین ہوا پہاڑ ودریا ایسا نہیں کہ جمعہ کے دن سے نہ ڈرتا ہو۔(ابن ماجہ)۔

فاطمہ ظہیر۔کراچی

نظریہ خواتین

مرد جب کوئی چیز خریدتا ہے تو اس کی نظر میں عام طور پر صرف یہی وجہ ہوتی ہے کہ اس کی ضرورت ہے جب کہ خواتین کوئی چیز خریدتی ہے تو مندرجہ ذیل وجوہات ہوسکتی ہیں۔

☆باہر کی بنی ہوئی ہے۔

☆ایسی کسی اور کے پاس نہیں ہے ابھی تک۔

☆شوہر نے خاص تاکید کی ہے اس کو نہ خریدنے کی۔

☆سستی ہے۔

☆اس کی وجہ سے تو اس کی پڑوسن اتراتی ہے۔

☆سب کے پاس ہے میرے پاس نہیں ہے۔

☆سہیلی جل جائے گی۔

عاصمہ آفتاب۔کوئٹہ

خود اعتمادی

احساس برتری میں مبتلا شخص دوسرے لوگوں کے لیے عذاب جان واذیت کا باعث ہوتا ہے تو احساس کمتری میں مبتلا شخص اپنے لیے عذاب جان اور ذہنی اذیت کا باعث بن جاتا ہے۔خود اعتمادی دراصل احساسِ برتری اور احساسِ کمتری کے درمیان کا راستہ ہے۔

قول:حکیم محمد سعید

ریما نور رضوان۔کراچی

خودی کو کر بلند اتنا

ہمارے معاشرے میں کسی دوسرے پر انگلی اٹھانے کی روایت بہت پروان چڑھ گئی ہے۔یہ امر کافی حد تک نقصان کا سبب بنا ہے۔گھریلو، سیاسی، سماجی یا پھر معاشی معاملات ہوں۔ہمیں دوسروں پر انگلی اٹھانے سے گریز کرنا چاہیے۔ ہمیشہ اپنا احتساب پہلے خود کرنا چاہیے اور اپنے اعمال میں درستگی کو اولین ترجیح دینی چاہیے۔

"عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے"

وہی شخصیات اور قومیں ترقی سے ہمکنار ہوتی ہیں جو اپنی مدد آپ کرتی ہیں اور سب سے پہلے اپنے آپ کی درستگی کا عمل پروان چڑھاتی ہیں۔ کبھی بھی کسی کو اپنے غلط فیصلے کا ذمہ دار نہ قرار دو۔ کیونکہ آپ اپنے خود سب سے بڑے خیر خواہ ہو اور اپنی درستگی کا عمل بھی آپ خود ہی بہتر جانتے ہو کہ میرے اندرونی اور بیرونی کسی عمل میں بہتری ہونا ضروری ہے۔

"خودی میں ڈوب جانا غافل یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقہ شام وسحر سے جاوداں ہو جا"

جب انسان اپنی تربیت و پرورش پر خود بھی غور وفکر کرتا ہے اور اپنے اندر برائیوں کا خاتمہ کرنے کی خود ابتدا کرتا ہے تو وہ اس وقت درحقیقت اپنی اصلاح کر رہا ہوتا ہے۔خودی میں ڈوب کر کوئی بھی اپنے آپ کو اتنا بہتر نہیں جان سکتا۔ جتنا آپ خود اپنے آپ کو پہچانتے ہیں۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فردِ ملت کے مقدر کا ستارہ ہے

ہمیں ہر جگہ ہر شعبہ زندگی سے وابستگی ہو، ہمارے ہمیں اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیے اور روشنی کے سفر پر کامیاب وکامران زندگی کے لیے سعی کرنی چاہیے۔

''توکل کے یہ معنی نہیں کہ خنجر تیز رکھ اپنا
پھرانجام اس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر''

زندگی مسلسل کوششوں کا نام ہے اور کامران زندگی اور روشن مستقبل کی بنیاد افراد کی جدوجہد پر مبنی ہے۔ پاکستان کی موجودہ صورت حال سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے اور ہر فرد ملت کو اپنی کاوشوں کو جاری رکھنا چاہیے اور زور پکڑنے والی برائیوں کا منہ توڑ جواب دینا چاہیے۔

ایم ۔ جے قریشی ۔ ڈی آئی خان

فلسفہ

☆ ہر لفظ میں مطلب ہوتا ہے اور
ہر مطلب میں فرق ہوتا ہے۔
☆ زندگی میں دو چیزیں ٹوٹنے کے لیے ہوتی ہیں۔
سانس اور ساتھ۔
☆ انسان ایک بار مرتا ہے سانس ٹوٹنے سے اور
ساتھ ٹوٹنے سے بار بار مرتا ہے۔
☆ وقت اور پیار دونوں زندگی میں اہم ہوتے ہیں۔
وقت کسی کا نہیں ہوتا اور پیار ہر کسی سے نہیں ہوتا۔
☆ نیند اور موت۔
نیند آدھی موت ہے اور موت مکمل نیند۔

سنبل محسن ۔ کھاریاں

دوست

یہ دوست بھی عجیب ہوتے ہیں۔ دینے پر آئیں تو جان بھی دے دیں، لینے پر آئیں تو ہنسی تک بھی چھین لیں۔ کہنے پر آئیں تو دل کے تمام خانوں کے راز تک کہہ دیں۔ چھپانے پر آئیں تو یہ تک نہ بتائیں کہ خفا کیوں ہیں؟ ناراض ہونے پر آئیں تو سانس تک نہ لینے دیں۔ منانے پر آئیں تو اپنی سانسوں تک کو وار دیں۔ بس دوست زندگی میں نہیں ملا کرتے۔ بلکہ زندگی دوستوں میں ملا کرتی ہے۔ اللہ میرے سب دوستوں کو سلامت اور خوش رکھے، آمین۔

صائمہ احمد ۔ حیدر آباد

بچے

ظالموں کیا کبھی یہ سوچا ہے
بچے گھر بھر کی جان ہوتے ہیں
بوڑھے ہو جاتے ہیں ان کے ماں باپ
تب یہ بچے جوان ہوتے ہیں

راؤ تہذیب حسین تہذیب ۔ رحیم یار خان

انمول موتی

☆ ہر خواہش کے نصیب میں تکمیل کہاں کچھ آرزوئیں اختیار سے باہر ہوتی ہیں نہ کوئی انت ہوتا ہے نہ حد کہ انسان گھوم پھر کر تھک ہار کر بیٹھ تو سکتا ہے لیکن تمناؤں کے سرے ہاتھ نہیں آتے۔

☆ محبتیں مارتی نہیں انسان کو زندہ رہنے پر اکساتی ہیں۔ زندگی بخشتی ہیں ان کے کھو جانے کا ڈر تو روگ بن کر جان کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔

☆ کچھ لوگ کتنے اچھے ہوتے ہیں انہیں خبر ہوتی ہے کہ ان کی جھولی میں کوئی صرف کانٹے

ڈال کر جا رہا ہے پھر بھی کچھ نہیں کہتے یا شاید جنہیں چاہا جائے ان سے شکوہ کیا ہی نہیں جاتا۔

طارق چوہدری۔ لاہور

موسم

موسم جانے کیوں دل کی بستی سے بہت جڑے ہوتے ہیں۔ گہرے موسم ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان جس لے پر دل دھڑکتا ہے۔ موسم بھی ویسے ہی پلٹا کھاتے ہیں۔ کبھی بہار اور کبھی پت جھڑ......اور کبھی!!

عروج موسم، زوال موسم\
عجب ہیں زندگی میں بے شمار موسم\
ہر سو جو پھیلی ہو رشتوں کی مہک\
کیا خوب ہوتے ہیں وہ بہار موسم\
طویل مسافتوں کے بعد جو آتی ہے منزل\
کرتے ہیں جی بھر کر سرشار موسم\
گھروں سے پنچھی جب اڑ جاتے ہیں\
تو لوٹ آنے کا کرتے ہیں انتظار موسم\
یادوں کی نگری میں جھانکا تو کر گئیں آنکھیں نم\
سحر کرتے ہیں اکثر یونہی بے اختیار موسم

سحر مبین۔ فیصل آباد

خوشبو

عام اور خاص دوست میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ عام دوست آپ کی صرف تعریف کرتا ہے لیکن خاص دوست آپ کی تعریف کے ساتھ ساتھ آپ پر تنقید بھی کرتا ہے۔

ماہا بلوچ۔ کراچی

کارنامہ

ایک دوست نے دوسرے سے کہا: ''کل میرا بھائی دریا میں چھلانگ لگا کر پورے ایک گھنٹے بعد باہر نکلا تھا۔''

دوسرا دوست بولا: ''بھئی یہ کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ میرے والد صاحب نے دس برس پہلے دریا میں چھلانگ لگائی تھی اور آج تک باہر نہیں نکلے۔''

شیو

ایک آدمی (دوسرے سے): ''تم دن میں کتنی بار شیو کرتے ہو؟''

دوسرا آدمی: ''چالیس پچاس مرتبہ۔''

پہلا آدمی: ''حیرت سے کیا تم پاگل ہو؟''

دوسرا آدمی: ''جی نہیں میں حجام ہوں۔''

سونا

ٹیچر نے شاگرد سے سوال کیا: ''بتاؤ سونا سب سے زیادہ کن ملکوں میں پایا جاتا ہے۔''

شاگرد: ''جناب جہاں دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہوتی ہیں۔''

سیدہ زینب۔ پشاور

عاجزی

شوہر نے بیوی سے کہا۔ ''یہ کیا تم پھر ایک دوپٹہ لے آئیں ابھی پرسوں ہی تو......''

''کیا...... پرسوں...... بولو...... بولو'' بیوی چلا کر بولی۔

''کچھ نہیں میں تو کہہ رہا تھا کہ پرسوں تو تم ایک ہی دوپٹہ لائی تھیں آج دو خرید لیتیں۔'' شوہر نے عاجزی سے کہا۔

ایس انجم۔ کراچی

......☆......

ذرا پھر سے کہنا

یقین رکھنا

یقین رکھنا
کہ خزاں کے جھڑتے ہی
اس سرزمین پر
بہار اترے گی پھول بن کر
یقین رکھنا!
دکھوں کا موسم
سکھوں کی رت میں ڈھلے گا اک دن
غموں کی شب کا سیاہ آنچل ہٹے گا اک دن
یقین رکھنا
اداس چہروں پر آس و امید کھل اٹھے گی
دلوں میں جینے کی لو جلے گی
یقین رکھنا
ہر شر سے ناطہ تمام ہوگا
بشر کا اپنے رب سے رشتہ پھر عام ہوگا
یقین رکھنا
خدا کی رحمت سدا رہے گی
یقین رکھنا
وہ اک محبت جو تھک گئی تھی جواں رہے گی
یقین رکھنا...... یقین رکھنا!

سباس گل

غزل

روٹھ جاؤ تو منائیں تم کو
پیار کا گیت سنائیں تم کو
محفل شعر و سخن جاری ہے
اک غزل اور سنائیں تم کو
آؤ چلتے ہیں کسی کیفے میں
شام کی چائے پلائیں تم کو
گھر جو آؤ تمہیں عزت بخشیں
اپنی پلکوں پر بٹھائیں تم کو
دل دھڑکتا ہے ترے نام کے ساتھ
پاس آؤ تو سنائیں تم کو

فرزانہ شوکت

ہاں مجھے یاد ہے

ہاں مجھے یاد ہے
تم سے پہلی بار مل کے مسکرانا
جھکے جھکے تمہارا نظر ملانا
آنکھیں چرا کے میرا شرمانا
تیرا پل پل مجھے ڈھونڈنا
نظر نہ آؤں تو سکون نہ پانا
بے ارادہ چاند کو تکنا
سرد شاموں میں اداس ٹہلنا
تیرا جھگڑنا تیرا ستانا
میرا روٹھنا تیرا منانا

برستے ساون میں مجھ سے بچھڑنا
تیرا بار بار مڑ کے دیکھنا
اور!
بارش میں دیر تک
اکیلے میرا بھیگنا
ہاں مجھے یاد ہے

شہلا گل سحر

انتظار

میرے کمرے میں موجود
ہر شے سسکتی ہے
آرزوئیں بلکتی ہیں
ہر اور
سناٹے رقص کرتے ہیں
صحرا کی سی ویرانی ہے
میری پتھرائی آنکھیں
ہر دم یہی کہتی ہیں
دشوار ہے
خاردار ہے
بہت مشکل
تیرا انتظار ہے

درخشاں ضیاء

زندگی کبھی تو تو بدلے گی

زندگی ویسی کیوں نہیں ہوتی
جیسا ہم تصور کرتے ہیں
حقیقت اتنی تلخ و کڑوی
کیوں ہوتی ہے
میں نے تو نجانے کیا کیا
سوچا تھا زندگی کے لیے
لیکن کچھ بھی نہ ملا زندگی میں
دل اداس، نگاہیں نمناک
کیسے بیان کروں دل کے یہ حالات
کاش کوئی سمجھ لے بن کہے
کہ کیا کہوں کس سے کہوں
کیوں میں نے خواب سنجوئے
کیوں خود کو دنیا کے رویوں کا
عادی نہ بنایا
کیوں اپنا دل نازک رکھا کہ
ذرہ سی ٹھیس سے ٹوٹ
ٹوٹ پھوٹ سا جاتا ہے
دل کا ٹوٹنا ہوتا ہے
اور میں بکھر سی جاتی ہوں
خود کو سمیٹ نہیں پاتی ہوں
اے زندگی معصوم و مہرباں
تو ہی بتا کم عمری کے خواب
کب پورے کر سکے گی
کب زندگی
جھومے گی مسکرائے گی
میں اس آس، امید
خواہش، انتظار میں
مسکرا مسکرا کر وقت گزار رہی ہوں
ہر اک سے اپنا حال دل چھپا رہی ہوں
زندگی کبھی تو تو بدلے گی
زندگی کبھی تو تو بدلے گی

ریما نور رضوان

غزل

محفلوں میں جب سے وہ جانِ بہار آنے لگا
پھر مرے بے تاب دل کو بھی قرار آنے لگا
راہزنوں جب دلایا راہنمائی کا یقین
قافلے والوں کو ان پر اعتبار آنے لگا

جس نے دیکھا بھی نہ تھا ترچھی نگاہوں سے کبھی
لے کے ہاتھوں میں وہی پھولوں کے ہار آنے لگا
ہو گئیں سچائیاں منسوب ان کے نام سے
ان کی جھوٹی بات پر بھی اعتبار آنے لگا
بعد مدت کے وہ محفل میں ہوا ہے جلوہ گر
دید کی ترسی ان آنکھوں میں خمار آنے لگا
اہلِ دل اپنے دلوں کو تھام کر رہنے لگے
کر کے محفل میں وہ جب سولہ سنگھار آنے لگا
پھر چمن میں کھِل اٹھے گلہائے رنگا رنگ قمر
دیکھ لو زردائے چہروں پر نکھار آنے لگا
ریاض حسین قمر

غزل

اب تک پیار کا صلہ ملا کوئی نہیں
اندھیری راہ میں دیپ جلا کوئی نہیں
کھائی ہے چوٹ تو یہ احساس ہوا مجھے
مجھ سا دنیا میں پھر تنہا کوئی نہیں
شریک سفر اب بدل گیا ہے نگاہیں
اپنے نغموں میں پھر دلکش صدا کوئی نہیں
پاس سے گزرا حال تک نہ پوچھا میرا
دور جا کے بھی مجھ سے وہ رویا کوئی نہیں
بچھڑ کے تجھ سے یہ حال ہوا ہے اپنا
بدن سے جیسے روح کا ناطہ کوئی نہیں
عشق میں ہم پہ کیا گزری ہے پھر جاوید
اپنی زندگی میں خوشیوں کا سایا کوئی نہیں
محمد اسلم جاوید

غزل

کون سمجھے گا دردِ نہاں دوستو
آدمی آدمی ہے کہاں دوستو
سن سکو گے نہ تم اپنی رودادِ غم
کر سکیں گے نہ ہم خود بیاں دوستو
شعلے اٹھتے رہے آشیاں سے مرے
مسکراتا رہا باغباں دوستو
کل بجھا دی غموں نے میری شمع دل
آج اٹھتا ہے دل سے دھواں دوستو
گلستان میں ٹھکانا تھا اس کا کبھی
آج امتیاز رہے جانے کہاں دوستو
ایس۔امتیاز احمد

ماں کے نام

زندگی کے اس سفر میں
یوں ہی کبھی
کسی مشکل رہ گزر میں
جو لڑکھڑا جاتی ہوں میں
لمحوں کے سحر میں
کسی ایک نقطے پر
جو جکڑ جاتی ہوں میں
اپنوں کے گہرے سمندر میں
سر پٹختے رشتوں سے
جو الجھ جاتی ہوں میں
اور
بھٹک جاتی ہوں میں
پھر چھپ جاتی ہوں میں
ہر اک نگاہ سے
اپنے خول میں بند ہو جاتی ہوں
اور کوئی سرا نہ پاتی ہوں
تو وہ مجھے
اپنی آغوش میں لے لیتی ہے
دل میرا ہلکا کر کے
غم سارے سہہ لیتی ہے
وہ کوئی نہیں میری ماں ہے
جو زیست کی کہانی کا مرکزی کردار ہے

دل میں اس کے محبت بے شمار ہے
اس کے دم سے خزاں بھی بہار ہے
اللہ کے بعد میری زندگی میں
پہلا اس کا شمار ہے
میری ماں میری زندگی
میرا سارا سنسار ہے

درخشاں ضیاء

چند سالوں کے بعد

جب زندگی کے تھال سے
میرے نام کا آخری سکہ بھی گر جائے
اور تمہیں خبر میرے مرنے کی مل جائے
تو بس اتنا کرنا
اپنی بے حد مصروف سی زندگی سے
فقط چند لمحے میرے نام کر دینا
میرا آخری دیدار کرنے میرے جنازے پر آنا
نہ آنسو گرانا نہ افسوس کرنا
نہ کوئی مجبوری بتانا نہ محبت کا اظہار کرنا
بس ان آخری پلوں میں ایک احسان کرنا
میری بند ہوئی آنکھوں پر اپنی انگلیوں کو پھیرنا
تمہاری انگلیوں کے ان گداز لمس کو
محسوس کروں گی
اور اپنے اندر جذب کر لوں گی
کہ جب میرے بے جان وجود کو لحد میں
اتاریں گے لوگ
تو تیری گداز انگلیوں کے لمس کو
محسوس کرتی میں
بے خوف منوں مٹی تلے دب جاؤں گی
اس ویران شہر کی اڑتی خاک میں گھل کر خود بھی
خاک کا ڈھیر بن جاؤں گی

رابعہ افضال خان

غزل

مہکتے گلابوں کی خوشبو جیسی
یہ محبت بڑی بے داغ لگتی ہے
کبھی اقرار کبھی انکار
کبھی حد سے زیادہ خاص لگتی ہے
کبھی نرم پھولوں کے سیج جیسی
کبھی صحرا میں تپتی دھوپ لگتی ہے
کبھی اظہار اپنی شدتوں کا
کبھی خود سے خود انکار لگتی ہے
پھر کبھی یوں بھی ہوتا ہے
یہ محبت بڑی بے کار لگتی ہے
کبھی جو اس میں دل ٹوٹے تو
یہ کانٹوں کا بستر لگتی ہے
لیکن محبت تو محبت ہے ماہی
یہ محبت جیسی لگتی ہے

ماریہ یاسر

غزل

کتنے دلکش تیرے انداز ہوئے جاتے ہیں
اور نیناں بھی دغا باز ہوئے جاتے ہیں
آپ جتنے بھی ستم مجھ پر کیا کرتے ہو
وہ میرے واسطے اعزاز ہوئے جاتے ہیں
اب تو لازم ہے کوئی اور مسیحا ڈھونڈوں
میرے حاسد تیرے ہمراز ہوئے جاتے ہیں
کسی مخلص کسی مفلسی کا نہیں نام یہاں
اور جو ظالم ہیں وہ ممتاز ہوئے جاتے ہیں
تم نے کب کس کو منایا انہیں معلوم نہیں
یہ تو خوش فہم ہیں ناراض ہوئے جاتے ہیں

سید بشارت شاہ

☆

سندیس

سپاس گل ــــ رحیم یار خان

محترم اور پیاری صالحہ آپی السلام علیکم! دعا ہے کہ آپ، آپ کے اہل خانہ، ردا کے تمام اسٹاف اراکین اور نورین ملک جی خیر و عافیت سے ہوں گی، آمین۔ ''ردا'' ماشاء اللہ نئے لکھنے والوں کے لیے عمدہ پلیٹ فارم ثابت ہو رہا ہے۔ تمام سلسلے بہترین ہیں۔ ''گوشہ آگہی'' آگہی کے در کھولتا ہوا بہت کچھ سکھاتا، امید دلاتا آپ کا بہترین طرزِ فکر و تحریر ہے جزاک اللہ۔ اپنا یہ علم، تجربہ اور پیار اسی طرح ہم سے شیئر کرتی رہیے۔ اللہ آپ کو صحت و عزت بھری طویل حیات نصیب کرے، آمین۔ ردا کے قارئین کا بھی بہت شکریہ جو ہماری تحریریں پسند کرتے ہیں اور صالحہ آپی! اتنے پیار سے ہمیں ردا میں جگہ دیتی ہیں جزاک اللہ آپی جانی، نورین جی کو بہت بہت سلام۔ آپ سب کی صحت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعاگو۔

فریدہ فرید ــــ پاک پتن شریف

پیاری آپی جان، ڈیئر نورین اور چنچل سکھیوں کو سلام خلوص۔ ردا بروقت ملنا کیا نصیب ہوا ہے عید سے قبل عید ہوگئی ہے انتہائی خوب صورت ٹائیٹل سے سجا اپریل کا ردا گرین ڈریس پہنی ماڈل بے حد خوب صورت تھی یہ اب تک کا بیسٹ ٹائیٹل قرار دیا جاسکتا ہے۔ ''گوشہ آگہی'' میں آپی نے ملکی حالات پر بہترین تجزیہ ہی نہیں کیا اخلاقیات کا سبق بھی ڈنڈے کے زور پر خوب رٹوایا، شکریہ آپی جان آپ تربیت گاہ ہیں ہمارے لیے۔ ''ردائے جنت'' ہمیشہ کی طرح مستند اور جامع تھا۔ شازیہ مصطفیٰ کا ایک اور شاہکار ردا کے صفحات پر اجاگر ہوا کسی بھی ناول کے اختتام پر اس کے بابت تعین کیا جاتا ہے مگر شازیہ جی کی تحریر ابتدا ہی سے صفِ اول میں ہوتی ہے۔ نائلہ جی ہماری ردا کا ہیرا ہیں جن کی تحریر کے ہر لفظ میں ہیرے پروئے ہوتے ہیں یہ مبالغہ نہیں میں حقیقتاً ان کی تحریر کی فین ہوں۔ عائشہ ذوالفقار کی تحریر کبھی تیز بارش تو کبھی ہلکی پھوار کا لطف دیتی نہایت دلچسپ موڑ پر ہے۔ پتا بھی نہیں چلتا اور اسٹوری ختم ہو جاتی ہے پلیز صفحات بڑھا دیں۔ عائشہ الیاس کے ''پاگل عشق'' نے تو حقیقتاً ہمیں پاگل بنا دیا انتہائی میچور، مربوط تحریر تھی۔ ہر لائن بہتر سے بہترین کا سفر کرتی ہوئی یہ تحریر منظر نگاری، حقیقت نگاری اور مکالمہ نگاری کا بہترین امتزاج تھا۔ عائشہ کو بے حد مبارک ایسی لاجواب تحریر تخلیق کرنے پر آسیہ مظہر کی تحریر ''جنونِ عشق'' اور شاندار شخصیت مزے کی اسٹوری تھی۔ ''حسرت ناتمام'' نظیر فاطمہ نے دل بوجھل کر دیا۔ یونہی عائشہ مری نے ''سب مایا ہے'' تحریر کر کے ہمارے دل پر ایک اور ستم ڈھا دیا۔ دونوں تحریریں موضوع کے لحاظ سے دل ڈبونے اور اندازِ تحریر کے اعتبار سے دل جیتنے والی تھیں۔ افسانوں کی سرزمین ردا میں ایک بار پھر افسانوں کی طویل لسٹ تھی اور ہم تھے خوب دھیان اور مزے سے مطالعہ کیا۔ اپریل کے ماہ کی مناسبت سے سیدہ

فرزانہ، ثناء کنول نے اچھی اسٹوریز لکھیں۔ ثناء ناز اور ماریہ عمران کی ''محبت کی گردان'' بھی دل کو دلنشین لگی۔ حنا اشرف کے ''فیصلہ'' اور شیریں تبسم کی ''صدائے من'' بھی انٹرسٹنگ تھی۔ ماریہ یاسر کو مہربان پایا یاسمین آفریدی پر بھی اعتبار کرلیا۔ بے وجہ سہی سحر مبین کو پڑھتے سحرش فاطمہ کے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک تھی عفاف سے حورینہ نے تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ عمارہ خان نے صحیح کہا کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ ''ردا کی ڈائری'' سے مہوش جواد کا انتخاب پسند آیا۔ نورین ملک کے اس ماہ میں سبھی انتخاب بہترین تھے مگر اس ماہ کے شگوفے نے بہت لطف دیا۔ ہمارے پسندیدہ سلسلے ''سندیسے'' میں عانیہ نیازی کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ تبصرہ ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔ رابعہ افضال خان ہمیشہ کی طرح ''خوشبو'' بکھیرتی محبتیں بانٹتی دل میں اتر گئیں۔ ریما نور نے بھی سندیسے کو وقت دیا۔ شکریہ کیتی جی کی آراء منفرد تھی۔ ماریہ یاسر، گل جی نے بھی خوب انٹری دی مگر مختصراً کیوں؟ توبیہ ملک، مہرین کنول نے بھی رونق بکھیری۔ صبا عبدالغنی کہاں غائب تھیں؟ سلام خلوص کے ساتھ اجازت۔

رابعہ افضال خان ـــــ کراچی

ڈھیر ساری محبت و نیک تمناؤں کے سنگ ردا سے جڑی تمام رائٹرز و قارئین اور ڈیئر صالحہ اپیا اور نورین ملک کو رابعہ افضال خان کا سلام محبت قبول ہو۔ اپریل کا شمارہ جوں ہی ہاتھوں میں آیا تو سرورق پر موجود ماڈل کیوٹ سی رانیہ اپنی دھیمی سی مسکان اور سوفٹ لک میک اپ کے ساتھ دل کو خوش کرگئیں۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے ''گوشہ آگہی'' پڑھا۔ پھر ''ردائے جنت'' سے مستفید ہوتے آگے بڑھے اور شازیہ جی اینڈ نائلہ طارق کے سلسلے وار ناولز دیکھ کر دل میں خوشی کے ڈھیروں پھول کھل گئے۔ افسانوں کی محفل بڑی بارونق تھی۔ ''اپریل فول'' فضول رسم سیدہ فرزانہ حبیب کا افسانہ زبردست تھا۔ ''محبت فاتح عالم'' ثناء ناز آپ کی تحریر بھی ہمیں بہت پسند آئی۔ ''فیصلہ'' حنا اشرف کی تحریر اچھی لگی۔ پرخلوص دوست واقعی میں خدا کی طرف سے عطا کیا بہترین تحفہ ہے۔ ثناء کنول آپ کی تحریر ''اپریل فول'' نے اس دن کی حقیقت کو اچھی طرح واضح کیا۔ ایسے ہی ماریہ یاسر کی تحریر ''مہربان'' اچھی تھی ''غریب'' مریم فاطمہ آپ کی تحریر حقیقت کے بہت قریب ''تھی بے وجہ ہی'' سحر مبین آپ نے تو کمال ہی کردیا۔ ''اعتبار یار'' یاسمین آفریدی نے بھی خوب لکھا۔ ''صدائے من'' شیریں تبسم آپ کی تحریر دل کو لگی۔ ''ایک تھی عفاف'' حورینہ سعد نے بھی بہت اچھا لکھا۔ ''دلنشین محبت'' ماریہ عمران محبت کا رشتہ سچ میں بہت دلنشین ہوتا ہے۔ دل کے ہاتھوں مجبور سحرش فاطمہ کا افسانہ بھی اچھا تھا۔ ''ایسا بھی ہوتا ہے'' عمارہ خان سچ ہے ایسا بھی ہوتا ہے۔ ناولٹ میں ''حسرت ناتمام'' نظیر فاطمہ آپ کی تحریر نے بے اختیار دل گداز کردیا۔ مکمل ناول میں ''جنون عشق'' آسیہ مظہر چوہدری آپ کی تحریر بھی بہت اچھی تھی۔ ''پاگل عشق'' عائشہ الیاس کے قلم نے بھی جادو بکھیرا۔ ''سب مایا ہے'' عائشہ مری آپ کی تحریر بھی بہت پسند آئی۔ اینڈ ویلکم ٹو ردا۔ سلسلے وار ناولز میں شازیہ جی اور نائلہ طارق کی پہلی قسط ہی زبردست لگی۔ عائشہ ذوالفقار آپ کے ناول کی تو کیا بات ہے جی ردا کی ڈائری سے مہوش جواد کا انتخاب اچھا لگا۔ اشعار سب ہی اچھے تھے۔ اس ماہ میں اس ماہ کی کرنیں پسند آئیں۔ خوشبو میں موجود ہر لفظ خوشبو کی طرح مہکتا ہوا تھا۔ ذرا پھر سے کہنا میں سب ہی کے کلام پسند آئے۔ سندیسے کی محفل میں سب ہی نے بہت خوب تبصرہ کیا۔ سوئیٹ فریدہ فرید آپ کو سندیسے کی محفل میں شامل دیکھ کر دل

خوش ہو گیا اور آپ کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ خدا آپ کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے، آمین۔ ڈیئر شہلا گل سحر آپ میری تحریر کو پسند کرتی ہیں پسندیدگی کے لیے جزاک اللہ سوئیٹ ثناء کنول اللہ دتہ یار کہاں غائب ہو۔ سوئیٹ صالحہ اپیا آپ سے مخاطب ہونے کے لیے ہمیشہ میرے پاس الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ قلم ہمیشہ رک جاتا ہے اور میں سوچتی رہ جاتی ہوں کہ آپ کے لیے کیسے لفظوں کا چناؤ کروں مگر ہمیشہ ہی اس معاملے میں نکمی ثابت ہوئی ہوں بس اتنا ہی کہوں گی کہ آپ میرے لیے بہت اہم ہیں آپ کی صحت وتندرستی کے لیے میں ہمیشہ اللہ کے حضور دعا گو رہتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر دراز عطا کرے اور ردا کو خوب خوب ترقی دے، آمین۔ کیوٹ سی نورین ملک آپ کے لیے بس اتنا ہی کہوں گی یو آر سو سوئیٹ اپریل کا شمارہ حقیقتاً بہت خوب صورت تھا اس کے ساتھ ہی اپنی دوست رابعہ افضال خان کو اجازت دیجیے۔

درخشاں ضیاء ——— کراچی

سب سے پہلے تو میری جانب سے ردا کے تمام اسٹاف اور قارئین کو محبتوں بھرا پرخلوص سلام قبول ہو۔ امید کرتی ہوں تمام لکھنے اور پڑھنے والے خیریت سے ہوں گے۔ اس دفعہ تو ردا نے کمال ہی کر دیا۔ 6 تاریخ کو ہی مل گیا۔ خوشی کی حد نہیں تھی۔ ماڈل بہت پیاری لگ رہی تھی۔ واہ بھئی شازیہ جی کے مکمل ناول کی پہلی قسط مزا آ گیا۔ ابھی شروعات ہے۔ آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح مکمل ناول ابھی میں نے پڑھے نہیں ہیں۔ پر رائٹرز کے نام سے اندازہ ہو رہا ہے کہ بلاشبہ بہترین ہوں گے۔ کیونکہ نام ہی کافی ہے۔ نظیر فاطمہ اور عائشہ مری دونوں کے ناولٹ اچھے رہے۔ کافی دن بعد فرزین سسٹر کی واپسی ہوئی ان کا نام دیکھ کر اچھا لگا۔ ثناء ناز، حنا اشرف، ماریہ یاسر، ثناء کنول، یاسمین آفریدی، مریم فاطمہ، سحر مبین، شیریں تبسم، حورینہ سعد، ماریہ عمران اور عمارہ خان سب نے بہت اچھا لکھا۔ ماریہ تم نے بہت اچھے مسئلے پر قلم اٹھایا۔ گھر میں کام کرنے والوں کو کچھ بھی دیتے وقت سوچنا چاہیے۔ میں نے بھی اکثر لوگوں کو یہ حرکت کرتے دیکھا ہے اور ڈیئر کچھ لوگ تو اپنے پڑوسیوں کو بھی باسی کھانا اچھی پریزینٹیشن کے ساتھ بھیج دیتے ہیں یا گھر میں آنے والے قاری کو کھلا دیتے ہیں۔ اللہ عقل دے ایسے لوگوں کو آمین۔ ہمیشہ اسی طرح اچھا لکھتی رہو۔ حنا بلاشبہ اچھے دوست اللہ کی طرف سے دی گئی بہت بڑی نعمت ہیں۔ سیدہ فرزین اور ثناء کنول آپ دونوں نے ہی اپریل فول پر بہت زبردست لکھا۔ ''دلنشین محبت'' بہت اچھا لکھا ماریہ عمران نے۔ ثناء ناز صحیح کہا آج کل کی نوجوان نسل آئیڈیلزم کے چکر میں بہت الجھ گئی ہے۔ اچھی تحریر تھی۔ آخر میں بات کرنا چاہوں گی اپریل کے افسانہ آف دی منتھ پر جو کہ میری طرف سے جاتا ہے۔ ون اینڈ اونلی سحرش فاطمہ کو واہ یار زبردست لکھ دیا تم نے اتنا زبردست کے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہارے لیے قلم اٹھانا ہی پڑا۔ افسانہ مکمل پختگی لیے ہوئے تھا کہیں جھول محسوس نہیں ہوا اور سبق بہت ہی عمدہ تھا۔ اسی طرح اچھا لکھتی رہو، آمین۔ ریما ڈیئر تمہارا لطیفہ تو بہت ہی مزہ دے گیا۔ اشعار بھی کے اچھے تھے۔ اشعار آف دی منتھ نوشین مدثر کا تھا۔ ذرا پھر سے کہنا ہمیشہ کی طرح حسین غزلوں اور نظموں سے سجا ہوا تھا۔ سب ہی کی نگارشات بہترین تھیں۔ غزل آف دی منتھ کا ٹائیٹل حکیم خان حکیم کو جاتا ہے جب کہ نظم آف دی منتھ کے حقدار ریاض حسین عمر رہے۔ ویل ڈن۔ کچن سے تو بہت مزے کی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ بریانی کی ترکیب لاجواب تھی۔ سندیسے پڑھ کر تو دل باغ باغ ہو گیا۔ ماشاء اللہ بہت ساری دوستوں نے میرے افسانے کو پسند

کیا۔ افشاں علی، فریدہ فرید، مہرین کنول، رابعہ افغال خان، ریما نور رضوان، گیتی آراء اور ماریہ یاسر آپ سب کی پسندیدگی اور محبتوں کا بہت شکریہ۔ تمام دوستوں اور بالخصوص صالحہ آپی اور نورین آپی کا ساتھ رہا تو انشاء اللہ اسی طرح لکھتی رہوں گی۔ سندیسے لکھنے میں تو ماشاء اللہ ہماری سب ہی سہیلیاں ماہر ہیں پڑھ کر مزہ آجاتا ہے۔ صالحہ آپی گوشہ آگہی میں آپ نے خوب لکھا۔ لاہور میں ہونے والی دہشت گردی کی وجہ سے پورے ملک میں خوف کی فضا قائم ہوگئی۔ بچے تو اس قدر ڈر گئے ہیں باہر گھومنے کا نام نہیں لے رہے۔ اللہ پاکستان پر اپنی رحمتیں نچھاور کرے اور اسے امن کا گہوارہ بنادے۔ آمین۔ آخر میں اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ اللہ پاک ردا کو خوب ترقی دے۔

ماریہ یاسر ——— کراچی

آداب عرض ہے۔ امید کرتی ہوں صالحہ آپی، نورین اور باقی اسٹاف خیر خیریت سے ہوگا۔ ردا 8 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر سجی بی ماڈل سے ایک گلہ بازو میں جھولتا دوپٹہ اگر شانے پر ڈال دیا جاتا تو زیادہ پیارا لگتا۔ میک اپ چوڑیاں سب بہت پیارا تھا۔ اب آتے ہیں اس ماہ کے ردا کی طرف۔ اپنی کہانی پا کے بے انتہا خوشی ہوئی۔ شکریہ صالحہ آپی اور پیاری نورین، پچھلے ماہ کا گیپ مجھے بہت طویل لگا۔ دل میں خواہش ابھرتی ہے کہ میرے ''مُنے سے افسانوں'' کو اگر ہر ماہ باقاعدگی سے ردا میں داخلے کی اجازت دے دی جائے تو مزہ آجائے۔ لیکن دل کا کیا کیا جائے دل تو بچہ ہے ناں جی۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ مکمل ناول میں آسیہ جی جب کہ ناولٹ میں نظیر فاطمہ کا شاندار رہا۔ باقی سب بھی اچھے تھے۔ اب بڑھتے ہیں دوستوں کے نام پیغام کی طرف تو یہاں ریما جی چھائی ہوئی ہیں بلکہ ہمیشہ ہی چھائی رہتی ہیں۔ بہت اچھا لکھتی ہیں ریما آپ۔ اس بار ذرا پھر سے کہنا بہت زبردست تھا۔ ایک سے بڑھ کے ایک۔ شہلا گل، محمد اسلم جاوید اور مہرین کنول کے کلام بہت شاندار رہے لیکن میری تو بات ہی الگ تھی (آہم)۔ یہ بات تو نداقا کہی۔ یہ تو آپ لوگ ہی بتائیں گے کہ میری شاعری کیسی ہے ایویں سی یا؟ باقی سارا رسالہ بھی بہترین تھا۔''

سعدیہ نواز ——— اسلام آباد

قابل احترام چیف ایڈیٹر! میں سعدیہ نواز اسلام آباد سے خط لکھ رہی ہوں۔ ردا ڈائجسٹ بہت اچھا فیملی ڈائجسٹ ہے اس کے تمام سلسلے بہت دلکش بہت حسین ہیں ہمارے شہر کی طرح۔ میں اپنے گھر کے کوریڈور میں بیٹھی یہ خط لکھ رہی ہوں۔ نظروں کے سامنے مرگلہ کی پہاڑیاں ہیں۔ جس طرح سے اپنے حسین شہر کی تعریف لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی اسی طرح ردا کی تعریف لفظوں کی محتاج نہیں۔ میں بیوٹیشن ہوں اور پرائیویٹ ادارے میں بیوٹیشنز کی کلاسز بھی دیتی ہوں۔ بہت بزی لائف ہے۔ تھوڑا ٹائم نکال کر فیس بک پر ردا ڈائجسٹ پڑھ لیتی ہوں۔ کیونکہ میری کیوٹ سی (ریما بھابی) اس میں افسانہ نگاری، شاعری کرتی ہیں۔ ڈائجسٹ ردا یہاں مشکل سے ملتا ہے۔ اسی وجہ سے انٹرنیٹ پر پڑھتی ہوں۔ ردا کے ناول بہت اچھے لگتے ہیں۔ آپ کے ادارے سے جڑی ہر رائٹر بہت اچھا لکھتی ہے۔ پھر خط لکھوں گی۔ کسی بھی ڈائجسٹ وغیرہ میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ خط لکھنے کا سوچتی رہتی ہوں۔ اپریل کے ردا کا ٹائیٹل بہت اچھا لگا۔ ویسے بھی آپ کے ڈائجسٹ کے تمام ٹائیٹل پیج اچھے ہوتے ہیں۔ اچھا جی اب اللہ حافظ۔

بسمہ احمد ——— ایبٹ آباد

اچھی صالحہ آپا اور تمام قارئین ولکھاریوں کو

میری طرف سے پیار بھرا السلام علیکم! امید ہے کہ سب اچھی صحت کے ساتھ زندگی کی رونقوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ آج پہلی بار سندیسے کا حصہ بن رہی ہوں۔ سب سے پہلے تو میں اپنے ناول ''ہے تعلق اور ہی'' کی حوصلہ افزائی کرنے پر آپ تمام کا شکریہ ادا کروں گی۔ صالحہ آپا اور آپ سب کی محبت رہی تو انشاء اللہ میں اور اچھا لکھنے کی کوشش کروں گی۔ فروری کے سندیسے میں کچھ بہنوں نے ردا میں اس کو میری پہلی شرکت کہا۔ پچھلے سال بھی میرا ایک افسانہ ردا میں شامل ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے میں دوبارہ لکھنے کی ہمت کر سکی۔ صالحہ آپا اپریل کا شمارہ بہت بہترین تھا۔ ہر افسانہ قابلِ تعریف تھا۔ (سب کا نام لینے سے سندیسہ لمبا ہو جائے گا)۔ مکمل ناول بھی بہت اچھے تھے۔ عائشہ الیاس کے ناول نے بہت جذباتی کر دیا تھا مگر اس کا اینڈ اچھا تھا۔ سب کا ہیپی اینڈ پڑھ کر مزہ آیا۔ اس سے پہلے نائلہ طارق اور قمروش کے سلسلے وار ناول بھی خوب صورتی سے اختتام پذیر ہوئے اور شازیہ اور نائیلہ طارق کے نیو سلسلے وار ناولز بھی ہماری توجہ مبذول کروانے میں کامیاب رہے۔ مجھے زیادہ اچھا لکھنا تو ابھی نہیں آیا مگر جتنا لکھ سکتی ہوں کوشش یہی ہے کہ تفریح کے ساتھ ساتھ معاشرے کے کچھ رویوں کی نشاندہی کر سکوں۔ اس بار بھی ایک نیا افسانہ بھیج رہی ہوں۔ امید ہے صالحہ آپا اور تمام قارئین کو پسند آئے اور اس میں موجود پیغام بھی اپنا اثر دکھائے۔''

ریما نور رضوان ــــــ کراچی

دل کی تمام تر گہرائیوں اور سچائیوں کے ساتھ منفرد ہوتے ہوئے منفرد لفظوں کے ساتھ ردا فیملی کو ریما نور رضوان کا پیار خلوص بھرا السلام علیکم۔ ردا سے جڑا ہر شخص خواہ اس کا تعلق ردا سے کسی بھی طرح کا ہو معتبر ہے۔ ہر کوئی قابلِ عزت و قابلِ احترام ہے۔ ردا فیملی سے ہر ماہ ملاقات ہوتی ہے، کرم ہے رب کا۔ ردا کی لکھاری، ردا کی قاری، ردا کی مدیر اعلیٰ، ردا کے اراکین ہم سب ایک دوجے کے دوست بھی تو ہیں۔ ہمارا رشتہ قلمی ہے، ردا کے ذریعے یہی ہمارے درمیان اَن دیکھا رشتہ ہے اور یہ رشتہ انمول اٹوٹ ہے۔ ردا کے تھرو ہم ایک دوسرے کو یاد رکھتے ہیں، ایک دوسرے کا حال احوال دریافت کرتے ہیں۔ میرا ردا سے 10 سالہ پرانا رشتہ ہے۔ ردا کی تمام سکھیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہی ہوں، دیکھتی ہوں کون کون تھامتا ہے۔ یہ خلوص و چاہت بھرا ہاتھ۔ تمام ہی رائٹرز ردا کی بہت خوب صورت لکھتی ہیں اور مجھے ہر ماہ سندیسے کی محفل میں سب کی شمولیت بہت پسند ہے۔ فریدہ فرید، افشاں علی، گیتی آراء آپی سب لوگ اس محفل میں شرکت کر کے چار چاند لگا دیتی ہیں۔ سب کو پیشگی رمضان کی مبارک باد۔

نور بانو ــــــ کوئٹہ

پیاری آپی اور ردا اسٹاف و قارئین سب سے پہلے آپ سب کو سلام محبت و الفت اور سندیسے کی خوب صورت محفل کی رونقیں مبارک ہوں۔ سچ اب تو سندیسے کی محفل اتنی دلچسپ ہو گئی ہے کہ یوں لگتا ہے کہ ہم سب آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔ اب بات ہو جائے ردا کی تو اس ماہ مکمل ناول میں عائشہ الیاس نے کمال کر دیا۔ خوب صورت جذبات اور منظر نگاری، واہ۔ ناولٹ دونوں کمال کے تھے اور افسانوں میں سب رائٹرز نے بہت اچھا لکھا اور اتنے رائٹرز کو ایک جگہ یکجا کرنا ہماری صالحہ آپی کا کمال ہے کہ وہ ہر ماہ اتنی پیاری رائٹرز کی تحاریر ہمارے لیے شامل اشاعت کرتی ہیں۔ ردا کی کامیابی و ترقی کے لیے دعا گو آپ سب کے لیے بہت سی دعائیں پیار اور اب اجازت۔

......☆......

دوستوں کے نام پیغام

تمام دوستوں کے نام

ڈیئر آل آف ردا ممبرز، سبھی کو تہہ دل سے سلام۔ سبھی محترم ہستیاں ہیں۔ کس کا نام لکھوں کس کا چھوڑوں۔ سبھی کو اجتماعی طور پر مخاطب کرتی ہوں۔ زندگی بہت مختصر ہے سمجھ آتے ہی گزر جاتی ہے۔ دل میں کوئی بات نہ رکھیں۔ نہ جھگڑے طویل ہونے دیں۔ دل صاف رکھیں گے، ذہن کشادہ رکھیں گے، پھر انشاء اللہ دیکھیے گا میرا رب کریم مجھے، ہم سب کو زندگی کے ہر چھوٹے، بڑے، خوشگوار، پُرخطر، ہر جگہ، ہر موڑ پر ہمیں اچھی صحت، خوشیاں، کامیابی، کامرانی سے ہمکنار کرے گا۔ انشاء اللہ مجھ ناچیز کو دعاؤں میں یاد رکھنا۔

ریما نور رضوان۔ کراچی

ریما نور رضوان کے نام

تمام ردا ڈائجسٹ پڑھنے والوں کو افشاں شہزاد آصف کا بہت بہت سلام۔ میرا پیغام اپنی چھوٹی پیاری بہن ریما نور رضوان کے نام۔ ریما ماشاء اللہ تم نے بہت محنت سے بغیر کسی کی سپورٹ کے بہت نام بنایا۔ اپنی الگ پہچان بنائی پوری فیملی میں تم بالکل ڈفرنٹ ہو۔ تمہیں کریز ہے لکھنے پڑھنے کا۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے جوائنٹ فیملی اور فضا سب کچھ Manage کرتی ہو۔ مجھے خوشی ہے فخر ہے اپنی بہن پر۔ حماد، فلک، علی تمہیں بہت مس کرتے ہیں۔ حماد بہت شوق سے اپنی آنی کی کہانیاں اور شاعری پڑھتا ہے۔ خوش ہوتا ہے۔ دوستوں کو بھی بتاتا ہے۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔

افشاں شہزاد۔ لاہور

پیاری امی جان کے نام

پیاری امی آپ میری زندگی کا سب سے قیمتی تحفہ ہیں۔ اس پر میں اپنے رب کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ میں آج جس مقام پر ہوں یہ سب آپ کی بدولت ہے۔ آپ کی بہترین تربیت کی وجہ سے ہی ہم چاروں بہن بھائی خاندان بھر میں جانے جاتے ہیں۔ ہم لوگوں نے آپ جیسی نرم خو طبیعت نہیں پائی، پر ہمیں فخر ہے کہ ہم آپ کی اولاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرتی ہوں کہ وہ آپ کا اور ابو کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رکھے۔ آپ دونوں کو صحت و تندرستی والی لمبی زندگی عطا کرے اور ہم بہن بھائیوں کو آپ دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک بننے کی توفیق دے، آمین۔ امی آپ کو میری جانب سے ماؤں کا عالمی دن بہت مبارک ہو۔

درخشاں ضیاء۔ کراچی

صبا عبدالغنی کے نام

پیاری سی صبا آپ کی سالگرہ کے اہم موقع پر آپ کے لیے ایک پیاری سی دعا اور آپ کو سالگرہ کی ڈھیر ساری مبارک باد اور ہاں میری ٹریٹ تیار رکھیے گا۔

آج کے دن اس اہم موقع پر
میرے لبوں سے بس
ایک ہی دعا نکلی کہ
تمہیں گھیرے رکھیں
تمہارے چارسو رہے پھیلا
مسکراہٹوں کا آنچل
تمہاری آنکھوں کے دیے سدا جگمگائیں
گلاب لمحوں کی خوشبو تمہیں ہر پل مہکائے
تمہارے دامن میں مسرتوں کے پھول کھلیں
محبت کی روشنی سے تمہارا وجود جگمگائے
اللہ پاک تمہیں ڈھیروں خوشیاں عطا کرے
اللہ پاک تمہاری عمر دراز کرے
(آمین)

Many Many happy return of the day my sweet friend saba.

رابعہ افضال خان۔ کراچی

میری جانِ زندگی کے نام

اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کر دو
میں صدیوں سے ادھوری ہوں مجھے مکمل کر دو
نہ تمہیں ہوش رہے اور نہ مجھے
اس قدر ٹوٹ کے چاہو کہ مجھے پاگل کر دو
میری جانِ زندگی آویز آپ جہاں بھی ہوں گے امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میری دل و جان سے دعا ہے کہ میری محبت جہاں بھی رہے ہمیشہ خوش اور سلامت رہے۔ میری زندگی کے حصے کی خوشیاں بھی رب پاک آپ کی جھولی میں ڈال دے، (آمین)۔ میں نے آپ کے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ پلیز مجھے معاف کردیں جب آپ کو سچائی کی حقیقت پتا چلے گی تو امید ہے معاف کردیں گے۔ آپ زندگی میں آگے بڑھ گئے ہوں گے یقیناً مجھے بھول گئے ہوں گے، پلیز مجھے یہ پیغام پڑھ کر سچے دل سے معاف کردیں۔ میری پہلی محبت آپ ہیں صرف آپ۔ آپ واقعی ٹھیک کہتے تھے میں بے وفا ہوں۔ رب پاک آپ کو زندگی کی بہترین جیون ساتھی کا ساتھ نصیب کریں گے۔

سمیرا گل ناز۔ کراچی

پرنس محسن علی کے نام

اُن کی قسمت ہے محبت میں سنور جاتے ہیں
عاشقو میری بات سنو عشق میں سر جاتے ہیں
اتنے افراد تو ہوتے ہی نہیں ہیں پیدا
جتنے معصوم میرے شہر میں مر جاتے ہیں
کتنا انداز نرالا ہے غزل خانی کا
لوگ سنتے ہیں سناتے ہیں تو گھر جاتے ہیں
بھول جاتا ہوں ہر اک دورِ طرب دورِ نشاط
مجھ میں جب دہر کے سب درد اتر جاتے ہیں
سچ ہے راہی کہ فقیروں کا لبادہ اوڑھ بیٹھے
ہم بھی محبوب کے کوچے سے گزر جاتے ہیں

کلام: امان راہی

پسند: مہوش جواد۔ چوک اعظم لیہ

......☆......

کچن

قیمہ مسور پلاؤ

اجزاء

قیمہ	: آدھا کلو
ثابت مسور	: ایک پیالی
چاول	: تین پیالی
نمک	: حسب ذائقہ
ادرک لہسن پسا ہوا	: ایک کھانے کا چمچ
آلو ٹکڑے کیے ہوئے	: تین سے چار عدد
پیاز باریک کٹی ہوئی	: ایک کھانے کا چمچ
ہلدی	: ایک چائے کا چمچ
سفید زیرہ	: ایک چائے کا چمچ
ثابت گرم مصالحہ	: ایک کھانے کا چمچ
ٹماٹر باریک کٹے ہوئے	: تین عدد
آئل	: آدھی پیالی

ترکیب: پین میں آئل کو درمیانی آنچ پر دو سے تین منٹ گرم کریں اور آلوؤں کو ڈال کر ڈھک دیں۔ ہلکی آنچ پر دس سے بارہ منٹ فرائی کر کے نکال لیں۔ اسی آئل میں پیاز کو سنہرا فرائی کرلیں، آدھی پیالی نکال کر علیحدہ رکھ لیں اور بقیہ پیاز میں ادرک لہسن ڈال کر ایک سے دو منٹ فرائی کریں۔ قیمہ ڈال کر ملائیں اور ڈھک کر درمیانی آنچ پر پکنے رکھ دیں۔ مسور کو دھو کر ایک پیالی پانی میں پندرہ سے بیس منٹ بھگو کر رکھ دیں، پھر ڈھک کر درمیانی آنچ پر دس سے بارہ منٹ کے لئے اُبال لیں۔ قیمے کا پانی خشک ہو جائے تو اس میں نمک، لال مرچ اور ہلدی ڈال کر بھونیں۔ مسور اور آلو ڈال کر ملائیں پھر ٹماٹر ڈال کر ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ علیحدہ پین میں ایک سے دو کھانے کے چمچ آئل ڈال کر اس میں گرم مصالحہ اور زیرہ ڈال کر کڑکڑا لیں پھر چاول (بیس منٹ پہلے بھگو کر رکھیں) اور نمک ڈال کر ہلکا سا بھونیں۔ چار سے پانچ پیالی پانی ڈال کر درمیانی آنچ پر پکنے رکھ دیں۔ پانی خشک ہونے پر آدھے چاول نکال لیں۔ درمیان میں تیار شدہ قیمہ ڈال کر اوپر سے چاول ڈال دیں اور تلی ہوئی پیاز ڈال کر ہلکی آنچ پر دس سے بارہ منٹ کے لئے دم پر رکھ دیں۔

ملائی گوبھی

اجزاء

پھول گوبھی	: آدھا کلو
نمک	: حسب ذائقہ
ادرک	: ایک انچ کا ٹکڑا
لہسن	: دو سے تین جوئے
ہری مرچیں	: دو سے تین عدد
پیاز	: دو عدد درمیانی
ٹماٹر	: تین عدد درمیانے
پسی ہوئی لال مرچ	: ایک چائے کا چمچ
ہلدی پسی ہوئی	: آدھا چائے کا چمچ

پسا ہوا گرم مصالحہ	: ایک چائے کا چمچ
خشک دودھ کا پاؤڈر	: ایک پیالی
ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا	: حسب پسند
آئل	: تین سے چار کھانے کے چمچ

ترکیب : ادرک لہسن اور ہری مرچوں کو ملا کر پیس لیں، پیاز اور ٹماٹر کو علیحدہ علیحدہ پیس کر پیسٹ بنالیں۔ دیگچی میں آئل کو درمیانی آنچ پر دو سے تین منٹ گرم کریں اور اس میں ادرک لہسن کے پیسٹ کو خوشبو آنے تک فرائی کریں۔ اس میں پیاز ڈال کر سنہرا فرائی کریں، پھر ٹماٹر ڈال کر بھونیں۔ ساتھ ہی لال مرچ، نمک اور ہلدی بھی شامل کر دیں۔ ٹماٹر کا پانی خشک ہونے پر پھول گوبھی ڈال کر تیل علیحدہ ہونے تک بھونیں۔ خشک دودھ میں ایک پیالی پانی ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور گوبھی کو اچھی طرح گلنے تک پکائیں۔

کھنڈویاں

اجزاء

بیسن	: ایک پیالی
دہی	: دو پیالی
پسا ہوا لہسن	: ایک چائے کا چمچ
نمک	: حسب ذائقہ
پیاز پسی ہوئی	: ایک عدد درمیانی
پسی ہوئی لال مرچ	: ڈیڑھ چائے کا چمچ
ہلدی	: ایک چائے کا چمچ
پسا ہوا گرم مصالحہ	: ایک چائے کا چمچ
اجوائن	: آدھا چائے کا چمچ
بیکنگ سوڈا	: آدھا چائے کا چمچ
ثابت رائی	: آدھا چائے کا چمچ
سفید زیرہ	: ایک چائے کا چمچ
کڑی پتہ	: چند پتے
آئل	: آدھی پیالی

ترکیب : بیسن میں آدھی مقدار میں لہسن، لال مرچ، ہلدی اور گرم مصالحہ ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔ پھر اس میں نمک، اجوائن، بیکنگ سوڈا، دہی اور دو کھانے کے چمچ آئل ڈال دیں۔ اس مکسچر کو اچھی طرح پھینٹیں اور ایک سے دو گھنٹے کے لئے ڈھک کر گرم جگہ پر رکھ دیں۔ اس مکسچر کو کڑاہی یا فرائنگ پین میں ڈال کر ہلکی آنچ پر اتنی دیر پکائیں کہ دہی کا پانی خشک ہو جائے۔ درمیان میں ایک سے دو مرتبہ چمچ چلالیں۔ چکنی کی ہوئی ٹرے میں پھیلا کر ڈالیں اور ٹھنڈا ہونے پر چوکور ٹکڑے کاٹ لیں۔

گریوی بنانے کے لئے : پین میں آئل کو درمیانی آنچ پر دو سے تین منٹ گرم کریں اور اس میں زیرہ، کڑی پتہ اور رائی ڈال کر کڑکڑائیں۔ پھر پسی ہوئی پیاز ڈال کر سنہری فرائی کرلیں، اس میں نمک، لال مرچ اور ہلدی ڈال کر پانی کا چھینٹا دیتے ہوئے بھونیں۔ ایک پیالی پانی ڈال کر ابال آنے دیں، پھر آنچ ہلکی کر کے احتیاط سے کھنڈویاں ڈال دیں، گرم مصالحہ چھڑک کر ہلکی آنچ پر چار سے پانچ منٹ دم پر رکھ دیں

سبزی اور لہسن والی مرغی

اجزاء

مرغی کی بوٹیاں (بغیر ہڈی)	: تین سو گرام
شملہ مرچ	: ایک عدد
گاجر	: ایک عدد
ہری پیاز	: دو عدد
پانی	: ایک پیالی
بند گوبھی	: پون عدد
ہری مرچیں	: چار عدد
ہرا دھنیا	: پون گڈی
لہسن	: بارہ جوے

کٹی ہوئی کالی مرچ : ایک کھانے کا چمچہ
وارچسٹر شائر ساس : دو کھانے کے چمچے
کارن فلور (پانی میں گھلا ہوا) : دو کھانے کے چمچے
چلی گارلک ساس : چار کھانے کے چمچے
نمک : حسب ذائقہ
تیل : چار کھانے کے چمچے

ترکیب: مرغی، شملہ مرچ، گاجر، ہری پیاز، گوبھی، ہری مرچوں، ہرے دھنیے اور لہسن کو چھوٹا، چھوٹا کاٹ لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کر کے لہسن سنہری کریں۔ اس میں مرغی ملا کر پانچ منٹ تک پکا کر تمام سبزیاں شامل کر دیں۔ مزید پانچ منٹ پکانے کے بعد کالی مرچ، وارچسٹر شائر ساس، چلی گارلک ساس، پانی اور نمک ملا لیں۔ پانی ابلنے لگے تو چمچہ چلاتے ہوئے کارن فلور ملائیں اور آنچ تیز کر کے اسے پانچ منٹ تک بھونیں اور ڈش میں نکال لیں۔

چکن لیمن ساس

اجزاء

مرغی سٹیکی : دو عدد پیس
کٹی ہوئی کالی مرچ : ایک چائے کا چمچہ
سویا ساس : ایک چائے کا چمچہ
میدہ : دو کھانے کے چمچے
نمک : حسب ذائقہ

آمیزے کے اجزا:

میدہ (چھنا ہوا)، کارن فلور : دو دو پیالی
انڈے : دو عدد
بیکنگ پاؤڈر : چار چائے کے چمچے
کٹی ہوئی کالی مرچ : ایک چائے کا چمچہ
ٹھنڈا پانی : تین پیالی
نمک : حسب ذائقہ
تیل : تلنے کے لیے

ساس کے اجزا:

لیموں کا رس : چار کھانے کے چمچے
لیموں (باریک کٹے ہوئے) : آٹھ سلائس
چینی، شہد : دو دو چائے کے چمچے
پانی : ڈیڑھ پیالی

ترکیب: مرغی کے سینوں کو کسی بھاری چیز کی مدد سے کچل کر پتلا کر لیں۔ اس پر مرغی کے اجزا ملا کر تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ ایک پیالے میں آمیزے کے اجزا ملا لیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کریں، مرغی کے سینے آمیزے میں لپیٹیں اور سنہری تل کر ڈش میں نکالیں اور ٹکڑے کاٹ لیں۔ ساس بنانے کے لیے ساس پین میں پانی گرم کریں۔ اس میں لیموں کے قتلے، لیموں کا رس، شہد اور چینی ڈال کر گاڑھا ہونے تک پکائیں، پھر نمک ملائیں اور مرغی پر ڈال کر پیش کریں۔

مکس فروٹ ڈیلائیٹ

اجزاء:

سیب : ایک عدد (چھیل کر کاٹ لیں)
کیلا : دو عدد (سلائز کاٹ لیں)
کریم : پون کپ (پھینٹ لیں)
جام شیریں : تین کھانے کے چمچ
پائن ایپل : تین چار رنگز

ترکیب: سرونگ ڈش میں ایک طرف کیلے اور دوسری طرف سیب رکھ کر درمیان میں پائن ایپل رکھیں۔ ان کے اوپر کریم ڈال کر ریفریجریٹر میں رکھ دیں۔ اب جام شیریں سے سجا کر ٹھنڈا ٹھنڈا سرو کریں۔

......☆......

شہلا مشائق

سنگھار

چہرے کی جھریاں اور علاج

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ چہرے پر جھریاں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں لیکن بعض اوقات تفکرات اور متوازن خوراک نہ ملنے سے بھی چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں اور عمر زیادہ لگتی ہے۔ اس کے علاوہ جلد کی خشکی کی وجہ سے بھی جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ جھریوں کے تدارک کے لئے چہرے کو صاف رکھیں چہرے پر اسکن لوشن لگائیں یا اچھی قسم کی کریم استعمال کریں۔ جلد کا کسی اچھی کریم سے مساج کریں۔ گہری اور پوری نیند سوئیں۔ اچھی خوراک جس میں پروٹین ہو جلد کو فائدہ پہنچاتی ہے وہ استعمال کریں۔

چہرے پر چھائیاں اور علاج

چھائیاں پہلے یہ ہلکے دانوں کی صورت میں چہرے پر نظر آتی ہیں پھر یہ دانے چھائیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جب چہرے پر چھائیاں پڑ جائیں تو چہرے کو دھوپ سے بچائیں اور چہرے پر بلیچ کریم لگائیں۔ سخت دھوپ گرمی اور پسینے سے چہرے کے مسام کھل جاتے ہیں اور ان میں میل بھر جاتا ہے جو رفتہ رفتہ کالا اور سخت مواد بن جاتا ہے جس سے چہرے پر کیل یا مہاسے نکل آتے ہیں چہرے کو کسی اچھے صابن سے دھوئیں۔ کلینزنگ کریم کی مدد سے چہرے کا اچھی طرح مساج کریں پھر ٹشو پیپر سے چہرے کو اچھی طرح صاف کریں تولیے کو گرم پانی سے بھگو کر چہرے پر بھاپ دیں تاکہ سب مسام کھل جائیں، اس کے بعد چہرے کو احتیاط سے روئی کی مدد سے صاف کریں تاکہ مساموں سے کالا مواد نکل جائے۔

جلد کے پھٹنے کا علاج

چہرے کی جلد اگر روکھی اور خشک ہو تو چہرے پر صابن کی بجائے بیسن یا بالائی میں چند قطرے عرق لیموں اور ایک چٹکی ہلدی ملا کر استعمال کریں، روکھے پن کے ساتھ اگر ہاتھ پیروں کی جلد پھٹے یا اترنے کی شکایت ہو تو ایسی صورت حال سے بچنے کے لئے اپنی غذا میں وٹامن اے کی مقدار بڑھا لیں۔ وٹامن اے آپ کو سبز پتوں والی سبزیوں مثلاً چقندر، ٹماٹر، سویابین اور انڈوں کے استعمال سے بھرپور طریقے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

جسم کے دوسرے حصوں پر جھریاں

چہرے اور جسم کے دوسرے کھلے رہنے والے حصوں کو جلد پر پڑ جانے والی جھریوں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کریں اور وقفے وقفے سے ان پر توجہ دیتی رہیں تو یہ جھریاں ختم ہو جائیں گی۔ ان جھریوں سے محفوظ رہنے کے لئے انڈے کی زردی پھینٹ کر اس میں ڈیڑھ چمچہ میدہ ملا لیں اور پھر چہرے اور ہاتھوں پر

اچھی طرح لیپ کر لیں۔ خشک ہونے پر نیم گرم پانی سے دھو کر اسے صاف کر لیں۔ اگر آپ چاہیں تو انڈے کی زردی کی بجائے دودھ کریم بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ ہفتے میں دو بار اس عمل سے نہ صرف ان جھریوں سے آپ کو نجات مل جائے گی بلکہ جلد شگفتہ اور نرم ہو جائے گی۔

حسن وصحت کے لئے متوازن غذا کا استعمال ضروری ہے

اس میں شک نہیں کہ حسن چند دل پسند ہستیوں کی جاگیر نہیں، اگر آپ تھوڑی سی محنت کریں تو سیدھے سادے چہرے کو جاذب نظر بنا سکتی ہیں۔ حسن حاصل کرنے کے لئے کچھ محنت کی ضرورت ہے۔ اپنے لئے آپ کوئی بھی طریقہ پسند کریں اس کے لئے ضروری ہے کہ بلاناغہ باقاعدگی کے ساتھ عمل کریں۔ کیونکہ حسن کی دیکھ بھال آپ کی بھرپور توجہ چاہتی ہے۔

سادہ غذا خوبصورتی پیدا کرنے میں بہت زیادہ مدد کرتی ہے۔ کچی سبزیاں پکی ہوئی سبزیوں سے کہیں زیادہ اچھی ہوتی ہیں۔ مرغن کھانوں کے مقابلہ میں سادہ کھانے صحت اور خوبصورتی کے لئے مفید ہیں۔ کھانوں کو بہت زیادہ نہ پکائیں۔ ان کو کم سے کم وقت کے لئے آگ پر پکائیں۔ ہر کھانے کے وقت نشاستہ، چکنائی، کاربوہائیڈریٹ، وٹامن کا استعمال ضرور کیجئے۔ اس باقاعدگی کے نتیجہ میں ہنستی ہوئی آنکھیں، شگفتہ جلد اور خوش مزاجی جو آپ کو اور آپ کے کنبے کو ملے گی وہ آپ کو باغ باغ کر دے گی۔

خوبصورتی حاصل کرنے کے لئے کچھ گر کی باتیں بھی ذہن نشین کر لیں۔ روزانہ دو پیالی دودھ دن میں ایک سلاد ایک بار، کوئی موسمی پھل، بغیر چھنے ہوئے آٹے کی چپاتیاں، چینی کی جگہ گڑ، گھی کی جگہ مکھن، دن میں ایک پاؤ دہی یا چھاچھ ہر کھانے کے وقت ایک قسم کے کاربوہائیڈریٹ کی حامل غذائیں استعمال کریں۔

چہرے کے لئے عرق گلاب کا استعمال

موسم گرما میں چہرے کو بازاری کیمیکلز سے صاف کرنے کی بجائے خالص قدرتی عرق گلاب کا استعمال کریں اور تازہ عرق گلاب اپنے فریج میں رکھیں۔ اگر عرق گلاب کے ساتھ بیسن کا آمیزہ تیار کر لیں اور اس میں ایک چمچہ دہی بھی شامل کر لیں اور پھر اسے پورے چہرے پر لگائیں اور تھوڑی دیر تک یونہی لگا رہنے دیں بعد ازاں چہرے کو ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالیں۔ اس طرح نہ صرف آپ کے چہرے کو تازگی ملے گی بلکہ فالتو چکنائی بھی صاف ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ ہیں وہ چند سادہ نسخے جن پر عمل کر کے خواتین گھر بیٹھے اپنی جلد کی زائد فالتو چکنائی سے نجات حاصل کر لیں گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ کو اپنی خوراک پر بھی خصوصی توجہ دینی ہو گی۔ اگر آپ کی جلد چکنائی کا شکار ہے تو پھر آپ کو اپنی خوراک میں سبزیاں، دالیں زیادہ سے زیادہ استعمال کرنی چاہئیں۔ البتہ گوشت بالخصوص سرخ گوشت کے استعمال سے بھی چہرے پر مہاسے اور داغ نمودار ہونے لگتے ہیں لہٰذا ایسی خوراک سے بھی پرہیز کریں اور ہاں اگر آپ ہر وقت ٹینشن، تفکر اور فرسٹریشن کو خود پر حاوی رکھتی ہیں تو اب ان سے جلد از جلد نجات حاصل کر لیں، تازہ خوراک کھائیں اور خوش رہیں تاکہ آپ کی صحت آپ کے چہرے پر بھی بشاشت اور تازگی لائے۔

☆..........☆..........☆